نبآ

نم شادہ آرا پیرو

مضامین
صفحہ
۳
۵
۶
۷
۱۵
۱۶
۳۷
۴۹
۵۶
۶۷
۸۶
۱۰۰
۱۳۴
۱۶۱
۱۸۶
۲۰
۲۲
۲۵

درد دل، پاس وفا، جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

॥ ओ३म् ॥

੧ ਓਂਕਾਰ एको ब्रह्म اللہ الواحد

GOD IS ONE

اِنسان

مُصنّفہ

لالہ کانشی رام چاولہ سپرنٹنڈنٹ
دفتر صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر ہوشیارپور

مُصنّفِ

"پریم ترنگ عُرفِ ترانۂ اُلفت" حصّہ اول و دوئم و لطفِ زندگی وغیرہ

سنہ ۱۹۴۰ء

بار دوئم ۲۰۰۰ قیمت آٹھ آنے (۸؍)

(راما آرٹ پریس سنتوکھ سر امرتسر میں باہتمام رام ناتھ پرنٹر چھپا)

Revised Price 1/75

تعدادِ کتبِ مطبوعہ

بارِ اوّل	۲۵۰۰
بارِ دوم	۲۰۰۰

نوٹ۔ پریم ترنگ عرف ترانۂ الفت کے ہر دو حصص تین صوبجاتِ علاقہ انگریزی و ریاست ہائے حیدرآباد و پٹیالہ کے محکمہ تعلیم سے سکولوں اور کالجوں کے لئے منظور ہو چکے ہیں ۔

۱۔ پنجاب۔ سرکلر ع ۲۷۵۶ سی ۔ مورخہ ۳ر فروری ۱۹۳۹ء

۲۔ یو۔پی۔ سرکلر ع ۶۹۰ ای۔بی مورخہ ۳۰ر اگست ۱۹۳۹ء

۳۔ صوبہ فرنٹیر۔ فہرست مجریہ نومبر ۱۹۳۷ء

باقی کتب کے لئے درخواست کی جا رہی ہے ۔

۴۔ ریاست حیدرآباد۔ چٹھی نمبری ۲۴۰۵ مورخہ ۱۱۔ آبان ۱۳۴۹ف

۵۔ ریاست پٹیالہ۔ سرکلر ۲۷ مورخہ ۲۳ر ہاڑ ۱۹۹۴ ب

"اِنسان"

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	انڈکس ہذا	۳
۲	نذر	۵
۳	ایک لفظ	۶
۴	دیگر تصانیفِ مُصنف	۷
۵	تمہید طبع دوم	۱۵
۶	تمہید	۱۶
۷	اِنسان کیا ہے؟	۳۷
۸	اِنسان کون ہے؟	۴۹
۹	اِنسانیت کیا ہے؟	۵۶
۱۰	اِنسانیت کا جوہر کیا ہے؟	۶۷
۱۱	اِنسان اَور اِنسان	۸۶
۱۲	اِنسان اَور اُس کا خالق	۱۰۰
۱۳	اِنسان اَور اُس کا دِل	۱۳۴
۱۴	اِنسان اَور اُس کے خیالات	۱۶۱
۱۵	اِنسان اَور اُس کی خُواہشات	۱۸۳
۱۶	اِنسان اَور اُس کی خُوشی	۲۰۱
۱۷	اِنسان اَور اُس کی تقدیر	۲۲۳
۱۸	اِنسان اَور اُس کی زندگی	۲۵۷

"نذر"

ہر آنکہ دارد در دلش خوفِ خدا
ہر آنکہ پاکست از غنا و از ریا
ہر آنکہ زخمِ غیر را مرہم شود
تحفۂ ناچیز ایں نذرش بود

جس کے دل میں درد ہے انسان کا
جس کے دل میں خوف ہے یزدان کا
ہو برائی بھی نہ جس میں اور شر
تحفۂ ناچیز ہے اُس کی نذر

(چاولہ)

ایک لفظ

جن خیالات اور جن وچاروں کا اظہار اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ میرے اپنے ذاتی ہیں۔ گورنمنٹ کا ان سے کوئی واسطہ یا تعلق نہیں ہے۔

(کانشی رام چاؔولہ)

دیگر تصانیفِ مُصنف

ا۔ پریم ترنگ عرف ترانۂ اُلفت

حصّہ اوّل

یہ ایک نادر کتاب ہے۔ مذہب کی حقیقت۔ مذہب کا راز اور مذہب کا مدعا سمجھنے کے لیئے اِس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ فی زمانہ مذہب کے نام پر جو دُکانداری ہو رہی ہے۔ اور جو ظلم وستم روا رکھا جا رہا ہے اُس کی حقیقت کو اس کتاب میں بڑی خوبی اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ذیل کی فہرست مضامین سے ہی اس کتاب کی قدر وقیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ دیباچہ
۲۔ سچا مذہب کیا ہے۔
۳۔ انسان انسان ایک ہیں۔
۴۔ سب کا صاحب ایک۔
۵۔ دل خانۂ خدا۔
۶۔ سب کا بھلا۔
۷۔ میل ملاپ
۸۔ نیک دلی
۹۔ خوش اخلاقی
۱۰۔ صدق دلی
۱۱۔ ہمارا فرض۔
۱۲۔ نکوکاری
۱۳۔ طریقۂ عبادت۔
۱۴۔ اختلافات رائے کی برداشت
۱۵۔ فرصت کی گھڑیاں
۱۶۔ تعصّب
۱۷۔ بے اعتمادی
۱۸۔ مردم آزاری
۱۹۔ جاتی ابھیمان یا نسب کا غرور۔
۲۰۔ ہمارے مذہبی پیشوا
۲۱۔ بحث مباحثہ
۲۲۔ مذہبی جنگ

۲۳ - نتیجہ ۔ ۲۴ - اقوال زریں ۔

ضخامت قریب ۳۰۰ صفحہ قیمت صرف آٹھ آنے ۔ جو کہ لاگت کے برابر ہے ۔

۲ - پریم ترنگ عرف ترانۂ الفت

حصّہ دوئم

اس کتاب میں وید مقدس ۔ قرآن پاک ۔ انجیل مقدس ۔ گورو گرنتھ صاحب بھگوت گیتا ۔ منوسمرتی ۔ احادیث اور بُدھ و پارسی اور دیگر مذاہب کے کتب مقدسہ سے احکامِ ربّی و دیگر عُلماء و فضلا کے اقوال زریں درج کئے گئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے ۔ کہ مذہب باہمی میل ملاپ ۔ محبت اُلفت ۔ رواداری ۔ نکوکاری پاکیزگی اور خدمت خلق کی تلقین کرتا ہے ۔ اور باہمی نفرت ۔ شر و فساد ۔ دل آزاری ۔ ظلم و ستم سے باز رہنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ فہرست مضامین حسب ذیل ہے ۔

۱ - تمہید

۲ - کلید حوالجات

۳ - سب کا خالق ایک

۴ - ایک ہی مالک کا جلوہ سب کے اندر ہے ۔

۵ - ہر طرف اُسی کا جلوہ ہے ۔

۶ - اچھے نام سب اُسی کے ہیں

۷ - پاک طینت بنو ۔

۸ - سب سے محبت کرو ۔

۹ - سب سے بھلائی کرو ۔

۱۰ - سب کا بھلا سوچو ۔

۱۱ - مل کر رہو ۔

۱۲ - پڑوسی سے نیک سلوک کرو ۔

۱۳ - محبت سے بات چیت کرو ۔

۱۴ - خدمتِ مخلوق سے خالق راضی ہوتا ہے ۔

۱۵- بھگوان کس کو چاہتے ہیں۔
۱۶- نیک اعمال ہی کام آئیں گے۔
۱۷- سب عبادت گاہیں اور عبادتیں ایک سی ہیں۔
۱۸- اپنی اپنی طریقت میں فلاح ہے۔
۱۹- ذات وملت کا امتیاز فرضی ہے۔
۲۰- جملہ مذاہب کے بزرگوں کی عزت کرو۔
۲۱- نفاق مت پیدا کرو۔
۲۲- نہ کسی کو ڈراؤ نہ ستاؤ۔
۲۳- نفرت سے نفرت کرو۔
۲۴- جھگڑا فساد مکروہ چیز ہے۔

۳- لطفِ زندگی

آج کل ہماری زندگی جس قدر روکھی پھیکی اور بے لطف ہے۔ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ فی زمانہ اکثر لوگ زندگی سے بیزار ہیں۔ دنیا داری کو دُکھوں کا گھر بیان کرتے ہیں۔ دنیا میں ناکام رہنے کی شکایت کرتے ہیں امراض اور اخراجات کے بڑھ جانے کا گلہ ہوتا ہے۔ بے اطمینانی اور بے اعتمادی کا شکوہ ہوتا ہے۔ اِس کتاب میں ان تمام مشکلات اور شکایات کی مفصل وجوہ بیان کر کے اُن کا ٹھیک اور درست علاج بتایا گیا ہے۔ جو صاحبان اپنی زندگی کامیاب اور پُر لطف بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ از حد مفید ہوگا فہرست مضامین ذیل ہے۔

۱- تمہید۔
۲- لطف زندگی کیا ہے۔
۳- صحت کا لطف
۴- سادگی کا لطف
۵- محنت کا لطف
۶- کامرانی کا لطف
۷- دولت کا لطف
۸- رشتہ داری کا لطف
۹- شانتی کا لطف
۱۰- پریم کا لطف

۱۱۔ ایمان کا لطف
۱۲۔ سوسائٹی کا لطف
۱۳۔ ہمسائیگی کا لطف
۱۴۔ لطفِ زندگی کا نسخہ

ضخامت ۴۱۶ صفحہ قیمت صرف ایک روپیہ جو بہت کم ہے ۔ اِن جملہ تصانیف کے متعلق ہر خیال اور ہر مذہب کی بزرگ ہستیوں اور جرائد اور رسائل نے ازحد تحسین وقدر دانی کے خیالات کا اظہار فرمایا ہے ۔ اور لکھا ہے ۔ کہ ایسی کتابیں نہ ہندو لکھتے ہیں نہ مسلمان ۔ اور ان کو زمانہ حاضرہ کی بہترین تصانیف قرار دیا ہے ان تمام آرا کو اگر یکجا جمع کیا جائے ۔ تو بجائے خود وہ ایک کتاب بن سکتی ہے ۔

آیندہ چھپنے والی کتابیں

(بفضلِ مالک)

۱۔ چشمۂ روحانیت

اس ملک کو اگر کسی چیز پر فخر تھا ۔ تو اس کی روحانیت سے محبت تھی ۔ لیکن موجودہ تہذیب کے زیر اثر ہم اُسے بھی کھو بیٹھے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے ۔ کہ لامذہبی بڑھ جانے کی وجہ سے ہم سب طرح سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں ۔ امن وتسکین فرار ہو چکے ہیں ۔ اس کتاب میں بتایا جائیگا ۔ کہ روحانیت کے کھو جانے کے کیا اسباب ہیں ۔ اور کس طرح سے ہم اسے پھر حاصل کر سکتے ہیں ۔ اور کس طرح سے اپنی حقیقی شان کو اونچا کر سکتے ہیں ۔

۲۔ رُوحانیت (DIVINITY)

یہ کتاب اسی موضوع پر زبان انگریزی میں شائع کرنے کی تجویز ہے لوگ آج کل اردو اور ہندی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کو اتنا پسند نہیں کرتے جتنا کہ انگریزی زبان میں۔ اس میں مفصلہ ذیل مضامین رکھنے کی تجویز ہے:۔

(۱) کیا خدا واقعی کوئی چیز ہے اور اگر ہے تو وہ نظر کیوں نہیں آتا؟

(۲) خدا کو ملنے کے لئے کیا وسائل اختیار کئے جا سکتے ہیں؟

(۳) خالق عالم نے دنیا والوں کے لئے ایک ہی مذہب کیوں نہیں رکھا؟

(۴) اگر پروردگار کو اپنے بندوں سے محبت ہے تو وہ باہمی جنگ و جدل۔ نزاع و تکرار دُور کیوں نہیں کرتا؟ اور کیوں بیماریاں۔ طوفان زلزلے اور دیگر مصائب بھیجتا ہے؟

(۵) مذہب انسان کے لئے مفید ہے یا مضر؟

(۶) سچا مذہب کیا ہے؟

(۷) کیا مذہب لڑائی اور فساد کا ذمہ وار نہیں۔ اگر ہے تو اُسے کیوں نہ اُڑا دیا جائے؟

(۸) دنیا میں دُکھ کیوں ہے۔ اور کس طرح سے اس کا دفعیہ کر کے ابدی راحت حاصل کی جا سکتی ہے؟

(۹) روحانیت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

(۱۰) مادیت ہم کو کس طرف لے جا رہی ہے؟

وغیرہ وغیرہ

۳-نُور یا پرکاش (ILLUMINATION)

پریم ترنگ وغیرہ تصانیف اس قدر مقبول ہوئی ہیں کہ کئی صاحبان نے اس صوبہ اور دیگر صوبجات سے یہ تجویز بھیجی کہ ان کا ترجمہ ہندی گورمکھی اور سندھی وغیرہ زبانوں میں کیا جائے۔ لیکن یہ امر کچھ آسان نہیں ہے۔ اس لئے تجویز یہ ہے۔ کہ انگریزی زبان میں ایک جامع کتاب نکالی جائے تاکہ اُس سے دیگر صوبجات کے اور نیز غیر ممالک کے لوگ مستفید ہو سکیں اس کتاب میں تمام مذاہب کے کتب مقدسہ سے قریباً ڈیڑھ سو موضوعات پر حوالجات درج ہوں گے۔ اس کتاب کے چھ حصص کئے جائیں گے۔ جن کے مضامین ذیل ہوں گے :-

(۱) خدا اور اُس کی صفات (۲) خالق اور مخلوق کا ناطہ (۳) انسان اور اُس کی صفات (۴) انسانیت کے خواص۔ (۵) انسان اور انسان کے تعلقات (۶) انسان کی دنیاوی ترقی۔

جن آسمانی صحیفوں اور دیگر کتابوں کے حوالجات ہوں گے۔ اُن کی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

۱-ہندو مذہب۔ (۱) ہر چہار وید مقدس (۲) بارہ بڑی اُپنشدیں۔ (۳) چھ شاستر۔ (۴) منوسمرتی (۵) بھگوت گیتا (۶) بالمیکی رامائن (۷) مہابھارت۔ (۸) بھاگوت پران (۹) چانکیہ نیتی (۱۰) بھرتری ہری (۱۱) پورن جیوتی۔

۲-پارسی مذہب۔ (۱) گاتھا (۲) ژند اوستا

۳-بدھ مذہب۔ (۱) دھم پد (۲) ترپاٹکا

۴۔ جین دھرم ۔ (۱) اُتر ادھین سوتر (۲) بھانر وان سوتر وغیرہ
۵۔ سکھ مذہب ۔ (۱) آد گرنتھ صاحب (۲) دسم گرنتھ صاحب
(۳) بھائی گورداس کی واریں (۴) گوربلاس (۵) گیان رتنا ولی (۶) بھگت رتنا ولی (۷) دیوان بھائی نند لعل گویا (۸) تنخواہ نامہ بھائی نند لعل (۹) پریم سمارگ (۱۰) رہت نامہ بھائی چوپا سنگھ و دیا سنگھ (۱۱) پنتھ پرکاش۔
۶۔ اسلام ۔ (۱) قرآن شریف (۲) احادیث شریف از امام (ا) مالک (ب) بخاری (ج) مسلم (د) ابو داؤد (ہ) ترمذی (و) نسائی (ز) ابن ماجہ (۳) فرمان ہائے از حضرت علی ۔ مولانا روم ۔ حافظ شیرازی ۔ شیخ سعدی ۔ عطار ۔ عارف ۔ حالی و عمر خیام وغیرہ ۔
۷۔ عیسائی مذہب ۔ (۱) انجیل مقدس (۲) فرمان از شکسپیر ۔ ٹینی سن ۔ ورڈز ورتھ ۔ ینگ ۔ شیلے ۔ گولڈ سمتھ ۔ ہکسن ۔ ایڈلسن ۔ ملٹن ۔ ہومر و سینیکا وغیرہ ۔
۸۔ بہائی مذہب ۔ (۱) فرمان از (ا) بہاؤ اللہ (ب) ابوالبہا ۔

اس ساری کتاب کے موضوعات کی فہرست درج کرنے کی تو گنجائش نہیں ہے صرف ایک حصہ کے مضامین نمونے کے طور پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

(۱) انسان انسان ایک ہیں
(۲) رضائے مولیٰ کس کو حاصل ہوتی ہے
(۳) جملہ عبادت گاہیں یکساں ہیں
(۴) پروردگار کی نظر میں مذاہب کی تمیز نہیں ہے ۔
(۵) عبادت کا تعلق دل سے ہے ۔
(۶) پاک رُوحیں ہر قوم میں آتی ہیں ۔
(۷) حقیقی مذہب کیا ہے ؟
(۸) سب سے نیکی کرو
(۹) انصاف پسندی

(۱۰) شر و فساد سے بچو۔
(۱۱) کسی کو دکھ نہ دو۔
(۱۲) امن و شانتی
(۱۳) خدمت خلق سے خدا راضی
(۱۴) مہمان نوازی
(۱۵) پڑوسی سے نیک سلوک کرو۔
(۱۶) سب سے محبت کرو۔
(۱۷) حقوقِ دوستی
(۱۸) نفرت سے نفرت کرو۔
(۱۹) اتفاق
(۲۰) عیب جوئی سے پرہیز کرو۔
(۲۱) نیک مزاجی
(۲۲) خوش کلامی
(۲۳) نسب کا غرور فضول ہے۔
(۲۴) تعصّب
(۲۵) جذبۂ انتقام
(۲۶) عفو
(۲۷) سنہری اصول

بفضلہ یہ کتاب اپنی قسم کی نرالی اور بڑے معرکے کی ہوگی۔

کتابیں ملنے کا پتہ

۱۔ دفتر رسالہ اوم لوہاری منڈی لاہور
۲۔ میسرز جے ایس سنت سنگھ اینڈ سنز چوک متی لاہور
۳۔ لالہ لاجپت رائے اینڈ سنز لوہاری گیٹ لاہور
۴۔ مہاشہ راجپال اینڈ سنز ہسپتال روڈ لاہور
۵۔ مکتبۂ اردو لاہور
۶۔ بھارت پستک بھنڈار امرت سر
۷۔ دفتر رسالہ اوم راولپنڈی
۸۔ لائل بک ڈپو سرکلر روڈ لائل پور
۹۔ لالہ رام ناتھ بک سیلر فیروز پور شہر۔
۱۰۔ مُصنف

تمہید طبع دوئم

اُس مالک کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس نے مجھ جیسی ناچیز ہستی سے اپنے بندوں کی خدمت بذریعہ قلم کرائی ہے۔ مجھے خواب وخیال بھی نہ تھا کہ یہ تصانیف اس قدر پسند کی جائیں گی۔ "انسان" میری تیسری تصنیف تھی۔ اس کے متعلق بے شمار خطوط حوصلہ افزائی اور قدردانی کے موصول ہوئے بہت سے بھائیوں نے تو تحریر فرمایا کہ "انسان" کا مطالعہ حقیقتاً انسان کو انسان بنادیتا ہے۔ پہلا ایڈیشن "انسان" کا ۱۹۳۶ء میں نکالا گیا تھا اور وہ ختم ہوچکا ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اس میں کوئی خاص کمی بیشی مضمون کی نہیں کی گئی۔ کہیں کہیں ادبی درستیاں کردی گئی ہیں۔ اور کچھ عبارت جو طلباء کے لئے قدرے ناموزوں سمجھی گئی ہے۔ وہ نکال دی گئی ہے۔ نیز پہلے ایڈیشن میں بزرگ ہستیوں ونیز جرائد ورسائل کی آراء ان تصانیف کے متعلق مختصراً درج کی گئی تھیں وہ بھی غیر ضروری سمجھ کر نکال دی گئی ہیں۔

ان کتابوں کی قیمت پہلے ہی بہت کم رکھی گئی تھی۔ کیونکہ یہ سلسلہ مالی منافع کے خیال سے نہیں۔ بلکہ اپنے بھائیوں کی خدمت کو مدِنظر رکھ کر کیا گیا ہے بوجہ جنگ کے کاغذ کا نرخ اب بہت گراں ہوگیا ہے۔ تاہم قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ میرے ناقص علم میں اس قدر ضخامت کی ایسے اعلےٰ کاغذ پر ایسی نفیس طبع شدہ کتابیں جن میں اس قسم کا پاکیزہ مواد ہو ان داموں پر شاید ہی کہیں سے دستیاب ہوسکیں۔ اس میں بھی مالک کا ہی فضل شامل حال سمجھنا چاہئے۔

چاولہ

۱۶ اگست ۱۹۴۰ء

اوم

تمہید

رنگِ دُنیا دیکھ کر گھبرا گیا اپنا تو جی
بھائی کو بھائی سے بھی اس دَور میں اُلفت نہیں

کتب مقدسہ کے اندر لکھا ہے۔ کہ خالقِ ارض و سما نے جب اس کائنات کو پیدا کیا۔ تو تقریباً سب کچھ بنا چکنے پر بھی دُنیا ابھی تشنۂ تکمیل معلوم ہوتی تھی۔ گویا بے دُولھا کے برات تھی۔ آخر اُس نے آدم کا پُتلا بنایا۔ اور اُسے دیکھ کر اُس کی پُوری پُوری تسلی ہو گئی۔ اُس کے بعد اُسے کسی اور شے کے بنانے کی خواہش نہ رہی۔ کیونکہ اُس کے اندر اُس مالک نے اپنی صناعی ختم کر دی۔ جو کچھ ساری کائنات میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ سب چھوٹے پیمانہ پر انسان کے اندر موجود ہے۔ سنسکرت میں ایک کہاوت ہے۔ "یا برہمانڈے سا پنڈے" یعنی جو کچھ زمین و آسمان کے طبقوں میں یعنی چودہ لوک میں موجود ہے۔ وہ سب انسان کے جسم کے اندر دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح سے جب میں اپنے مُلک ہندوستان پر نظر ڈالتا ہوں تو بھی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جب قادرِ مطلق باقی سارے ممالک کو عالمِ وجود میں لا چکے۔ تو اُن کو تشفی نہ ہوئی۔ پھر اُنہوں نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے مُلکِ ہندوستان کو بنایا۔ اور اُس کے بعد کسی اور مقام کو بنانے کی ضرورت نہ رہی۔ دوسرے ملکوں میں جو کچھ بھی فرداً فرداً پایا جاتا ہے۔ وہ سب اس عجیب و غریب مُلک کے اندر موجود ہے۔ کونسی آب و ہوا ہے۔ جو یہاں نہیں ملتی۔ یہاں کے پہاڑ سب سے اُونچے۔ یہاں کے دریا سب سے صاف۔ یہاں کے آبشار کرشمۂ قُدرت۔

یہاں کی جھیلیں آب دار۔ ہر قسم کی کانیں موجود۔ ہر قسم کی پیداوار حاضر۔ ہر قسم کے پھل پھول اور میوے میسّر غرضیکہ کوئی ایسی چیز نہیں۔ جو کہیں اور جگہ ملتی ہو۔ اور یہاں دستیاب نہ ہو۔ بلکہ بعض چیزیں تو اس ملک میں ایسی پیدا ہوتی ہیں۔ کہ جو اور کہیں مل ہی نہیں سکتیں۔ اس ملک کے شمالی حصہ یعنی کشمیر بے نظیر کو دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

ترجمہ:۔ اگر اس تختۂ زمین پر کہیں بہشت ہے۔ تو بس وہ یہی (کشمیر) ہے یہی ہے۔ یہی ہے ؛

یہاں کی پرانی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے۔ کہ یہ ملک جب اوج عروج پر تھا۔ تو یہاں کی پراچین تہذیب انسان کو کمالاتِ انسانی سے بہرہ ور کرنے میں جادو کا اثر رکھتی تھی۔ یہ ملک منطق و فلسفہ۔ ریاضی و ہندسہ۔ ہیئت و نجوم۔ ادب و حکمت اور موسیقی کا گہوارہ تھا۔ علم ہندسہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے خاص ہندوستان کی ایجاد ہے۔ اور اکائی کا درجہ قائم کرنا اہلِ ہند کی ذہانت کا ثبوت ہے۔ یہاں کے لوگ بلا کے ذہین تھے۔ اُن کے اخلاق و اطوار بہت بلند اور پسندیدہ تھے۔ دوسرے تمام ملکوں کے لوگ اہلِ ہند کی ذہانت اور ہندوستان کی عظمت کے قائل تھے۔ عبادت اور ریاضت کی طرف اہلِ ہند کا خاص رجحان تھا۔ یہ لوگ ہر بات اور ہر حال میں دھرم اور ایمان کو فوقیت دیتے تھے۔ آئین مذہب کی پابندی کو سب خواہشات پر مقدم رکھتے تھے۔ پریم اور محبت اُن کا شیوہ تھا۔ تواضع اور مہمان نوازی اُن کا وطیرہ تھا۔ ہمدردی اور غمخواری اُن کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بنی نوع انسان کے لئے اپنا

سب کچھ قربان کر دینا بلکہ جان تک پر کھیل جانا ان کی عادت میں داخل تھا۔
چھاندوگیہ اُپنشد میں لکھا ہے۔ کہ جب راجہ اشوپتی سے چند عالم لوگ دین و مذہب کے متعلق کچھ بات چیت کرنے گئے۔ تو سب سے پہلے راجہ نے اُن سے کچھ تناول کرنے کی درخواست کی۔ اُن لوگوں نے کچھ تامل کیا۔ راجہ سمجھ گیا۔ اور بول اُٹھا۔ کہ "اے ودوانو! آپ میرا اَن کھانے سے کیوں ہچکچا رہے ہو؟ مَیں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہُوں۔ کہ میرے مُلک کے اندر نہ کوئی چور ہے نہ بخیل۔ میری رعایا کا ہر فردِ بشر دوسروں کی بھلائی میں دن رات کوشاں رہتا ہے۔ یہاں نہ کوئی جاہل ہے۔ نہ بے علم۔ بد چلنی کہیں نام کو بھی نہیں۔ فاحشہ اَور فواحشات کا تو ذکر ہی کیا۔"

رامائن میں راجہ وشرتھ کے دارالخلافہ کا ذکر کرتے ہُوئے بالمیک منی بال کانڈ کے اندر یُوں رقمطراز ہیں "اس اچھے شہر میں دھرماتما لوگ خوشی سے رہتے تھے۔ اَور اپنی حالت پر قانع تھے۔ لالچ سے دُور۔ طمع سے نفور۔ خدا کی یاد میں مگن تھے۔ نفس پرست۔ بخیل اَور بدخلق آدمی (اُس شہر میں) ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا تھا (وہاں کے) تمام مرد و زن نفس کش اَور دھرماتما تھے۔ نیک چلن اور خوش اخلاق تھے۔ تنگ خیالی سے یہ لوگ کوسوں دُور تھے۔ چوری چکاری نام کو نہ تھی۔ جھوٹ بولنے بغض و حسد کرنے کو ننگِ انسانیت سمجھتے تھے۔ دہریت و الحاد کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔"

یہ بہت پُرانے زمانے کی باتیں عرض ہُوئیں۔ اس سے ذرا آگے آتے ہیں۔ تو ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مُلک کی عظمت سے متاثر ہو کر باہر کے لوگ یہاں علوم و فنون سیکھنے آتے تھے۔ اَور فیضیاب ہو کر واپس لوٹتے تھے۔ مثلاً:۔
۱۰ویں صدی میں سلیمان نامی تاجر بصرہ سے یہاں آیا۔ یہاں کی صنعت و تجارت

کے جو حیرت انگیز حالات اُس نے شرح و بسط سے قلمبند کئے ہیں ۔ وہ آج بھی درسِ عبرت کا کام دے سکتے ہیں ۔

۲۔ خلیفہ ہارون الرشید نے کئی آدمی یہاں علم اور حکمت سیکھنے کے لئے بھیجے ۔ اور کئی پنڈتوں اور ویدوں کو بُلا کر اپنے ہاں کے شفاخانوں کا انتظام اُن کے سپرد کیا ۔ نجوم و حکمت کے اُن جواہر ریزوں سے جو سنسکرت کی کتابوں سے رولے جا سکتے تھے ۔ ترجموں کے ذریعہ عربی زبان کو مالا مال کر لیا ۔ اور وہاں کے عالموں کو سنسکرت سکھائی ۔

۳۔ ایران کے مختلف بادشاہوں نے ایران کے عالموں کو بُلوا کر علم ہیئت اور علم جوتش (نجوم) کی کتابوں کا ترجمہ فارسی زبان میں کرایا ۔

۴۔ یُونانیوں نے بھی ہندوستان سے حکمت حاصل کی ۔ ان کی کتابوں میں ہندوستان کے مشہور وید و ھنونتر کا ذکر پایا جاتا ہے ۔

۵۔ ۱۰۱۶ء میں البیرونی ہندوستان میں آیا ۔ تیرہ برس یہاں رہ کر سنسکرت زبان میں مہارتِ تامہ حاصل کی ۔ اور پھر سنسکرت کی تقریباً سو کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں کیا ۔ اُس نے یہاں کے لوگوں کی نسبت نہایت اعلےٰ خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ جا بجا ان کو وحدانیت کا قائل ، شریف ۔ نیک نہاد اور با اخلاق لکھا ہے ۔

۶۔ ۱۱۵۰ء میں صالح نے سنسکرت کی ایک راج نیتی (POLITICAL SCIENCE) کی کتاب کا ترجمہ کیا ۔ جو دیگر ممالک میں بڑا مقبول ہُوا

۷۔ مغل بادشاہوں نے اس مُلک کو ایسا پسند کیا ۔ کہ ایران و تُوران کو بھول گئے ۔ اور یہیں کے ہو گئے ۔ اسی مُلک کو اپنا گھر بنا لیا ۔ خصوصاً شہنشاہ اکبر نے تو اس بارہ میں ایک ایسا پسندیدہ قدم اُٹھایا ۔ کہ سارے ہندوستان کو اپنا لیا ۔

یہ سب کچھ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے عرض کیا گیا ہے۔ کہ یہ مُلک تختۂ دنیا پر ایک خاص درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے ایسے ملک کے اندر عالمِ وجود میں آنا اور ہندوستانی کہلانا ناخوش نصیبی کی علامت سمجھنی چاہئے۔ یہ رشیوں کی سرزمین اوتاروں کا گہوارہ اور رُوحانیت کا مرکز تھا۔ اس کی زرخیزی بے نظیر ہے۔ اس کی زرریزی بے مثال ہے۔ اس کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہی بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ ع

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن آہ! رضا و تسلیم کا قائل ہونے کے باوجود میں سمجھتا ہوں۔ کہ فی زمانہ اس مُلک کے اندر پیدا ہونا بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ یہاں جس قسم کے لوگ پہلے بستے تھے۔ اس کا اندازہ آپ ان حالات سے لگا سکتے ہیں۔ جو اُوپر درج ہو چکے ہیں۔

اُس زمانہ کا نقشہ حالؔی مرحوم نے اپنے الفاظ میں یُوں کھینچا ہے ؎

مال و دولت کی ہوس میں نہ گرفتار تھے ہم ۔۔۔ نہ بلندی کے نہ رفعت کے طلبگار تھے ہم
اس قدر عُمرِ دو روزہ پہ نہ مغرور تھے ہم ۔۔۔ عیش و عشرت کے طلسموں سے بہت دُور تھے ہم
حاجتیں لے کے کسی در پہ گئے تھے نہ کبھو
نہ زمین بوسی کی عادت تھی نہ تسلیم کی خُو

اکبر الہ آبادی نے ایک جگہ یُوں لکھا ہے ؎

نہ یہ آپس کے جھگڑے تھے نہ یہ ناحق پرستی تھی
طبیعت پر نہ دیوِ نفس کی یہ چیرہ دستی تھی
نہ دل میں بدگمانی تھی نہ ہمت میں یہ پستی تھی
نظر میں مظہرِ نُورِ حقیقت ساری ہستی تھی

تمہاری وضع دلکش تھی تمہاری شان عالی تھی
خُوش اخلاقی تمہاری مظہرِ شان جمالی تھی

لیکن اس وقت کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اس زمانہ میں تو جس طرف بھی نگاہ پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسا گرا ہُوا زمانہ اور ایسا ذلیل اور کوئی مُلک ہی نہیں ہے۔ کسی بھی صیغے کی طرف دیکھو۔ وُہ مثال صادق آتی ہے۔

"اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی"

۱۔ تحصیلِ علم کی طرف دیکھیں۔ تو جملہ تہذیب یافتہ ممالک سے یہاں کی پڑھی لکھی جماعت کا تناسب بہت کم ہے۔ یعنی دیگر ممالک میں جہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت جگہ ۹۵ فیصدی سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی ۹۸ فیصدی تک ہے۔ وہاں اس مُلک میں ۸ فی صدی سے بھی کم ہے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو صرف اپنا نام ہی لکھ سکتے ہیں۔

۲۔ صنعت و حرفت کی طرف دھیان کریں۔ تو ہر ایک چیز کے محتاج دکھائی دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ روزانہ زندگی کی ضُروریات کی چیزیں بھی باہر کے ممالک سے منگوانی پڑتی ہیں۔ سُوئی تک کے لئے غیروں کے محتاج ہیں۔

۳۔ علمِ سائنس و علمِ جراحی وغیرہ میں تو ہم طفلِ مکتب بھی نہیں۔ حالانکہ اہلِ مغرب نے اس میں کمال کر دکھایا ہے۔ غدود اور پھیپھڑے بدل دینا کچھ بڑی بات نہیں ہے۔

۴۔ علمِ ادب کے اندر دیگر ممالک کے ادبا اعلےٰ پایہ کا لٹریچر پیدا کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں اس کا عشرِ عشیر بھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہاں سوائے ناولوں اور قصوں کے کچھ نہیں لکھا جاتا۔

۵۔ اخلاق کی طرف آئیں۔ تو شرم کے مارے گردن زمین میں جا گڑتی ہے۔

جو بداخلاقی بداعتمادی۔ بدگمانی اور بدخیالی اس ملک میں آگئی ہے۔ اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ کوئی بہن اکیلی باہر تک نہیں نکل سکتی۔

۴۔ دین و مذہب کے متعلق تو حالت اور بھی زبوں ہے۔ جو مذہب ہم کو تمام قسم کی بُرائیوں سے بچا کر نیک کرداری کی طرف لگاتا ہے۔ اُسی مذہب کے نام پر جو آفتیں ہم ڈھا رہے ہیں۔ اُن کے کہنے اور لکھنے تک سے زبان اور قلب کانپتے ہیں۔ مذہب ایک پاکیزہ اور لطیف ترین رُوحانی ہدایات کا نصاب ہے۔ جس کو آج ہم نے ایک شرارت اور باہمی عداوت کا مسالا بنایا ہے۔ جہاں لوگوں کا ذاتِ باری کے متعلق یہ اعتقاد ہوتا تھا۔ کہ راجہ لوگ فخریہ کہتے تھے۔ کہ میرے مُلک میں کوئی دہریہ یا ناستک نہیں ہے۔ وہاں اب جگہ جگہ پر فرقے اور سوسائٹیاں قائم ہوگئی ہیں۔ کہ جو نہ صرف مذہب اور پروردگارِ عالم کو تلانجلی دے بیٹھے ہیں۔ بلکہ اہلِ مذہب اور نیک لوگوں کو بھی صلواتیں سُناتے ہیں۔ اور کھُلے بندوں اس بات کی تلقین کرتے ہیں۔ کہ دُنیا میں آرام ہو سکتا ہے۔ تو مذہب اور خُدا کے خیال کو چھوڑ کر ہو سکتا ہے۔ سینکڑوں رسالے ان خیالات کی اشاعت کے لئے نکل رہے ہیں۔ اور لوگ بڑے شوق سے ان کو پڑھتے ہیں۔ اور ان خیالات کی داد دیتے ہیں۔ بلکہ تائید پر تائید کرتے ہوئے ان خیالات کو ORIGINAL IDEAS کہتے ہیں۔

مَیں محسوس کرتا ہُوں۔ کہ اس قسم کے خیالات کے لوگ بالکل صدق دلی سے ایسا کہتے ہیں۔ کیونکہ وُہ دیکھتے ہیں۔ کہ فی زمانہ جو لوگ مذاہب کو ماننے والے ہیں۔ ان میں سے اکثر راستی سے کوسوں دُور ہیں۔ اور باہمی نزاع و تکرار میں لگے رہتے ہیں۔ محبت انسانی کا اُن کے اندر نام و نشان تک نہیں۔ مذہب کی آڑ میں اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں۔ بگلے بھگت بن کر۔ ڈھونگ

رچا کر ٹھگی کی دُکانیں قائم کر کے جاہل اور سیدھے سادھے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں اور ان کی آپس میں سر پھٹول کرا رہے ہیں۔ جناب مسیحؑ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن افسوس جب کسی مذہب کی خوبی کو اس کے پیروؤں کے اخلاق و اعمال سے جانچتے ہیں۔ تو سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔ اور طبیعت مجبوراً دہریہ پن کی طرف جاتی ہے۔ اور دل مذہب اور خدا کا خیال چھوڑنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ کہاں ہمارے بزرگ کہ جنہوں نے اپنے اخلاقِ حسنہ اور نیک چلن سے دُنیا میں مذہب کے نام کو بلند کیا۔ اور کہاں ہم بدبخت کہ جو نہ صرف اس کو بدنام کر رہے ہیں۔ اور اُس کا خاکہ اُڑا رہے ہیں بلکہ اس کا نام و نشان مٹانے میں اہلِ غرض کا ساتھ دے رہے ہیں۔

سوائے معدودے چند مُبارک ہستیوں کے آج جدھر دیکھو لوگوں نے مذہب کے نام پر دُکانداری چلا رکھی ہے۔ مذہب صرف ان باتوں کے لئے رہ گیا ہے۔

الف۔ دوسرے کا حق تلف کیا جائے

ب۔ دُوسروں پر جبر و تشدد روا رکھا جائے۔ اور ظلم ڈھایا جائے

ج۔ جس طرح ہو سکے۔ مذہب کے نام پر فساد کیا جائے۔ اور خُون بہایا جائے

د۔ مذہب کی آڑ میں اپنی روٹی کا سلسلہ چلایا جائے۔

س۔ مذہب کے نام پر بداخلاقی اور بدچلنی پھیلائی جائے۔

ی۔ مذہب کے پیشوا جو مذہب کی تفسیریں سُنا کر لوگوں میں راستی کے جذبات اور روشن ضمیری پیدا کرتے تھے۔ مذہب کی گوناگوں خوبیوں اور برکتوں سے متمتع ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔ مذہب کا حقیقی رنگ دکھا کر اپنے

پیروؤں کو خوش اخلاقی اور نیک چلنی کا نمونہ بناتے تھے۔ محبت۔ ہمدردی۔ خدمتِ خلق کو انسانی زندگی کا معیار بتا کر اپنے چیلوں کو انسانیت کے سچے جوہر سے مزین کرتے تھے۔ آج وہ خود ہی خود غرضیوں میں پھنس کر چاہِ ضلالت میں گر رہے ہیں اور ہم کو بھی ساتھ ہی کھینچ رہے ہیں۔ اور زبان حال سے۔ ع

ہم تو ڈوبے ہیں مگر تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کا مصداق بن رہے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے کیا اچھا کہا ہے سہ

جب ہوں گرو جی خود البیلے — خوب رچائیں میلے ٹھیلے
راہ پہ آئیں کیوں کر چیلے — مندر ہیں کیوں جائیں اکیلے
اگوا خود جب حق سے ہو غافل — دنیا ہی دنیا دل میں ہو داخل
ساتھی کیوں نہ چلیں رہِ باطل — کیونکر دین ہوں ان کو حاصل

مُلّا خود جو نہ ہو حقانی
پھر تو مکتب ہے شیطانی

کم از کم اس ملک میں تو موجودہ ناگفتہ بہ حالات کے ذمہ وار زیادہ تر مذہبی پیشوا ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد ہی اب صرف یہ رہ گیا ہے۔ سہ

زر قوم سے لے کے آپ ایسے سامان کرو
جس سے تمہاری بزم بن جائے بہشت
حلوے مانڈے سے کام رکھو بھائی
مُردہ دوزخ میں جائے یا پائے بہشت
(اکبر)

جب ان مذہبی پیشواؤں کے لمبے لمبے تلک۔ لمبی لمبی چوٹیاں۔ وضع دار دھوتیاں۔ مشتبہ ڈاڑھی۔ ماتھے پہ لمبی محراب اور لمبے لمبے کیس اور دیگر علامات دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ اور پاکدامنی

کے پتلے ہیں۔ لیکن ؎

دل میں ہے یادِ حُور زباں پر ہے یا غفور
ظاہر دُرست شیخ کا باطن خراب ہے

جب یہ لوگ پُوجا اور نمازمیں بیٹھتے ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ سیدھی عرشِ معلیٰ کے ساتھ تار بندھ گئی۔ اور براہِ راست خالقِ برتر سے ناطہ جُڑ گیا۔ لیکن ؎

بیٹھے تو بہت ہی سر جُھکا کر ہیں حضور
کیا جانے مراقبہ ہے یا پینک ہے (اکبر)

جب یہ اُپدیش یا وعظ کرنے کو کھڑے ہوتے ہیں۔ تو مذہبی مسائل کی وُہ وُہ باریکیاں دکھاتے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسی ایسی مُوشگافیاں کرتے ہیں۔ کہ دماغ چکرا جاتا ہے۔ لیکن اگر اُن کے اعمال کی طرف جاؤ۔ تو خُدا کی پناہ ؎

واعظ کتابِ وعظ لئے ہے تو کیا ہُوا
بوتل شراب کی بھی تو پنہاں بغل میں ہے (اکبر)

اور پھر ؎

ہے اُن کے قول و فعل میں اس درجے اختلاف
ممبر پناہ مانگ رہا ہے خطیب سے

اِس مضمون کے متعلق مَیں بہت کچھ ایک علیحدہ باب میں اپنی تصنیف "پریم ترنگ" عرف "ترانۂ الفت" میں لکھ چکا ہُوں۔ اس تمہید میں اتنا ہی کافی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اگر پیشوا۔ رہبر۔ آگو۔ پیر اور گورو اس قماش کے ہوں۔ تو مریدوں اور چیلوں کا کیا ٹھکانہ ہے۔ پنجابی میں ایک مثل ہے۔ "گورو جنہاں دے ٹپنے

چیلے جان چھڑپ"۔ یعنی جن کے گُورُو اُچھلنے کُودنے والے ہوں۔ اُن کے مُرید تو چھلانگیں لگانے والے ہی ہوں گے۔ عوام جو کہ ان پیشواؤں سے ہر طرح کی اخلاقی باطنی اور رُوحانی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اُن کا آج یہ حال ہے کہ ؎

کہاں کی پُوجا نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کا زمزم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہمیں بھی دو ایک جام صاحب (اکبر)

اَب پتلُون کے ساتھ بھلا آسن لگا کر سندھیا یا پوجا ہو سکتی ہے یا دوزانو ہو کر سجدہ ہو سکتا ہے۔ پتلُون کی اگر کریز[1] خراب ہو جائے۔ تو وہ پہننے کے لائق ہی نہ رہے۔ اس لئے اب یادِ خُدا یا مذہب کی پیروی آؤٹ آف[2] فیشن OUT OF FASHION ہو گئی ہے۔ آج کل کے نوجوان یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں ؎

فرمائیں میرا قصُور حضرت جو معاف
جو امر ہے واقعی گذارش کروں صاف
انکار نہیں نماز و روزے سے مجھے
لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف (اکبر)

یہی نہیں کہ ہم دین وُ دُنیا کو تلانجلی دے بیٹھے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بہت آگے نکل گئے ہیں۔ اور ایسا ہونا لازمی امر تھا۔ کیونکہ دھرم اور ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے۔ کہ جو انسان کو حدُود کے اندر باندھ کر رکھتی ہے۔ ورنہ ؎

طالب خیر نہ ہوں گے کبھی انسان سے ہم
نام اس کا ہے بشر اس میں ہے شر آخر کو

اور حقیقتاً دھرم اور ایمان کی گرفت سے نکل کر اب وُہ حالت ہوئی ہے۔ کہ بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کیسی حالت ہے ؎

[1] ابل [2] زمانہ گذشتہ کی بات۔

اب وُہی ہم ہیں کہ مجبُور بھی نادار بھی ہیں
شرع سے دُور بھی قرآن سے بیزار بھی ہیں
سب سے جھوٹے بھی ریاکار بھی مکار بھی ہیں
بدعمل بھی ہیں رِباخوار بھی مے خوار بھی ہیں

اب دین اور مذہب کی باتیں یا دھرم اور ایمان سے پیار کرنے والے لوگ عنقا ہو گئے ہیں۔ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ گویا اس عالم میں کبھی اُن کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

دین وایماں ڈھونڈتا ہے ذوقؔ کیا اسوقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا (ذوقؔ)

لوگ اس مُلک میں بھُوک، قحط، مفلسی، بیماری اور بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ کوئی اسے ہندُوؤں کی خود غرضی پر محمول کرتا ہے۔ کوئی مسلمانوں کے تعصّب پر۔ کوئی اسے غیر ملکی شرارت کہتا ہے۔ کوئی مغربی تہذیب کے بُرے اثرات کو اس کا ذمّہ دار ٹھہراتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس بُری حالت کا سب سے بڑا سبب ہماری دھرم اور ایمان سے لاپرواہی ہے۔ اور دھرم اور ایمان کو دُنیاوی اغراض کے پُورا کرنے کا ذریعہ بنانا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے اندر تنگ نظری آگئی ہے۔ نااتّفاقی، حسد اور نفرت زوروں پر ہے باہمی میل جول کا نام ونشان نہیں۔ حالانکہ اتحاد اور اتّفاق ہی سب برکتیں لاسکتا ہے لیکن جب ایک ہی خُدا کو ماننے والے اُس کے ناموں پر ہی جھگڑ رہے ہوں، اور گوشت کھانے والے جانوروں کے طریقِ قتل کے اختلاف پر اپنے ہمسایوں کے قتل کو مباح سمجھ رہے ہوں۔ ایک ہی خُدا کی عبادت گاہوں کو مختلف نام دے کر مختلف عبادت گاہوں میں جانے والوں کو بے دریغ تہ تیغ کر رہے

ہوں۔ وہاں فارغ البالی۔ خوش حالی۔ صحت اور طاقت کیسے آسکتی ہے۔

یہ تو رہی مذہب کی بات۔ اب اگر اخلاق کی طرف نگاہ ڈالیں۔ تو گراوٹ کی گہرائی کا اندازہ لگانے سے نگاہِ خیال قاصر معلوم ہوتی ہے۔ اوّل، تو دنیا میں ہر ایک انسان قابلِ قدر۔ قابلِ عزت اور قابلِ محبت ہے۔ لیکن تین ہستیاں تو خصوصاً برتر مانی گئی ہیں۔ یعنی ماں۔ باپ اور استاد یا گورو۔ اِن کے متعلق ہماری مذہبی کتابوں میں یہاں تک لکھا گیا ہے۔ کہ جوان تینوں کی دل و جان سے خدمت اور عزت کرتا ہے۔ اُس کو نہ حج کرنے کی ضرورت ہے نہ تیرتھ کی۔ گھر کے اندر ہی وہ جیتے جاگتے تیرتھ اور دیوتا ہیں۔ لیکن حالاتِ حاضرہ پر نظر ڈالنے سے پتہ لگتا ہے۔ کہ نوجوانوں کے اندر اور لوگوں کے لئے تو کیا ان تین قابلِ تعظیم ہستیوں کے لئے بھی وقار، تعظیم اور ادب کا جذبہ کافور ہو چکا ہے۔ کوئی ہی خوش قسمت کالج یا سکول ہوگا۔ کہ جس میں ہڑتال نہ ہوئی ہو۔ یا اُستادوں کی پگڑی نہ اچھالی گئی ہو۔ مَیں صرف ہڑتال کنندگان کو ہی ذمہ دار نہیں ٹھہراتا قصور دونوں طرف کا ہوتا ہے۔ لیکن اخلاق کی گراوٹ بہر صورت عیاں ہے۔ قصور خواہ کسی جانب کا ہو۔ معلموں میں ہمدردی نہیں رہی۔ طالب علموں کے دل عزت و احترام سے خالی ہیں۔ وہی مثال صادق آتی ہے ؂

نہ اب تادیب میں شفقت نہ شوخی میں ادب باقی
بزرگوں کی روش بگڑی۔ عزیزوں کا چلن بگڑا

والدین اور بچوں کے تعلقات اس سے بھی زیادہ بگڑ چکے ہیں۔ ماں باپ کو بھی بچوں کے لئے وہ محبت اور شفقت نہیں رہی۔ جو پہلے ہُوا کرتی تھی۔ بچے بھی پاسِ ادب کو خیر باد کہہ چکے ہیں۔ یہاں تک ہی بس نہیں۔ کہ ادب و آداب

ہی باقی نہیں رہا۔ بلکہ معمولی معمولی باتوں پر دل کو پاش پاش کرنے والی وارداتیں رُونما ہوتی ہیں۔ جن کو سُن کر اور پڑھ کر دانتوں تلے اُنگلی دبانی پڑتی ہے۔ ایسے واقعات ایک دو نہیں۔ بلکہ بے شمار ہو رہے ہیں۔ اخبار ٹربیون مورخہ ۷ اپریل ۱۹۳۸ء میں لائل پور کے ایک گاؤں کا ایک مقدمہ چھپا جس میں ایک لڑکے نے مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۳۷ء کو اپنے والد کو اس وجہ سے قتل کر دیا۔ کہ وہ تقسیم جائیداد لڑکے کی خواہش کے مطابق نہ کرتا تھا۔ ایسے واقعات جگہ بجگہ ہو رہے ہیں ؎

کیا زمانہ ہے یہ کہ ہے دُشمن
باپ بیٹے کا بھائی بھائی کا (ربانی)

زن و شوہر کے تعلقات کس قدر مُحبّت خیز اور پاکیزہ ہونے چاہئیں۔ لیکن اُسی اخبار میں ایک واقعہ چھپا ہے۔ کہ ایک عورت جو اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی گئی۔ عدالت میں بمقام امرتسر پیش ہُوئی۔ جب خاوند نے اُس کو شناخت کرنے کے لئے اُس کا بُرقعہ اُتروایا۔ تو عورت نے عدالت کے اندر ہی اپنے خاوند کے مُنہ پر تھوک دیا۔ عدالت نے اُس پر ہتک عدالت کے جُرم میں جُرمانہ کیا۔ میرے ایک دوست نے یہ خبر مجھ کو سنائی۔ اور بڑا ہنسا۔ لیکن میں نے کہا۔ کہ یہ ہنسنے کا مقام نہیں۔ سارے مُلک کے لئے رونے۔ نادم ہونے اور شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ یہ واقعہ خاص اُس زن و شوہر کا نہیں۔ بلکہ ایک ہندوستانی مرد و زن کا ہے۔ اس واقعہ کو پڑھ کر ہندوستان کی موجودہ تہذیب اور اس کی موجودہ اخلاقی حالت کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر موجودہ حالات کو سُدھارنے کی کوشش نہ کی گئی۔ تو اس قسم کے واقعات سب گھروں میں ہونے لگیں گے۔

موجودہ زمانہ کچھ عجیب واقعہ ہُوا ہے۔ لوگ اس قسم کے جانکاہ واقعات کو دیکھتے، پڑھتے اور سنتے ہیں۔ لیکن بجائے اظہار تاسف کرنے اور اپنی مُلکی

حالت پر شرمسار ہونے کے خوش ہوتے ہیں۔ اور مذاق اُڑاتے ہیں ؎

بنائے ملّت بگڑ رہی ہے، لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں
یہ طفلِ ناداں غریقِ غفلت ہوئے ذلّت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں (اکبر)

خاص کر اس موجودہ زمانہ میں اہلِ حق کی قلّت ہے۔ اور اہلِ باطل کی کثرت ہے۔ مذہب رُو بہ زوال ہے۔ خواہشاتِ نفسانی نے ایک طلاطم برپا کر رکھا ہے نفسانی اور شیطانی عملیات کے کمال کا زمانہ ہے۔ کہیں عالمانِ بے علم کا زور ہے۔ کہیں صُوفیانِ دغل کا شور۔ نہ سوز نہ گداز نہ سچا عشق۔ نہ راز و نیاز۔ نہ محبت۔ نہ اخلاص۔ نہ وُہ واد، نہ وُہ حُسنِ طلب، کہیں فلسفہ اور منطق کا نکمّا جھگڑا جاری ہے۔ کہیں تحقیقِ مذاہب کی آڑ میں جنگ وجدال ہے۔ کہیں وُجودِ باری تعالیٰ کی نسبت بیہودہ قیل وقال ہے۔ دل ہمہ تن محبّتِ دُنیا میں مُردہ اور عاقبت کی طرف سے افسُردہ ہے ؎

بدلی ہُوئی دُنیا کی ہوا دیکھ رہا ہُوں
ہر رنگ میں اک رنگ نیا دیکھ رہا ہُوں
جس بزم میں چلتا تھا کبھی جامِ محبّت
آج اُس کی ہی مسمُوم فضا دیکھ رہا ہُوں (شرما)

کیا یہاں کے طبعی حالات میں کچھ تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ یا یہاں کی آب وہوا میں فرق آگیا ہے۔ یا یہاں کے زمین وآسمان بدل گئے ہیں۔ نہیں یہ سارے حالات تو ویسے ہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ ؎

اگلی سی تازگی ہے پھُولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص ابتک طاؤس جنگلوں میں

ابتک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں ۔ پستی سی آ گئی ہے پر دل کے ولولوں میں
گل شمعِ انجمن ہے گو انجمن وُہی ہے
حُبّ وطن نہیں ہے، خاکِ وطن وہی ہے

ہمارے جسم بھی ویسے ہی ہیں۔ جسم کی رگوں میں خُون بھی اُسی طرح سے چکّر لگا رہا ہے۔ ہمارے رگ و ریشہ بھی ویسے ہی موجُود ہیں۔ ہماری نسیں اور ناڑیاں بھی اُسی طرح کام کر رہی ہیں۔ جسم کی بناوٹ میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ دماغ پہلے سے کچھ زیادہ ہی کام کرتے ہیں۔ تو پھر موجودہ حالت کی ذمّہ دار کیا چیز ہے۔ اس کا جواب اکبرؔ کے ان اشعار میں موجُود ہے ؎

خلقت جو کہیں ذلیل ہو جاتی ہے
بے غیرت و بے دلیل ہو جاتی ہے
گو جسم میں ظاہرا توانائی ہو
اخلاق میں وُہ علیل ہو جاتی ہے (اکبرؔ)

جو فرق آیا ہے۔ وُہ ہمارے اخلاق میں آیا ہے۔ جو کمی واقع ہوئی ہے ہمارے دِل کے اندر واقع ہُوئی ہے۔ یہ دل زمانہ گذشتہ میں دوسروں کے درد سے پگھل جایا کرتا تھا۔ اب اپنے بھائیوں کے دُکھ میں ہی اُس پر رقت طاری نہیں ہوتی۔ پہلے تو غیروں سے بھی ہمدردی کر کے مسرور ہوتے تھے۔ اب اپنوں پر ہی ظُلم ڈھا کر خوش ہوتے ہیں ؎

اب یہ حالت ہے کہ بُوند بھی آنسُو کی نہیں
ہم نے جن آنکھوں سے بہتے ہوئے دریا دیکھا (افسرؔ)

اب اگر خیال ہے تو اپنا ہے۔ فکر ہے تو اپنی۔ دُھن ہے تو اپنی۔ اُلفت و مُحبت۔ ہمدردی و ایثار کا نام تک موجُود نہیں۔ زر و مال کی ہوس اس قدر

بڑھ گئی ہے۔ کہ اس کے مقابلے پر نہ باپ کی عزت ہے نہ ماں کا پاسِ ادب نہ بھائیوں کے لئے الفت ہے نہ دوستوں کے لئے محبت۔ جیسے کیسے دمڑوں کے حاصل کرنے کے لئے مذموم سے مذموم کارروائی روا رکھی جاتی ہے۔ زر کے مقابلے میں سب رشتے اور اُصول خاک میں مل جاتے ہیں۔ جہاں روپے کا سوال آیا وہاں اخلاق و خلوص۔ اُصول و شعار۔ سب پسِ پشت ڈال دیئے جاتے ہیں ؎

نہ بھائی سے رہی اُلفت نہ یاروں میں رہی ملت
جو اُلفت ہے تو زر سے ہے یہی بس سب سے پیارا ہے (اسحاق)

لوگ موجودہ زمانے کو ترقی کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس کو تہذیب کے زمانے کا نام دیتے ہیں۔ لیکن خدا ایسی ترقی سے بچائے۔ اور اس تہذیب کے موذی چنگل سے چھڑائے جس نے یاروں میں بے وفائی اور اپنوں میں کج ادائی پیدا کر دی ہے۔ رسم اُلفت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ اپنے دیکھتے دیکھتے اخلاق کا خرمن جل کر خاک سیاہ ہو گیا ؎

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا بدل گئی
واللہ وُہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

اپنی آنکھوں دیکھی بات ہے۔ کہ گاؤں کا بنیا زمیندار کو قرض دے کر جس قلم سے قرض کی رقم اپنے بہی کھاتہ میں درج کرتا تھا۔ اُس کو قرضدار کے ہاتھ سے چھوا دیتا تھا۔ بس اس کے لئے وہی سوگند ہو جاتی تھی۔ اور اس قرض کی ادائیگی سے وُہ کبھی منکر نہ ہوتا تھا۔ عدالتوں میں جانے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ خود بخود سب جھگڑے نپٹا لئے جاتے تھے۔ اب کہیں انگوٹھے لگوا لئے جاتے ہیں کہیں سارے کا سارا پنجہ لگوایا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی مقروض منکر ہو جاتا

ہے ۔ اور عدالتوں میں جھوٹ کے پلندے اور دغابازی کی مسلیں مرتّب ہوتی ہیں ۔ بے شک زمانہ گذشتہ میں تعلیم کی کمی تھی لیکن اخلاق اُونچا تھا۔ جہالت ضرور تھی ۔ مگر صداقت زیادہ تھی ۔ لوگ پڑھ لکھ نہ سکتے تھے ۔ لیکن ان کے دل زیادہ پاکیزہ تھے ۔ لوگ بے شک زیادہ قانون دان اور مونشگاف نہیں تھے ۔ لیکن وُہ مقدّمے کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے تھے ۔ لوگ زیادہ ہوشیار نہیں تھے لیکن سادگی اور صدق دلی اُن کے اندر کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ عام لوگ مذہب کی باریکیوں سے بھی بہت آگاہ نہیں تھے ۔ لیکن وُہ جذبۂ ہمدردی اور اُلفت سے سرشار رہتے تھے ۔ اور یہی مذہب کا منشاء اور اعمال کی غایت ہے آج اس قسم کا ہمدرد، خوفِ خُدا سے معمُور، صادق القول، سادہ مزاج اور پاکباز انسان ایک بھی دکھائی نہیں دیتا ؎

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دِکھا ایک ہی شخص

تعلیم کو ہم نے بڑھایا۔ ہوشیاری ہم نے زیادہ حاصل کی عقل اور دماغ کو بھی فروغ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود غرضی، مکّاری، نفرت و حسد کی بھی فراوانی ہوگئی۔ تعلیم کی ترقّی قابلِ تحسین ہے ۔ دماغ کی تیزی بھی مُبارک علامت ہے لیکن ان کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق کا ہونا بھی لازمی ہے ۔ فیشن پرستی ضرور بڑھ گئی ہے ۔ لوگ خوش پوش زیادہ ہوگئے ہیں ۔ زن و مرد اب جسم کی آرائش نہایت اچھی طرح کرتے ہیں ۔ لیکن جو انسانیت کا جوہر تھا ۔ وُہ ہوا ہو چکا ہے ؎

سیرِ کا اس باغِ عالم میں مزا کچھ بھی نہیں
خوشنما ہیں گُل مگر بُوئے وفا کچھ بھی نہیں
رہ گئی ہے اب زمانے میں محبّت نام کی
دل ٹٹولیں تو بجز مکر و دغا کچھ بھی نہیں
(بیتاب دہلوی)

جیسا اُوپر عرض ہوا ہے۔ علمی لیاقت ضرور زیادہ ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کس کام کی۔ اگر اس کا ماحصل بُغض و عناد، کبر و کینہ ہی ہو ؎

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاءاللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے (اکبر)

اکبر نے زمانے کی رَو کو دیکھ کر اپنی حینِ حیات میں ہی موجودہ حالتِ زبوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اُس نے ٹھیک طور پر یہ پیشین گوئی کی تھی ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اَور نئے ساماں بہم ہونگے
بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہونگے
خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ موسم کی
کھلیں گے اَور ہی گُل زمزمے بُلبُل کے کم ہونگے
عقائد پر قیامت آئیگی ترمیمِ ملّت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پُتلے صنم ہونگے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائینگے
کتابوں میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے
کسی کو اس تغیّر کا نہ حِس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے
تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اَے اکبر
بہت نزدیک ہیں وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

تمہید کا مضمون کچھ زیادہ ہو گیا ہے ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

قصّہ مختصر یہ ہے۔ کہ فی زمانہ سچّے انسانوں کی کمی ہو گئی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے۔ کہ انہی لوگوں سے جو انسانیت کا حقیقی مفہوم ہیں۔ کسی ملک اور سوسائٹی کی عزّت ہو سکتی ہے۔ وُہی خود دُنیا میں اُونچے اُٹھ سکتے ہیں۔ اَوروں کے لئے روشنی کے مینار LIGHT HOUSE کا کام دے سکتے ہیں۔ آنے والی نسلیں اُن کے نام پر فخر کرتی ہیں۔ اور اُن کے کارہائے نمایاں کو یاد کرکے اُن کے نقشِ قدم پر چل کر راحت و مسرّت

حاصل کرتی ہیں۔ اس لئے میں اپنے بھائیوں سے مؤدبانہ التماس کرتا ہوں۔ کہ یہ ملک جو کہ ایسے سچے انسانوں کا مخزن اور مرکز تھا۔ اب اُن سے خالی ہو چکا ہے۔ وقت اس بات کا مقتضی ہے۔ کہ اس میں ایسے سچے انسان پیدا ہوں۔ کہ جو اس ملک کی ڈوبتی ہوئی نیا کو سہارا دیں۔ اس کے گرے ہوئے اخلاق کو پھر اُبھاریں اس کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ واپس لائیں۔ اس کے بگڑے چلن کو درست کریں اور اس کے اندر سے لامذہبی، تعصّب، بغض، عناد، فساد، غیریت، کدورت، خودغرضی، نفاق، بداخلاقی، بد اطواری اور اسی قسم کی دیگر تمام خرابیوں کو دور کر کے اس کے اندر مذہب سے پیار، باہمی اُلفت، آشتی، اُخوّت، محبّت، رواداری، ایمانداری، خوش اخلاقی اور صدق دلی کے نیک جذبات کو پیدا کر کے اس کے نام کو اونچا کر دیں۔ سمجھ رکھئے کہ ؎

رُلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

نہ سمجھو گے تو مِٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

اگلے صفحوں میں مَیں نے اپنی ناقص عقل کے مطابق یہ بتلانے کی کوشش کی ہے۔ کہ ایسے سچے انسانوں کے کیا اوصاف ہوتے ہیں۔ کہ جن کو حاصل کر کے وہ دنیا کے تختے کو بدل دیتے ہیں۔ زیر ملکوں کو زبر کر لیتے ہیں۔ قوموں کو سمندر کی عمیق گہرائیوں سے نکال کر اوجِ کمال پر جا بٹھاتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا۔ کہ جو کچھ مَیں عرض کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب مکمّل طور پر عرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی پیشِ نظر کیا جا رہا ہے۔ وہ دل کے سچے جذبات ہیں۔ کئی اور بھی ضروری موضوع قابلِ عرض تھے۔ لیکن کتاب کے زیادہ ضخیم ہونے کے خوف سے ان کو نہیں چھیڑا گیا۔ مالک کی مہر رہی تو اگلی تصنیف[1] میں حاضرِ خدمت کروں گا۔

میرے جیسے کم فہم اور کمزور انسان کے لئے سچے انسان کے اوصاف بیان کرنا

---

[1] دیکھئے لطفِ زندگی تصنیف مصنف کتاب ہذا۔

ایک بڑی مُہم ہے۔ لیکن موجودہ حالات کے مشاہدے سے جو وَلوَلے اَور اُبال دِل میں اُٹھتے ہیں۔ اُن کو دبانا بھی ممکن نہیں اپنی قُدرت اَور طاقت پر تو مجھے کوئی ناز نہیں، اَور زباندانی سے تو مَیں بالکل بے بہرہ ہُوں لیکن میں اُس مالکِ برتر کی بارگاہِ عالی میں دوزانُو ہو کر اِس مُشکل کام کی تکمیل کے لئے طاقت عطا کرنے کی دُعا کرتا ہُوں ؎

کمر کستا ہُوں تیرے نام پر تُو مجھ کو ہمت دے — سہارے پر ترے اُٹھتا ہُوں ترا مدح خواں ہو کر
جہاں بھُولوں بتا جس جا بہک جاؤں ہدایت کر — جو ہو لغزش تو مُجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر

بھروسے پر تری امداد کے بیڑا اٹھایا ہے
فلک کے بوجھ اُٹھانے پر تُلا ہُوں ناتواں ہو کر

کانشی رام چاولہ

۱۵ ستمبر ۱۹۳۸ء

اِنسان کیا ہے؟

گو بظاہر خاک کے پُتلے ہیں یکساں سب مگر
کوئی ہے اکسیر ان میں اور کوئی خاک ہے

ویسے تو مالکِ کُل کی کائنات کا سارا کارخانہ ہی ایک عجوبہ ہے۔ انسان کی عقل اس کے سمجھنے سے قاصر ہے حقیر مٹی جسے ہم جسم اور لباس پر لگتے ہی پونچھ ڈالتے ہیں۔ کس طرح سے رنگارنگ کے پھل پھول، قسم قسم کے بیل بوٹے۔ طرح طرح کی خوردنی اشیاء، ہزاروں قسم کی معدنیات اور قیمتی پتھر پیدا کرتی ہے۔ پھولوں کے اندر رنگ، دلکشی اور خوشبو کیسے آجاتی ہے۔ پھلوں کے اندر خوبصورتی، مٹھاس اور لذّت کہاں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ کس طرح سے ایک مقررّہ اُصول کے مطابق دن رات بڑھتے اور گھٹتے ہیں۔ مختلف موسم اپنا جوبن دکھاتے ہیں۔ سورج اور چاند وقتِ معینہ پر طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ آسمان کے اندر بجلی کس طرح سے چمکتی اور کڑکتی ہے۔ اور پھر کس طرح سے لاکھوں من پانی کہیں سیال شکل میں، کہیں دھنی ہوئی روئی کی طرح برف کی شکل میں۔ کہیں فینائل کی گولیوں جیسے اولوں کی شکل میں زمین پر آتا ہے۔ کس طرح ایک چھوٹا سا بیج زمین میں دب کر اور گل سڑ کر ننھی ننھی پتیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کس طرح سے وہی بڑھ کر بڑا بھاری درخت بن جاتا ہے۔ غرضیکہ قدرت کے یہ سارے کارخانے انسانی عقل کو دنگ کرنے والے ہیں ؂

یہ جتنے جلوے دکھا رہی ہے خدا کی صنعت، خدا کی حکمت
جو چاہے کھولے یہ بھید اُسکے کسی کو اتنی نہیں ہے قدرت (نظیر)

انسان نے بہتیری عقل دوڑائی ہے۔ بڑی چھان بین کی ہے۔ تلاش و تجسس میں حیران و سرگرداں مارا مارا پھرا ہے۔ بڑے بڑے عاقل و عالم سائینس دان قدرت کے ان رازوں کے سمجھنے کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ اور اب بھی سعی کر رہے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ؎

آرسطو لقمان اور افلاطوں ہر ایک سر کو پٹک چکا ہے
یہ وُہ طلسمات ہے کہ جسکی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے (نظیر)

اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ کہ بعض انسان قدرت کے کرشموں کی جھلک سے یہ اندازہ لگا لیتے ہیں۔ کہ اُنہوں نے انتہا کو پا لیا ہے۔ لیکن وُہ خود ہی کچھ عرصہ کے بعد محسوس کرتے ہیں۔ کہ جو کچھ اُنہوں نے معلوم کیا تھا۔ یا تو وُہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یا قصورِ فہم کے باعث اُن کا اندازہ ہی غلط تھا۔ علمِ طِب اور علمِ سائینس کے ہزاروں نئے نظریئے قائم کئے جاتے ہیں۔ اور اُن پر سینکڑوں عالم طبع آزمائی اور دماغ سوزی کر کے بڑی بڑی کتابیں لکھتے ہیں۔ لوگ اُن کی دریافت پر تہنیت اور مبارک بادیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن چند سالوں کے بعد پتہ لگتا ہے۔ کہ وُہ نظریہ تو صرف فریبِ نظر اور قصورِ فہم کا کرشمہ تھا۔ یا جمالِ فطرت کی ایک نامکمل سی جھلک تھی جس نے چشمِ دماغ کو خیرہ کر رکھا تھا۔ چندیں کاوشوں کے بعد پھر ایک اور نظریہ قائم کیا جاتا ہے۔ جس کو مکمل اور بے خطا سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اس کا حشر بھی ویسا ہی یاس انگیز اور ندامت آفریں ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلی تحقیقات کا ہوا تھا۔ غرض کہنا پڑتا ہے ؎

قدرت کے سارے کام تصور سے دور ہیں
فہم و خرد کو ان میں چنین و چناں نہیں (ریاض)

انسان اس کائنات کے اندر کیا حقیقت رکھتا ہے۔ اس بات کا اندازہ سائینس

دانوں کے تجربات اور مشاہدات سے کیا جا سکتا ہے۔ باوجودیکہ جو آلات اس وقت تک ان تجربات کے لئے تیار ہوئے ہیں۔ وہ بجائے خود نامکمل اور کمزور ہیں۔ تاہم ان سے بھی جو کچھ ثابت ہوتا ہے۔ وہ انسانی ہستی کی حقیقت پر کافی روشنی ڈالتا ہے۔ انسان کا قد پانچ فٹ سے سات فٹ تک ہوتا ہے۔ ہماری زمین جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس کا قطر آٹھ ہزار میل ہے۔ اس زمین کے مقابلہ میں انسان کیا چیز ہے وہ اس زمین کا رقبہ نکال کر اس کے فُٹ بنا کر اس ہندسے سے سات کو تقسیم کرنے سے جو نتیجہ نکلے گا۔ وہ انسان کی حقیقت کو بمقابلہ اس کی زمین کے بتائے گا۔ لیکن یہ زمین بجائے خود اس کائنات میں کیا حقیقت رکھتی ہے۔ اس کا تھوڑا سا حساب ایک نگاہ سے یہاں دیا جاتا ہے۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل کی دوری پر واقع ہے۔ سُورج سے روشنی کو زمین تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لگتے ہیں۔ اب اُس کی دوری کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اب سُورج کے ساتھ ساتھ اور اس کے گرداگرد جتنے سیارے ہیں۔ اُن کو ہمارے سُورج کا SOLAR SYSTEM یا نظامِ شمسی کہتے ہیں۔ اس کرّہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک روشنی کو گذرنے میں دس گھنٹے لگتے ہیں۔ نزدیک سے نزدیک جو دوسرا سیارہ ہے۔ وہاں سے روشنی کو زمین تک پہنچنے میں چار سال لگتے ہیں۔ سائنس دانوں کی بنائی ہوئی مضبوط سے مضبوط اور طاقتور سے طاقتور دوربینیں اور خوردبینیں جس دُور ترین سیارے کو اس وقت تک دیکھ سکی ہیں۔ وہاں سے روشنی زمین تک آنے کے لئے ایک ہزار سال کا عرصہ لگتا ہے۔ بعض ایسے ستارے ہیں کہ اُن کی روشنی ابھی تک پہنچی ہی نہیں۔

یہ ہمارا سُورج ہماری زمین سے کئی لاکھ گنا بڑا ہے۔ اور اس کے اردگرد کتنے ہی سیارے اور ستارے ہیں۔ یہ سب کرّہ مل کر ہماری زمین سے کروڑوں

گُنا بڑا ہے۔ لیکن اس کُرّے کی طرح سے اَور اَن گنت کُرّے ہیں۔ ایسے ہی لاحساب سُورج ہیں۔ ہمارا سُورج اُن کے مقابلہ میں وسعت اَور روشنی کے لحاظ سے متوسط درجے کا مانا گیا ہے۔ اب اس ساری کائنات کی وسعت کا حساب لگاکر جوکہ قریب قریب ناممکن ہے۔ دیکھو۔ اور پھر انسان کی ہستی کا اندازہ لگاؤ۔ اگر انسان اس حساب کو لگاکر ہر روز اپنی ہستی کے متعلّق غور کرے۔ تو اس کا سارا غرُور، گھمنڈ، بڑائی اور خودی دُور ہو جائے۔

انسان کی بے بسی اَور بے بضاعتی میں بھی کوئی شک نہیں۔ ایک بڑے سے بڑے طاقتور جوان کی مسہری میں اگر ایک مچھّر داخل ہو جائے۔ تو اس کی نیند حرام کر دیتا ہے۔ کان میں ایک چیونٹی چلی جائے۔ تو آرام کا نام نشان نہیں رہتا آنکھ میں ایک تنکا یا ذرا سا کوئلہ پڑ جائے۔ تو بے چینی کی حد نہیں رہتی۔ سب سے بڑھ کر پھر مَوت کا بھُوت اس پر ہر وقت سوار رہتا ہے۔ اور یہ الیسا زبردست ہے۔ کہ انسان کو اتنی بھی خبر نہیں۔ کہ اگلا دم آئے گا بھی یا نہیں۔ بے شک انسان ایسا ہی بے بس ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں۔ کہ قُدرت کے ان سارے بھیدوں میں عقل لڑانے والا۔ ان رموز کی تہ میں غوطہ زنی کرنے والا۔ ان بعید از فہم مسائل کی گہرائی میں جانے والا بھی انسان ہی ہے۔ باوجودیکہ یہ مخلوق ہے۔ اس کی طاقتیں محدود ہیں۔ اپنے خالق کے مقابلہ میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے ؎

سمجھ کیا ہے اور کیا سمجھ کی بساط
سُمندر سے قطرے کا کیا ارتباط
(اسمٰعیل)

تاہم انسان کو اُس کے خالق نے بے اندازہ قُدرت دی ہے۔ بعض بعض کام جو انسان کرتا ہے۔ وہ حیرت میں ڈالنے والے معجزہ نما ہوتے ہیں۔ مثلاً (الف) لتھو رنیا کے بڑے سردار گاؤن علیجاہ کی نسبت لکھا ہے۔ کہ جو کتاب وہ

پڑھ لیتا تھا۔ کبھی نہ بھولتا تھا۔ اُس نے پچّیس ہزار کتابیں حفظ کی ہوئی تھیں۔ انجیلِ مقدّس۔ مدراش میکلتا۔ صفر توصیفتہ۔ سید راولام۔ تالمدس۔ زوہار۔ کوڈ۔ راشی رم بم سب اس کو زبانی یاد تھیں۔

(ب) لے کروزے بارہ سطور نظم کی بارہ مختلف ناآشنا زبانوں میں سُن کر اُن کو سُنا دیتے تھے۔

(ج) گیمبٹیا کی قوتِ حافظہ ایسی تیز تھی۔ کہ وُہ ایک کتاب کو پڑھ کر شروع سے آخیر تک اور آخیر سے شروع تک اُلٹا سیدھا دونو طرف سے زبانی پڑھ کر سُنا سکتا تھا۔

(د) کئی آدمی آگ پر چلنے۔ آگ کھانے، سانپ کھانے، کانچ کھانے، زہر پینے اور دیگر تعجّب انگیز کام کرتے ہیں۔

(ہ) رُوحانیّت کے معجزہ جات تو قابل بیان ہی نہیں۔

علاوہ ازیں یہی خاک کا پُتلا ہے۔ کہ جو قدرت کے چُھپے ہوئے بھیدوں کو کھولتا ہے۔ ایک چھوٹی سی ہستی رکھتا ہوا شیروں اور ہاتھیوں پر قابو پاتا ہے۔ ان کو بھرے مجمعوں میں ناچ نچاتا ہے۔ بجلی کی ایک چشمک سے خاک سیاہ ہو جانے والا یہی خاک کا پُتلا اپنی تحقیق اور عقل کے زور سے اس کو اپنی داسی بنا کر اس سے اپنے سارے کام کرواتا ہے۔ دریا اور سمندر کے سینے پر سوار ہوتا ہے۔ پر نہیں رکھتا لیکن آسمان میں تھگلی لگاتا ہے۔ غرضیکہ قدرت کی ساری چیزوں پر اپنی حکومت کا سِکّہ بٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ وُہ خالق کہ جو نہ شکل رکھتا ہے۔ نہ رنگ۔ جو بے چون و بے نمون ہے۔ بلکہ علم و ادراک کی زد سے پرے ہے ؎

جُدا ہے فہم سے اور وہم سے وُہ
سمجھ لے جس کو بندہ وہ خدا کیا ہے (اسمٰعیل)

غرضیکہ اس ورا۔ پورا ہر طرح نہاں اور ہر جگہ آشکار ہستی کے اسرار اس قدر پوشیدہ ہیں۔ کہ اُن کی تہ کو پانا تو درکنار اُن کا فہم میں لانا ہی دشوار ہے۔ اور اُن کا بیان کرنا تو زبان و قلم کی طاقت سے ہر طرح سے باہر ہے۔ وہاں مدعیانِ علم و عقل جس قدر شور مچا رہے ہیں۔ اپنی بے خبری اور بے بصری کا ثبوت بہم پہنچا رہے ہیں۔ اس بارہ میں تو انسان یہی کہہ سکتا ہے۔ کہ ؎

کچھ نہ سمجھے ہو نہ بوجھے ہو کہ وہ کیا چیز ہے
نام تم نے سن لیا ہے زاہد و اللہ کا (امیر)

ایسا ہوتے ہوئے بھی یہ مٹی کا پتلا بلا کی چیز ہے۔ کہ اس بے پتہ کا بھی پتہ لگا لیتا ہے۔ وہ ہزار پردوں میں چھپ کر رہتا ہے۔ لطیف ترین ہے۔ لیکن اس کی نظر بھی سارے پردوں کو ایکس رے (X-RAYS) کی طرح سے چیرتی ہوئی اُس کی جھانکی لگا لیتی ہے۔ اُس کا جلال اتنا ہے۔ کہ فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ اُس جلال کی کوہِ طُور پر مُوسےٰ تاب نہ لا سکے لیکن یہ ساڑھے تین ہاتھ کا پتلا اس جلوے کی روشنی میں جا پہنچا ہے۔ قُلقاریاں مارتا ہے۔ قلابازیاں لگاتا ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو یہاں تک غضب کرتا ہے۔ کہ اُسے دیکھکر وہ ساری حکمت اور قُدرت کا مالک اتنا خوش ہوتا ہے۔ کہ اُس کے پاس آ کر اُس کی معصوم حرکتیں دیکھ کر محظوظ ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ خود بھی کھیلنے لگ جاتا ہے۔ اور اگر اس کھیل کُود کے دوران میں انسان گر پڑے۔ تو اُس کو خود ہی اُٹھاتا ہے۔ اُس سے پیار کرتا ہے۔ کہیں اُس کو بھیڑ پنے تو عرش سے اُتر کر اُس کے دُکھ کو دُور کرتا ہے۔ اُسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلا پلا کر خوشی محسوس کرتا ہے۔ یہ کوئی مبالغہ آمیزی یا قصّہ گوئی اور افسانہ نویسی نہیں ہے۔ بلکہ ایک وجدانی حقیقت ہے کہ ع

بھگت کے بس میں ہیں بھگوان

وُہ قادرِ مطلق اپنے پیاروں کے ساتھ بلاشبہ اسی طرح سے برتاؤ کرتا ہے جو بھائی ان باتوں کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کو یقین دلانا مشکل ہے۔ کیونکہ کوئی دلیل ان باتوں کو تصدیق نہیں کر سکتی۔ یہ وجدان و عرفان کی باتیں ہیں۔ اس لئے جو انسان اپنے اندر اس روشنی کا سامان مہیا کر لیتا ہے۔ وُہی ان اعجازوں کا لُطف اُٹھا سکتا ہے۔

جیسے آپ نے دیکھا ہو گا۔ کہ دیہات میں اور بعض دفعہ شہروں میں بھی بعض غریب عورتیں ایک بکس کے اندر کچھ تصاویر اور اس کے ایک طرف خوردبین کے دلدار شیشے لگا کر بچّوں کو تصویریں دکھانے آتی ہیں۔ جو بچّہ دونو ہاتھوں سے باہر کی روشنی کو روک کر، نگاہ کو شیشے پر ٹکا کر اندر کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ کہنے لگ جاتا ہے۔ آہا ہا! کتنے بڑے مکان! کیسے خوبصورت گھوڑے! ہَودے والے ہاتھی! اُونچے اُونچے پہاڑ وغیرہ وغیرہ۔ پاس کھڑے بچّے جنہوں نے یہ تصویریں ابھی نہیں دیکھی ہیں کہتے ہیں۔ "بے وقوف! اس ذرا سی جگہ کے اندر یہ ساری چیزیں کیسے سما سکتی ہیں"؛ حالانکہ وُہ ان ساری چیزوں کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہے۔ اُن سے محظوظ ہو رہا ہے۔ تاہم وُہ اُن دُوسرے لڑکوں کو کس طرح سے یقین دلائے۔ کیا اُس کی کوئی بھی دلیل اُن کو منوا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں اُس کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہ وہ کہے کہ آؤ! تم بھی باہر کی روشنی کو پرے ہٹا دو۔ نگاہ ٹکاؤ اور خوب دھیان لگا کر اندر کو جھانکو تو تم کو بھی وُہ سب نظارے دکھائی دے جائیں گے۔ اُن لڑکوں میں سے جو بھی ایسا کرتا ہے وُہ بھی پہلے لڑکے کی طرح خوشی سے اُچھلنے کُودنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جو باہر ہی کھڑا رہ کر اس ضد پر قائم رہے۔ کہ دلیل سے ثابت کرو۔ کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ اس کا کوئی علاج نہیں جس طرح سے اس لڑکے کو دلیل سے قائل کرانا ممکن نہیں۔ ایسے ہی اُن بھائیوں کو اِن نظاروں کی نسبت دلیل سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اگر وہ حقیقتاً ان سے لُطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ تو اُنہیں بھی دُنیا کی روشنی سے پرے ہٹ کر، اپنے دِل

کو قائم کرکے اپنے اندر نگاہ ڈالنی ہوگی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ غرض یہ ہے۔ کہ جہاں اس صانع مطلق کی صنعت کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہاں اُن کو عجیب کہنے والا انسان خود سب سے بڑا اعجوبۂ روزگار ہے۔ اُس صانعِ حقیقی کی باقی قدرت بھی حیرت خیز ہے لیکن یہ خاکی پتلا اُن سب سے بڑھ کر حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ اس کی بناوٹ میں اس کاریگر نے اپنی صنّاعی کا کمال دکھایا ہے۔ اوّل تو انسانی جسم کی ہی کَل کیا بناوٹ کی خوبی کے لحاظ سے اور کیا مشینری کی لطافت اور باریکی کے خیال سے اپنا جواب آپ ہے۔ اس چھوٹی سی آنکھ کے اندر نور کا موجود ہونا اور اس آنکھ کی پتلی میں بڑے بڑے مکانات، پہاڑ، حتیٰ کہ آسمان تک کا سما جانا ایک بے نظیر کرشمہ ہے! انسان کا دماغ اس سے بھی بڑھ کر عجوبہ ہے۔ ایک آدمی جو کئی زبانیں جانتا ہے۔ وہ جس زبان میں بھی تقریر یا تحریر کرنے لگتا ہے۔ اُسی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ جھٹ اس دماغ کے پٹارے میں سے نکلنا شروع ہوتا ہے۔ اور الفاظ کی ایک رَو جاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ اسی طرح سے نکلتی چلی آتی ہے۔ کہ جس طرح سے بھگوان نے دروپدی کو کورو سبھا میں بے حرمتی سے بچانے کے لئے اُس کی دھوتی کا سلسلہ اٹوٹ کر دیا تھا۔ پھر اگر پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تو جس پڑھی ہوئی زبان کی کتاب لے کر بیٹھو۔ دماغ اس کے حروف و الفاظ کو ایسے سُرعت سے سمجھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے بجلی کی لہریں اپنی مسافت طے کرتی ہیں۔ جیسے ہوا کے اندر ہوائی جہاز اُڑتا ہے ؎

حکمت سے ہے یہ خاک کا پتلا بنا ہوا
نور آنکھ میں ہے اُس کے تو مغز استخواں میں ہے

خود انسان ایک یا دو من سے زیادہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتا لیکن اس کے دماغ نے وہ وہ کلیں ایجاد کی ہیں۔ کہ جو ہزاروں من بوجھ ایک دم اُٹھا سکتی ہیں۔ باریک سے

باریک اشیاء کو دیکھنے کے لئے آلات تیار کئے ہیں ۔ اپنے اندر تک کی حالت کو جانچ لینے کے لئے سامان مہیا کر لیا ہے ۔ دُور سے دُور چیزوں کی ماہیت کو جاننے کے لئے اسباب طیار کئے ہیں ۔ غرضیکہ انسان اس کائنات کے اندر عجیب ترین مخلوق ہے ذرا غور کیجئے تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک منبع کمال   گر سعی ہو تو دیکھ لے تو شانِ ذوالجلال

کیفیتیں بھری ہیں خاکی میں تو نے کیا کیا
کیا کیا چھلک رہا ہے جامِ سفال تیرا (اکبر)

ایک فارسی شاعر نے لکھا ہے ؎

اگر بہ نسخۂ تشریحِ جسم در نگری
شروحِ صنع دریں جلدِ مختصر یابی (سلمان)

ترجمہ :- اگر تو انسانی جسم کی شرح کی کتاب میں نگاہ مارے ۔ تو اس مختصر سی کتاب میں قدرت کی ساری تشریحات کو دیکھ پائے گا ۔

حقیقت میں اُس صانعِ ازلی نے اس خاک کے پُتلے کو وُہ شرف بخشا ہے اور اس میں اپنی حکمت اور صناعی کا وُہ کمال دکھایا ہے ۔ کہ اُس کی کوئی اور مثال نہیں ؎

بنایا آدمی کو ذوقؔ اک جزوِ لطیف ہے
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے (ذوقؔ)

اُس دربارِ عالی میں انسان کا شرفِ قبولیت دیکھ کر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں ۔ جس مقام پر یہ جا پہنچتا ہے ۔ وہاں ملائک و دیگر خلائق کی رسائی نہیں ۔ جو قدر و منزلت اس کو حاصل ہوتی ہے ۔ اس کو دیوتا تک ترستے ہیں ؎

امیر اس کی ہے لامکاں تک رسائی
فرشتے سے بھی کچھ سوا آدمی ہے (امیرؔ)

کو قائم کر کے اپنے اندر نگاہ ڈالنی ہوگی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ غرض یہ ہے۔ کہ جہاں اس صانع مطلق کی صنعت کے کارخانے عجیب ہیں۔ وہاں اُن کو عجیب کہنے والا انسان خود سب سے بڑا عجوبۂ روزگار ہے۔ اُس صانعِ حقیقی کی باقی قُدرت بھی حیرت خیز ہے لیکن یہ خاکی پُتلا اُن سب سے بڑھ کر حیرت میں ڈالنے والا ہے۔ اس کی بناوٹ میں اس کاریگر نے اپنی صنّاعی کا کمال دکھایا ہے۔ اوّل تو انسانی جسم کی ہی کَل کیا بناوٹ کی خُوبی کے لحاظ سے اور کیا مشینری کی لطافت اور باریکی کے خیال سے اپنا جواب آپ ہے۔ اس چھوٹی سی آنکھ کے اندر نُور کا مُوجود ہونا اور اس آنکھ کی پُتلی میں بڑے بڑے مکانات، پہاڑ، حتیٰ کہ آسمان تک کا سما جانا ایک بے نظیر کرشمہ ہے! انسان کا دماغ اس سے بھی بڑھ کر عجوبہ ہے۔ ایک آدمی جو کئی زبانیں جانتا ہے۔ وہ جس زبان میں بھی تقریر یا تحریر کرنے لگتا ہے۔ اُسی زبان کے الفاظ کا ذخیرہ جھٹ اس دماغ کے پٹارے میں سے نکلنا شروع ہوتا ہے۔ اور الفاظ کی ایک رَد جاری ہو جاتی ہے۔ اور وُہ اسی طرح سے نکلتی چلی آتی ہے۔ کہ جس طرح سے بھگوان نے دروپدی کو کورو سبھا میں بے حُرمتی سے بچانے کے لئے اُس کی دھوتی کا سلسلہ اٹوٹ کر دیا تھا۔ پھر اگر پڑھنے کی ضرورت محسُوس ہوتی ہے۔ تو جس پڑھی ہوئی زبان کی کتاب لے کر بیٹھو۔ دماغ اس کے حُروف و الفاظ کو ایسے سُرعت سے سمجھتا چلا جاتا ہے۔ جیسے بجلی کی لہریں اپنی مسافت طے کرتی ہیں۔ جیسے ہوا کے اندر ہوائی جہاز اُڑتا ہے ؎

حکمت سے ہے یہ خاک کا پُتلا بنا ہوا
نُور آنکھ میں ہے اُس کے تو مغز استخواں میں ہے

خود انسان ایک یا دو من سے زیادہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ لیکن اس کے دماغ نے وُہ وُہ کلیں ایجاد کی ہیں۔ کہ جو ہزاروں من بوجھ ایک دم اُٹھا سکتی ہیں۔ باریک سے

باریک اشیاء کو دیکھنے کے لئے آلات تیار کئے ہیں۔ اپنے اندر تک کی حالت کو جانچ لینے کے لئے سامان مہیا کر لیا ہے۔ دُور سے دُور چیزوں کی ماہیت کو جاننے کے لئے اسباب طیار کئے ہیں۔ غرضیکہ انسان اس کائنات کے اندر عجیب ترین مخلوق ہے ذرا غور کیجئے تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک منبعِ کمال گر سعی ہو تو دیکھ لے تُو شانِ ذُوالجلال
کیفیتیں بھری ہیں خاکی میں تُو نے کیا کیا
کیا کیا چھلک رہا ہے جامِ سفال تیرا (اکبر)

ایک فارسی شاعر نے لکھا ہے ؎

اگر بہ نسخہ تشریحِ جسم در نگری
شروحِ صنع دریں جلدِ مختصر یابی (سلمان)

ترجمہ:۔ اگر تُو انسانی جسم کی شرح کی کتاب میں نگاہ مارے۔ تو اس مختصر سی کتاب میں قُدرت کی ساری تشریحات کو دیکھ پائے گا۔

حقیقت میں اُس صانعِ ازلی نے اس خاک کے پُتلے کو وُہ شرف بخشا ہے اور اس میں اپنی حکمت اور صناعی کا وُہ کمال دکھایا ہے۔ کہ اُس کی کوئی اور مثال نہیں ؎

بنایا آدمی کو ذوق اک جزوِ لطیف ہے
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کیلئے (ذوق)

اُس دربارِ عالی میں انسان کا شرفِ قبولیت دیکھ کر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ جس مقام پر یہ جا پہنچتا ہے۔ وہاں ملائک و دیگر خلائق کی رسائی نہیں۔ جو قدر و منزلت اس کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کو دیوتا تک ترستے ہیں ؎

امیر اس کی ہے لامکاں تک رسائی
فرشتے سے بھی کچھ سوا آدمی ہے (امیر)

دیوتا، گندھرب، جچھ، کِنر اور فرشتے ہر وقت خدا کی حمد و ثنا میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا ہر گھڑی کام ہی یہی ہے۔ اُن کو بارگاہِ عالی کا قرب بھی حاصل ہے۔ لیکن جب انسان بلند پروازی کرتا ہے۔ تو وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں مقرّبینِ سماوی کو بھی باریابی نہیں ؎

باوجودیکہ پَر و بال نہ تھے آدم کے
پہنچا اُس جا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا (میر درد)

اس وقت انسان کی توقیر کو دیکھ کر، اُس کے شرف کو دھیان میں لا کر وہ آسمانی مخلوق بے ساختہ بول اُٹھتی ہے ؎

کیا شانِ ایزدی نے تماشہ دکھا دیا
انسان کا فرشتوں سے رُتبہ بڑھا دیا

لیکن ایک سوال ہوتا ہے۔ کیا ہر ایک انسان کو ایسا شرف اور عزّت حاصل ہوتی ہے۔ کیا ہر ایک انسان کی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ؎

فرشتے بھی دیکھیں تو کھُل جائیں آنکھیں
بشر کو وہ جلوے دکھائے گئے ہیں

نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ یہ توقیر اُسی کو حاصل ہوتی ہے۔ جو انسان خِلعتِ انسانیت سے مزیّن ہے۔ اگر اس جوہر سے بے بہرہ ہے۔ تو اس کی گراوٹ کی، اُس کی ضلالت کی؛ اُس کی خواری کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی ؎

شیطان بھی اماں مانگتا ہے انکے عمل سے
کیا حضرتِ آدم کی بھی اولاد غضب ہے (ذوق)

یہ عجوبۂ روزگار مخلوق جس طرف جھُک جائے۔ اُس طرف ہی غضب ڈھاتا ہے بھلائی اور خوبی کی طرف جھکے۔ تو فرشتے اس پر رشک کھائیں۔ بدی اور بداعمالی

کی طرف راغب ہو۔ تو شیطان پناہ مانگے ؎

مخلوقِ الٰہی میں عمل پر جو نظر کر

انسان سے بدتر ہے نہ انسان سے بہتر (اکبرؔ)

انسان کی اس مختلف الحالی کو دیکھ کر اور اُس کی طبع اور اعمال میں بُعد المشرقین پر نظر کر کے ہی تو کسی نے کہا ہے ؎

شیطان کا شیطان، فرشتہ کا فرشتہ

انسان کی یہ بوالعجبی یاد رہے گی

جب یہ شیطنت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تو پھر نہ یہ گورو کا نہ پیر کا۔ اگر موت کی تلوار اُس کے سلسلۂ حیات کو منقطع نہ کرے۔ تو شیطنت کے رستہ پر جاتا ہُوا انسان نہ جانے کیا غضب ڈھائے۔ اور کیا آفت برپا کرے ؎

بس اک موت سے ابنِ آدم ہے عاجز

وگرنہ نہ تھا یہ کسی کے بھی بس کا

غرضیکہ انسان عجیب چُوں چُوں کا مُربّہ ہے۔ اُس کی عقل اور ہوش کے کاموں کو دیکھیں۔ تب بھی حیرانی ہوتی ہے۔ اور اگر اس کی جہالت اور گراوٹ کے کارناموں پر نگاہ ڈالیں تو بھی ع "بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است"۔ کہنا پڑتا ہے ؎

سچ پُوچھئے تو ملنا ممکن نہیں جہاں میں

دانا بھی آدمی سا، نادان بھی بشر سا (بیدلؔ)

وُہ بھی انسان ہے۔ جو دوسرے کے آرام کے لئے، دُوسرے کی تکلیف رفع کرنے کے لئے اپنا گھر بار تک قُربان کر دیتا ہے۔ دوسرے کی حفاظت اور جان بچانے کے لئے اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔ لیکن وُہ بھی انسان ہے۔ کہ چند پیسوں کے لالچ سے دُوسرے انسان کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اپنے انتقام کے جذبہ کو تسکین

دینے کے لئے دُوسرے کی جان کا لاگو ہو جاتا ہے۔ اپنے پیٹ کے لئے یا اپنی زبان کے چسکے کے لئے دُوسروں پر چھری چلاتا ہے۔ یا مذہب کے فرض کو غلط طور پر سمجھ کر اپنے بھائیوں کو تہ تیغ کرتا ہے۔ اور اس سے ثواب حاصل کرنے یا سُورگ یا بہشت میں جانے کی توقع رکھتا ہے ؎

کوئی ہے کافر، کوئی مُسلماں، جُدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اِس کے نزدیک رہبری ہے وُہ اُس کے نزدیک رہزنی ہے

غرضیکہ انسانی فطرت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کی متضاد حالتیں خیال کی طاقت سے باہر ہیں۔ جہاں ایک طرف راجہ شوی کبُوتر کی جان بچانے کے لئے اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر دے دیتا ہے۔ وہاں راجہ کنس اپنی بہن کی اولاد کو ایک ایک کر کے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرتا ہے ؎

عجب حالت ہے انساں کی نرالے اسکے ہیں جوہر
کہ نیکی اور بدی کا یہ پراگندہ ہے اک دفتر
نہ بھولو اسکی بھولی بھالی صُورت پر کبھی عارفؔ
یہ ہے اک طرفہ معجون جسکی خاصیت ہے طرفہ تر (عارفؔ)

انسانی طبائع کی اس نیرنگی کو نظیرؔ نے کیا اچھا بیان کیا ہے ؎

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں
اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جُوتیاں
چلتا ہے آدمی ہی مُسافر ہو لے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی چور ہے اور آدمی ہی جال
سچّا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
یاں آدمی ہی لڑتے ہیں قہر سے گھُور گھُور
اور آدمی ہی دیکھ انہیں بھاگتے ہیں دُور

اِنسان کون ہے؟

ہے اُنس مادّہ اس کا مُحبّت اس کا خمیر
یہی سبب ہے جو انسان نام اس کا ہُوا

ظاہرہ طور پر تو یہ سوال بچّوں کا سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کون ہے؟ کیونکہ اس کا جواب صاف ہے کہ انسان وُہ ہے۔ جو اس رُوئے زمین پر اشرف المخلوقات کا شرف حاصل کئے۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، ناک وغیرہ اور دِل و دماغ رکھنے والا کم وبیش ساڑھے تین ہاتھ لمبا مٹی کا چلتا پھرتا پُتلا ہے۔ انسان کی یہ تعریف ظاہرہ تو جچتی ہے۔ لیکن کیا حقیقتاً جس ہستی میں مندرجہ بالا اوصاف ہوں۔ اُسے انسان کہا جا سکتا ہے؟ مخلوق کی تقسیم کے لحاظ سے تو شائد یہ تعریف ٹھیک ہو لیکن انسانیت کے لحاظ سے نہیں۔ انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے تو یہ بات ہے کہ ؎

ہو نہ کچھ انسانیت انسان میں تو پھر انساں کیا
اَے ظفر گرچہ ہو ظاہر میں وُہ انساں کی شکل (ظفر)

ایسے چلتے پھرتے پُتلے تو بے شمار ہیں۔ اگرچہ حکومتیں مردم شماری کر کے تمام بنی نوع انسان کی تعداد کو معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لیکن افریقہ کے جنگلوں کے حبشیوں اور دیگر ہیچوں قسم کی خلائق کی گنتی کرنا ممکن نہیں ہے۔ غرضیکہ اَن گنت انسانی پُتلے اس کائنات میں موجود ہیں۔ لیکن ؎

آدمی کہتے ہیں جن کو کم ہیں دُنیا میں وُہ لوگ
یوں تو سب اولادِ آدم سے یہ بستی ہے بھری (ظفر)

اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ظاہرہ بناوٹ کے لحاظ سے تو انسان انسان میں کوئی نمایاں فرق دکھائی نہیں دیتا۔ سب کے ہی دو ہاتھ اور دو پاؤں وغیرہ ہیں۔ سب کے ہی چہروں پر آنکھیں اور ناک لگے ہوئے ہیں۔ سب کا ہی سر اوپر اور پاؤں نیچے ہیں۔ سب کے ہی کندھوں میں سے ہاتھوں کی شاخیں پھوٹ کر نکلی ہوئی ہیں۔ لیکن ؎

بظاہر سب مساوی ہیں مگر ہے فرق باطن میں
نہ ہر سینے میں حکمت ہے نہ ہر خُم میں فلاطوں ہے

بظاہر سب پتھر ایک سے ہوتے ہیں سختی کے لحاظ سے، سائینس کی رُو سے ان کی ماہیت میں ذرّہ بھر فرق نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی قدر و قیمت جُدا جُدا ہوتی ہے ایک پتھر سڑکوں پر کُوٹے جاتے ہیں۔ ایک پتھر تاجِ شاہی میں شان سے مزّین ہو کر شہنشاہوں اور مہاراجوں کے سر پر جگہ پاتے ہیں۔ کیونکہ ؎

خوبئے جوہر سے پاتی ہے ہر اک شئے امتیاز
لعل بھی پتھر ہی ہے لیکن وہ پتھر اور ہے!

ہر ایک چیز کا اپنا اپنا وصف اور جوہر ہوتا ہے۔ اس وصف یا گُن کے رہنے سے وُہ چیز اپنی جنس میں شمار ہو سکتی ہے۔ جُونہی وُہ چیز اپنے اس ذاتی جوہر کو چھوڑ دیتی ہے اُسی وقت وُہ اپنے ہم جنسوں کی قطار سے باہر ہو جاتی ہے۔ ذاتی وصف کی مَوجُودگی ہی اس شَے کی زندگی ہے۔ مثلاً ویسے تو نرمی اور لطافت اعلےٰ وصف شمار ہوتے ہیں۔ اشیاءِ خوردنی یعنی پھل پھول، سبزی ترکاری اور پارچات پوشیدنی میں جس قدر لطافت اور نرمی ہو۔ اس قدر ہی وہ زیادہ مرغوب خاطر ہوتی ہیں اور زیادہ قیمت پاتی ہیں۔ لیکن جب لکڑی اور لوہا درکار ہوتا ہے۔ تو یہ دونو اشیاء جس قدر سخت مل سکیں، حاصل کی جاتی ہیں ؎

جَوہرِ ذات بھی لازم ہے ہر اک شے کیلئے
موم سا نرم ہو یہ خوبئے فولاد نہیں!
(رِند)

اسی طرح سے انسان میں انسانیت کا جوہر ہونا لازمی ہے۔ ورنہ وُہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ محض شکل انسانی ہونے سے یا پاکیزہ اور قیمتی لباس پہننے سے ہر ایک انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ صرف ظاہری بناوٹ اور سجاوٹ ہی انسان کہلانے کا معیار نہیں ہیں۔ حقیقت میں تو سجاوٹ اور اعلےٰ پوشاک بھی زیبِ تن کرنے کا اُسی کو حق ہے۔ کہ جس میں انسانیت کا وصف ہے۔ جو اس ذاتی خوبی سے محروم ہے۔ وُہ اعلےٰ پوشاک پہننے کا حقدار نہیں ہے ؎

آدمیت ہے تو ہے زیبا لباسِ فاخرہ
ورنہ اک خر ہے کہ ہے جس پر پڑا اطلس کا جھول

معدنیات یعنی سونا، چاندی، پلاٹینم وغیرہ پتھروں کے اندر سے نکلتی ہیں۔ لیکن ہر ایک پتھر کے اندر وُہ موجود نہیں ہوتیں۔ جس مقام پر معدنیات کی کان ہو۔ اس مقام کی بڑی توقیر ہوتی ہے۔ اُس کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ وہاں پر حکومت کی طرف سے پہرہ قائم ہو جاتا ہے۔ بڑی احتیاط سے اس مقام کو کھودا جاتا ہے۔ اس مقام سے کھودے ہُوئے پتھر کنکر کا ایک ایک ذرہ بڑی ہوشیاری سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جن پہاڑوں میں یہ قیمتی چیزیں نہیں پائی جاتیں۔ اُن کو بارود کے ذریعہ اُڑایا جاتا ہے۔ وہاں سے پتھر کاٹ کاٹ کر سڑکوں پر۔ اور ریل کی پٹڑی پر ڈالنے کے لئے مصالحہ تیار کیا جاتا ہے۔ قدر و منزلت اُسی مقام کی ہوتی ہے۔ جہاں پتھروں میں معدنیات موجود ہیں ؎

گرچہ سیم و زر ز سنگ آید ہمے
در ہمہ سنگے نباشد زر و سیم (سعدیؒ)

ترجمہ:۔ اگرچہ سونا، چاندی پتھر کے اندر سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک پتھر میں تو سونا چاندی موجود نہیں ہوتے ٭

राजस्थान सरकार

जन स्वास्थ्य अभियान्त्रिक विभाग

क्रमांक : निविदा/सख्या/7/जी एस/ दिनांक 31-5-78

निविदा सूचना

1) राजस्थान के राज्यपाल की ओर से विभिन्न जलप्रदाय योजनाओं के लिये पी. वी. सी. पाइप फिटिंग की खरीद हेतु मुहरबन्द निविदायें आमन्त्रित की जाती हैं। निविदाय दिनांक 17-8-78 को मध्यान्तर 3-00 बजे तक प्राप्त की जावेगी एव उसी दिन साय 3-30 बजे निविदादाताओं तथा उनके अधिकृत प्रतिनिधियो के समक्ष जो भी उस दिन उपस्थित होना चाहेंगे खोली जावेगी। निविदा विवरण पत्र मुख्य अभियन्ता, जन स्वास्थ्य अभियान्त्रिक विभाग, राजस्थान 2 सिविल लाइन जयपुर-302006 के कार्यालय मे किसी भी कार्यालय दिन/समय 16-8-78 तक के लिये विक्रय हेतु उपलब्ध हैं। निविदा पत्र का शुल्क 10/- है।

2) निविदादाताओं के लिए विवरण पत्र इस कार्यालय से खरीदना आवश्यक है एव इसके एवज मे जमा कराई गई राशि किसी भी हालत में वापिस नहीं की जायेगी।

3) निविदाएं जो देर से प्राप्त होंगी सुव्यवस्थित ढग से मोहरबन्द नहीं की गई हैं, दूरभाष यन्त्र द्वारा अथवा तार से प्रेषित की गई निरस्त कर दी जावेगी। यह विभाग किसी भी हालत में एवं किसी भी तरह की देरी से एव प्राप्त होने वाली निविदाओं के लिये जिम्मेवार नहीं होगा।

(विनोद जैन)
अधिशाषी अभियन्ता एव
तकनीकी सहायक (द्वितीय)
मुख्य अभियन्ता, जन स्वास्थ्य अभि. विभाग,
जयपुर

डी. पी. आर./2036/78

यदि कोई मनुष्य नाली में पड़ा हो, तो उसे बाहर खींचने के लिए उसके पास जाना पड़ता है और उसे खींचने वाला खुद भी कुछ गंदा हो जाता है। सदाचार और नीति की शिक्षा देने वाला झाड़ू की तरह होता है। घर की सफाई करने में झाड़ू खुद भी कुछ मैली हो जाती है (अंग्रेजी का भाषान्तर)

—बाल शेम तोफ
(यहूदी मनीषि)

अपराधों, कुकर्मों आदि के बारे में दो मत हैं। एक तो यह कि अपराध या कुकर्म बीमारी की तरह होते हैं और इनका इलाज करना चाहिए। अंग्रेजी की एक उक्ति है: अपराधियों को अस्पताल में और बीमारों को जेल में रखना चाहिए। इसका आशय यह है कि मनुष्य परिस्थितियों से मजबूर होकर या समाज के नैतिक पतन के कारण अपराध करता है [illegible]की मानसिक चिकित्सा करनी चाहिए। दंड विधान में एक प्रकार की सजा को करैक्टिव' यानी सुधारक कहते हैं। दूसरा मत है कि अपराधियों को कठोर दंड देना चाहिए जिससे उन्हें फिर अपराध करने का साहस न हो और दूसरों को भी नसीहत मिले।

यहूदी मनीषि का उपदेश है कि अपराधी को सुधारने का प्रयत्न करना चाहिए। सुधारने के इस प्रयत्न में सुधारक को उनसे मिलना-जुलना और उनके संग रहना आवश्यक होता है। इस प्रयत्न में उसे भी शायद कुछ अपराधों का भागीदार बनना पड़े और लांछन का शिकार होना पड़े। परन्तु उसे इसकी परवाह नहीं करनी चाहिए झाड़ू घर को साफ करती है, पर खुद मैली हो जाती है, लेकिन उसे साफ किया जा सकता है, इसी प्रकार अपराधियों को सुधारने के काम में यदि कोई गंदगी लग जाय, तो उसे दूर किया जा सकता है। शर्त यही है कि सुधारक का चरित्र शुद्ध और निर्मल होना चाहिये और उसमें प्रलोभनों में न फंसने की क्षमता होनी चाहिये। एक उक्ति है:

काजर की कोठरी में
कैसो हू सयानों जाय,
काजर की एक रेख
लागै पर लागै हैं।

कुकर्मियों के संसर्ग से मनुष्य पर कलंक लग जाता है। पर इस कलंक को 'काजल की रेख' के समान धोया भी जा सकता है।

-च. वार्ष्णेय

सुभाषित प्रदीप (१५५)

सत्यं त्रयोदशविधं सर्वलोकेषु भारत ।
सत्यं च समता चैव दमश्चैव न संशयः ।
अमात्सर्यं क्षमा चैव ह्रीस्तितिक्षाऽनसूयता ।
त्यागो ध्यानमथार्यत्वं धृतिश्च सतत दया ।
अहिंसा चैव राजेन्द्र सत्याकारास्त्रयोदश ॥

हे युधिष्ठिर, सारे ससार में सत्य तेरह प्रकार का है । सच बोलना, सौम्य स्वभाव, आत्म सयम ईर्ष्या न करना, क्षमा, लज्जा, सहनशीलता, द्वेष न करना, त्याग, ध्यान, श्रेष्ठ जीवन, सुख-दुख आदि में चित्त की स्थिरता, दया तथ अहिंसा ।

—महाभारत (शान्ति पर्व)

महाभारत युद्ध मे परिजनों का तथा प्रियजनों के सहार पर युधिष्ठिर का हृदय विषाद से भर गया और वह बहुत उदास होगया । तब कृष्ण ने उस शरशय्या पर पड़े हुए भीष्म पितामह के पास चलने की सलाह दी । वहां पहुचने पर भीष्म पितामह ने युधिष्ठिर को जो उपदेश दिये, उनका एक अंश मैंने उद्धृत किया है ।

इस उपदेश में ध्यान देने बात यह है कि सत्य के तेरह प्र बताये हैं। आम तौर पर समझा और माना जाता है कि केवल सच बोलने का नाम परन्तु यह तो सत्य का केवल रूप है। सत्य मनुष्य के सारे जी तथा आचरण से सम्बन्ध रखता गांधीजी ने अहिंसा को सत्य का साधन कहा है । इसलिए वास्तव सत्य परायण मनुष्य वही माना सकता है जिसमें भीष्म पितामह बताये हुए तेरह गुण हों ।

—च. वाष्ण

प्रति हैक्टर 300 सि. लि. दवा छिड़कें

दवा मिलने का पता :—

राजस्थान स्टेट एग्रो इन्डस्ट्रीज़

का शो रूम,

अम्बर सिनेमा के पास, जयपुर JPC

न्यास की निम्न योजनाओं में व्यवसायिक भूखण्डों की नीलामी होगी :

क्र. सं.	योजना का नाम	भू सं.	अनुमानित क्षेत्रफल	दिनांक	समय
1–	लकड़ी पत्थर मण्डी योजना।	शो रू. सं. डब्लू 1 से 5 तक	233.21 व. मी.	26-7-80	प्रात: 9 बजे
2–	सुभाष नगर शापिंग सेन्टर।	दु. सं. बी-8 से बी-20 तक	74.30 व. मी.	28-7-80	प्रात: 9 बजे
3–	कबीर मार्ग (बनीपार्क)	दु. सं. के. ई 8, 9, 10	74.30 व. मी.	30-7-80	प्रात: 9 बजे

इच्छुक खरीददार मौके पर उपस्थित होकर 500/- रुपया जमा कराकर बोली लगावें। नीलामी पश्चात बोली की एक चौथाई राशि मौके पर नकद जमा करानी होगी।

विशेष जानकारी हेतु सम्पर्क करे : **मैसर्स आदित्य आक्शन हाउस,** किशनपोल बाजार, जयपुर फोन नं. **65252**

आर. पी. तिवारी
सचिव

एन. के. वर्मा
जिलाधीश एवं अध्यक्ष

नगर विकास न्यास, जयपुर।

دینے کے لئے دُوسرے کی جان کا لاگو ہو جاتا ہے۔ اپنے پیٹ کے لئے یا اپنی زبان کے چسکے کے لئے دُوسروں پر چھُری چلاتا ہے۔ یا مذہب کے فرض کو غلط طور پر سمجھ کر اپنے بھائیوں کو تہ تیغ کرتا ہے۔ اور اس سے ثواب حاصل کرنے یا سُورگ یا بہشت میں جانے کی توقع رکھتا ہے ؎

کوئی ہے کافر، کوئی مُسلماں، جُدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اِس کے نزدیک رہبری ہے وُہ اُس کے نزدیک رہزنی ہے

غرضیکہ انسانی فطرت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کی متضاد حالتیں خیال کی طاقت سے باہر ہیں۔ جہاں ایک طرف راجہ شوی کبوتر کی جان بچانے کے لئے اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر دے دیتا ہے۔ وہاں راجہ کنس اپنی بہن کی اولاد کو ایک ایک کر کے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرتا ہے ؎

عجب حالت ہے انساں کی نرالے اسکے ہیں جوہر
کہ نیکی اور بدی کا یہ پراگندہ ہے اک دفتر
نہ بھُولو اسکی بھولی بھالی صُورت پر کبھی عارفؔ
یہ ہے اک طرفہ معجون جسکی خاصیت ہے طرفہ تر
(عارفؔ)

انسانی طبائع کی اس نیرنگی کو نظیر نے کیا اچھا بیان کیا ہے ؎

پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں
اور آدمی ہی اُن کی چُراتے ہیں جُوتیاں
چلتا ہے آدمی ہی مُسافر ہولے کے مال
اور آدمی ہی مارے ہے پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی چور ہے اور آدمی ہی جال
سچّا بھی آدمی ہی نکلتا ہے میرے لال
یاں آدمی ہی لڑتے ہیں قہر سے گھُور گھُور
اور آدمی ہی دیکھ انہیں بھاگتے ہیں دُور

اِنسان کون ہے؟

ہے اُنس مادّہ اس کا محبّت اس کا خمیر
یہی سبب ہے جو انسان نام اس کا ہُوا

ظاہرہ طور پر تو یہ سوال بچّوں کا سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کون ہے؟ کیونکہ اس کا جواب صاف ہے۔ کہ انسان وُہ ہے۔ جو اس رُوئے زمین پر اشرف المخلوقات کا شرف حاصل کئے۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں، دو کان، ناک وغیرہ اور دِل و دماغ رکھنے والا کم و بیش ساڑھے تین ہاتھ لمبا مٹّی کا چلتا پھرتا پُتلا ہے۔ انسان کی یہ تعریف ظاہرہ تو حجتی ہے۔ لیکن کیا حقیقتاً جس ہستی میں مندرجہ بالا اوصاف ہوں۔ اُسے انسان کہا جا سکتا ہے؟ مخلوق کی تقسیم کے لحاظ سے تو شائد یہ تعریف ٹھیک ہو لیکن انسانیت کے لحاظ سے نہیں۔ انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے تو یہ بات ہے کہ ؎

ہو نہ کچھ انسانیت انسان میں تو پھر انساں کیا
اے ظفرؔ گرچہ ہوا ظاہر میں وُہ انساں کی شکل (ظفرؔ)

ایسے چلتے پھرتے پُتلے تو بے شمار ہیں۔ اگرچہ حکومتیں مردم شماری کر کے تمام بنی نوعِ انسان کی تعداد کو معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن افریقہ کے جنگلوں کے حبشیوں اور دیگر بہیچوں قسم کی خلائق کی گنتی کرنا ممکن نہیں ہے۔ غرضیکہ ان گنت انسانی پُتلے اس کائنات میں موجود ہیں۔ لیکن ؎

آدمی کہتے ہیں جن کو کم ہیں دُنیا میں وُہ لوگ
یوں تو سب اولادِ آدم سے یہ بستی ہے بھری (ظفرؔ)

اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ظاہرہ بناوٹ کے لحاظ سے توانسان انسان میں کوئی نمایاں فرق دکھائی نہیں دیتا۔ سب کے ہی دو ہاتھ اور دو پاؤں وغیرہ ہیں۔ سب کے ہی چہروں پر آنکھیں اور ناک لگے ہوتے ہیں۔ سب کا ہی سر اوپر اور پاؤں نیچے ہیں سب کے ہی کندھوں میں سے ہاتھوں کی شاخیں پھوٹ کر نکلی ہوئی ہیں۔ لیکن ؎

بظاہر سب مساوی ہیں مگر ہے فرق باطن میں
نہ ہر سینے میں حکمت ہے نہ ہر خُم میں فلاطوں ہے

بظاہر سب پتھر ایک سے ہوتے ہیں سختی کے لحاظ سے، سائینس کی رُو سے ان کی ماہیت میں ذرّہ بھر فرق نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی قدر وقیمت جُدا جُدا ہوتی ہے ایک پتھر سڑکوں پر کوٹے جاتے ہیں۔ ایک پتھر تاجِ شاہی میں شان سے مزّین ہو کر شہنشاہوں اور مہاراجوں کے سر پر جگہ پاتے ہیں۔ کیونکہ ؎

خوبئے جوہر سے پاتی ہے ہر اک شئے امتیاز
لعل بھی پتھر ہی ہے لیکن وہ پتھر اور ہے!

ہر ایک چیز کا اپنا اپنا وصف اور جوہر ہوتا ہے۔ اس وصف یا گُن کے رہنے سے وُہ چیز اپنی جنس میں شمار ہو سکتی ہے۔ جُونہی وُہ چیز اپنے اس ذاتی جوہر کو چھوڑ دیتی ہے اُسی وقت وُہ اپنے ہم جنسوں کی قطار سے باہر ہو جاتی ہے۔ ذاتی وصف کی مَوجُودگی ہی اس شئے کی زندگی ہے۔ مثلاً ویسے تو نرمی اور لطافت اعلےٰ وصف شمار ہوتے ہیں۔ اشیاءِ خُوردنی یعنی پھل پھُول، سبزی ترکاری اور پارچات پوشیدنی میں جس قدر لطافت اور نرمی ہو۔ اس قدر ہی وہ زیادہ مرغوب خاطر ہوتی ہیں اور زیادہ قیمت پاتی ہیں لیکن جب لکڑی اور لوہا درکار ہوتا ہے۔ تو یہ دونو اشیاء جس قدر سخت مل سکیں، حاصل کی جاتی ہیں ؎

جوہرِ ذات بھی لازم ہے ہر اک شئے کیلئے
موم سا نرم ہو یہ خوبئے فولاد نہیں!
(درند)

اسی طرح سے انسان میں انسانیت کا جوہر ہونا لازمی ہے۔ ورنہ وُہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ محض شکل انسانی ہونے سے یا پاکیزہ اور قیمتی لباس پہننے سے ہر ایک انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہوتا۔ صرف ظاہری بناوٹ اور سجاوٹ ہی انسان کہلانے کا معیار نہیں ہیں۔ حقیقت میں تو سجاوٹ اور اعلےٰ پوشاک بھی زیبِ تن کرنے کا اُسی کو حق ہے۔ کہ جس میں انسانیت کا وصف ہے۔ جو اس ذاتی خوبی سے محروم ہے۔ وُہ اعلےٰ پوشاک پہننے کا حقدار نہیں ہے ؎

آدمیت ہے تو ہے زیبا لباسِ فاخرہ
ورنہ اک خر ہے کہ ہے جس پر پڑا اطلس کا جھول

معدنیات یعنی سونا، چاندی، پلاٹینم وغیرہ پتھروں کے اندر سے نکلتی ہیں لیکن ہر ایک پتھر کے اندر وُہ موجود نہیں ہوتیں۔ جس مقام پر معدنیات کی کان ہو۔ اس مقام کی بڑی توقیر ہوتی ہے۔ اُس کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ وہاں پر حکومت کی طرف سے پہرہ قائم ہو جاتا ہے۔ بڑی احتیاط سے اس مقام کو کھودا جاتا ہے۔ اس مقام سے کھودے ہوئے پتھر کنکر کا ایک ایک ذرّہ بڑی ہوشیاری سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن جن پہاڑوں میں یہ قیمتی چیزیں نہیں پائی جاتیں۔ اُن کو بارود کے ذریعہ اُڑایا جاتا ہے۔ وہاں سے پتھر کاٹ کاٹ کر سڑکوں پر۔ اور ریل کی پٹڑی پر ڈالنے کے لئے مصالحہ تیار کیا جاتا ہے۔ قدر و منزلت اُسی مقام کی ہوتی ہے۔ جہاں پتھروں میں معدنیات موجود ہیں ؎

گرچہ سیم و زر ز سنگ آید ہمے
در ہمہ سنگے نباشد زر و سیم (سعدی رح)

ترجمہ:۔ اگرچہ سونا، چاندی پتھر کے اندر سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن ہر ایک پتھر میں تو سونا چاندی موجود نہیں ہوتے ۔

اسی طرح سے انسانی شکل والے تو خاکی پُتلے بہت ہیں۔ لیکن جن کے پاس آدمیت کا سیم وزر ہو۔ وُہ خال خال ہیں ؎

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی مُیسّر نہیں انساں ہونا (غالب)

انسان اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس میں کیا خاص خُوبی ہے، کون سا وصف ہے جس سے وُہ سب سے برتر گِنا جاتا ہے کھانا پینا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، اُٹھنا، بیٹھنا، پیدا ہونا، مرجانا وغیرہ تو حیوانوں میں بھی ویسے ہی ہیں۔ کہ جیسے انسانوں میں، بلکہ کئی صُورتوں میں حیوانات انسان سے فائق ہیں۔ یعنی وُہ اس سے زیادہ کھاتے پیتے ہیں۔ زیادہ طاقت سے چلتے پھرتے ہیں۔ زیادہ زور کے کام کاج کرتے ہیں۔ تو بایں ہمہ اُسے کیوں یہ شرف حاصل ہے۔ کہ اُسے احسن المخلوق کے نام سے پُکارا جاتا ہے۔ غور کرنے سے پتہ چلے گا۔ کہ اس کو سب پر فضیلت اور بزرگی دلانے کا وصف "انسانیت" ہے۔ اگر انسانیت اس میں سے نکال لی جائے تو انسان نہ صرف حیوانوں کے برابر ہو جائے گا۔ بلکہ ان سے بھی رذیل تر ؎

اگر ہو حقِ انسان سے غافل
کیا شک کہ بہائم ہیں اُس انساں سے بہتر

انسانیت سے بے بہرہ انسان حیوانوں سے بھی کہیں بدتر ہوتا ہے۔ کیونکہ حیوان تو بڑے کام کی چیز ہیں۔ وُہ دُنیا میں بہت مفید کام کرتے ہیں سینکڑوں طرح کی خدمت بجالاتے ہیں۔ لیکن جو انسانیت سے گرا ہُوا انسان ہے۔ وہ انسانوں کے قطار و شمار سے تو باہر ہی ہو چکا ہے لیکن وُہ حیوانوں کے کام بھی نہیں کرسکتا۔ کہ جس سے وُہ اُن کی ذیل میں ہی گِنا جاسکے۔ اس طرح سے وُہ حیوانوں سے بھی ادنےٰ تر ہے۔ پس اشرف المخلوقات یہ تبھی کہلا سکتا ہے۔ کہ اگر یہ انسانیت کے جوہر سے بہرہ ور

ہو۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ انسان وُہ درجہ پاتا ہے۔ جو کسی دُوسری ارضی وسماوی۔ نُوری و ناری مُخلوق کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ اِس کو اُس مقام میں باریابی ہوسکتی ہے۔ کہ جہاں دیگر خلائق کو پاس پھٹکنے تک کی مجال نہیں ؎

پر فرشتوں کے جہاں جلتے ہیں واں بُلوالیا
واہ! کیا رُتبہ دیا خالق نے آدم زاد کو (جرارؔ)

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ یہ جُملہ خلائق کا پیشرو ہے۔ خلیفہ ہے۔ رہبر ہے۔ اس کی خلافت مسلّمہ ہے۔ اس کی برتری سے کسی کو انکار نہیں کہ حقیقتاً خلافتِ الٰہی کے لئے اور کوئی اس کا دعویدار بھی نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی اپنے آپ کو مستحق ثابت کر سکتا ہے ؎

مکتب صُبحِ ازل کا ہے خلیفہ انساں
پھر کرے کون اگر یہ ہی خلافت نہ کرے

یہ بھی درست ہے۔ کہ اس خاکی پُتلے کو فرشتوں سے سجدہ کرایا گیا۔ دیوتا لوگ خواہش مند رہتے ہیں۔ کہ انہیں پیکرِ انسانی ملے۔ اِس مٹی کے پُتلے کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کرنے والا شیطان بنایا گیا۔ اور آج تک اس پر لعنت وپھٹکار پڑتی ہے۔ اور وُہ بدی کے لئے ضرب المثل بن گیا ہے۔ لیکن سوال ہوسکتا ہے۔ کہ ؎

ہو گئے جس سے ملائک مسجود بہ نہ خاک
نہیں معلوم کہ وہ چیز ہے انسان میں کیا (ظفرؔ)

وُہ چیز، وُہ خُوبی، وُہ جوہر، وُہ وصف، وُہ گُن کوئی مُعجزہ گری نہیں۔ کوئی جسمانی طاقت نہیں۔ کوئی جاہ وجلال، شوکت وصولت نہیں۔ کوئی رُعب اور دبدبہ نہیں بلکہ وُہ چیز وُہ ہے، کہ جو حضرتِ ذوقؔ ارشاد فرماتے ہیں۔ ع

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ

آدمیت اس کے اندر سے نکال دو۔ تو اس کی خلافت کا کوئی پُرساں نہیں اُس کی رہبری قبول کرنا تو درکنار، اس کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھنا گوارا نہ کرے گا۔ آدمیت سے بے بہرہ آدمی حیوان بصورتِ انسان ہوتا ہے ؎

آدمیت اگر شعارے نیست
جزبحیوانیت قرارے نیست

ترجمہ :۔ "اگر انسان کا شیوہ آدمیت نہیں ہے۔ تو اس کی گنتی حیوانوں کی ٹولی کے سوا کہیں نہیں کی جا سکتی"۔

پس اس سوال کا جواب کہ "انسان کون ہے؟" یہی ہے۔ کہ جس کے اندر انسانیت ہے۔ آدمیت ہے۔ بشریت ہے منشیتا ہے۔ منشیتا کے بغیر نہ یہ اشرف المخلوقات ہے۔ نہ فرشتوں اور دیوتاؤں کے لئے قابلِ رشک۔ بلکہ اس کا شمار انسانوں کے زمرہ میں ہی نہیں ہو سکتا ؎

جہاں میں رہ کے جن لوگوں میں رہتی کج ادائی ہے
وُہ اک کتے ہیں گرچہ شکل انسانوں کی پائی ہے (حشر)

جو انسان آدمیت کو تلانجلی دے بیٹھا ہے۔ اس کا تیاگ کر بیٹھا ہے۔ اس سے کسی قسم کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی۔ اس سے کوئی بھی توقع باندھنا بچپن ہوگا ؎

اے ظفرؔ اس سے محبت کی توقع مت رکھ
آدمیت کا جو رکھتا نہیں انسان طریق (ظفرؔ)

اس وصف کو چھوڑ کر، اس وصف سے بے بہرہ ہو کر خواہ کچھ بھی سج دھج انسان قائم کرے۔ کوئی بھی اسباب مہیا کرے۔ کیسی ہی زیبائش و آرائش بنائے وہ انسان نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ اس کا جوہرِ ذاتی ضائع ہو چکا ہے۔ باہر کی نمود اور سجاوٹ اس کو انسان بننے کا درجہ نہیں دِلا سکتی ؎

گردنِ خر میں جیسے طوقِ زر — اور ہو جلِ طلائی پُشت پر
چال میں بھی وہ تبختر گر کرے — اسپ تازی اسکو کہنے سے رہے
اسپ تازی ہو اگر دُبلا کمال — ضعف سے چلنا بھی ہو اسکو محال

ٹھوکریں گو ہر قدم پر کھائے گا
پر گدھا ہرگز نہ وہ کہلائے گا (عارف)

اِنساں؟

ایک قیدی دہر میں زنجیرِ آلام ہے — ایک ہستی ہے مگر مجبور رہنے ناکام ہے
موج ہے پانی کی لامحدود جولاں گاہ میں — ایک مشعل ہے مگر روشن ہوا کی راہ میں
پھول کی مانند پیدا ہے سرِ شاخِ حیات — ایک دھوکا ہے مگر یہ رنگ و بُو کی کائنات
بُلبلہ ہے بادِ کبر و ناز سے پھولا ہُوا — اک مسافر ہے وطن کا راستہ بھولا ہُوا
عشق کے جلووں کی اک پاکیزہ ترکیب ہے یہ — آسماں بھی جسکے آگے خم ہے وہ ہستی ہے یہ
خواہشوں کی ایک کل ہے آجکل کے ہاتھ میں — ایک مٹی کا کھلونا ہے اجل کے ہاتھ میں

ہے الگ دنیا سے اور اس بزم میں داخل بھی ہے
موج ہے آزاد بھی پابستۂ ساحل بھی ہے

انسانیت کیا ہے؟

دردِ دل پاسِ وفا جذبۂ ایماں ہونا
آدمیت ہے یہی اور یہی انساں ہونا

یہ عرض ہو چکا ہے۔ کہ انسان کہلانے کا حقدار اور آدمیوں کے شمار و قطار میں جگہ پانے والا وُہی انسان ہو سکتا ہے۔ جو انسانیت کا جوہر اپنے اندر رکھتا ہے اب یہ دیکھنا ہے۔ کہ انسانیت کس چیز کا نام ہے۔ کہ جس کے ہونے سے انسان فرشتوں سے بھی بڑھ کر اپنے مالک کی نظروں میں قابلِ قدر ہو جاتا ہے۔ دیوتاؤں کے لئے قابلِ رشک بن جاتا ہے۔ اور جس کے نہ ہونے سے حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب سُورگباشی چکبست کے اس شعر میں بڑی خُوبی سے دیا گیا ہے۔ جو اس مضمون کا طرازِ عنوان ہے۔ حضرت اکبر مرحوم کیا خُوب فرما گئے ہیں۔ ؎

ہے انس مادّہ اس کا محبّت اس کا خمیر
یہی سبب ہے جو انسان نام اسکا ہُوا (اکبر)

بس یہی انسانیت کی کسوٹی ہے۔ یہی معیار ہے۔ یہی پیمانہ ہے۔ یہی تول ہے۔ یہی ماپ ہے۔ جو انسان جس حد تک انس کے جوہر سے بہرہ ور ہے۔ اُتنا ہی وُہ انسانیت کے نزدیک تر ہے۔ اور جس قدر اِس جذبہ کی اُس میں کمی ہے۔ اُتنا ہی وُہ انسانیت سے دُور ہے۔

انسانیت کا یہی جوہر ہے۔ اور اسی سے انسان انسان کہلانے کا مستحق ہے ہر ایک چیز اپنے ذاتی وصف کے باعث ہی اپنا مخصوص نام پاتی ہے آگ اُسی

وقت تک آگ ہے۔ کہ جب تک اس میں سوزش اور تپش موجود ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ خاکستر ہے۔ جسے چیونٹیاں بھی روند ڈالتی ہیں۔ پھول رنگ و بو کا ایک خاص وضع کی خوشنما پتیوں میں نمو و ظہور کی کیفیتیں دکھانے کا نام ہے۔ یہ نہ ہو تو کاغذی صنعت گری ہے۔ یا کھاد کی پتیاں ہیں ؎

حسنِ صورت محض بے رونق ہے سیرت کے بدوں
جن گلوں میں بو نہیں وہ خوش نما کہنے کو ہیں

اگر جوہرِ ذاتی کی موجودگی موصوف کے لئے لازمی نہ ہو۔ تو دنیا میں قدر و منزلت کے درجے اُڑ جائیں۔ گھوڑا، گدھا برابر ہو جائیں ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا والا معاملہ ہو جائے۔ اگر ہر ایک چمکنے والی چیز سونا ہو۔ تو سونا ایسی گراں بہا چیز نہ رہے۔ اور اُسے لوگ سنبھال کر لوہے کی مضبوط الماریوں میں تالوں کے اندر محفوظ نہ کریں۔ وہ پتھر جس کے چھونے سے لوہا سونا بن جاتا ہے ایک خاص قسم کا پتھر ہے۔ ہر ایک پتھر ایسا نہیں بن سکتا۔ اس پتھر کی خاصیتیں عام پتھروں سے بالکل علیحدہ ہیں جن کی وجہ سے وہ کمیاب ہی نہیں۔ بلکہ نایاب ہے۔ ہر ایک پتھر پارس بننے کا ادعا کرے۔ تو نیک و بد کی تمیز دنیا سے اُٹھ جائے ؎

باقی رہے تمیز نہ پھر خوب و زشت میں
پارس کے ہوں خواص جو ہر سنگ و خشت میں

ایسے ہی ہر ایک انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ پارس انسان وہی ہے۔ کہ جو اُنس سے، محبت کے اور پریم کے وصف سے بہرہ ور ہے۔ ورنہ وہ سنگِ لغزش ہے۔ کہ ہر راہرو اس سے ٹھوکریں کھائے۔ وہ راستہ سے دور پھینک دئے جانے والا پتھر ہے۔ کہ جس کی موجودگی کسی کو نہیں بھاتی۔ گویا یہ سب کے لئے باعثِ زحمت ہے۔

دُنیا میں انسان اپنے آپ کو قابلِ قدر بنانے کے لئے کئی کوششیں کرتا ہے کہیں وُہ بڑے بڑے مکانات بناتا ہے۔ کہیں باغ لگواتا ہے کہیں موٹر گاڑیاں خریدتا ہے۔ کہیں اچھے اچھے لباس حاصل کرتا ہے۔ کہیں مال، وزر اکٹھا کرتا ہے۔ کہیں اولاد کا خواہشمند ہوتا ہے لیکن کیا یہ سب چیزیں اُس کو بطور انسان کے قابلِ قدر بنا دینگی۔ ہرگز نہیں "انسان کو دُنیا کے تجملات موہ لیتے ہیں۔ بیوی بچوں کی محبت گرویدہ کر لیتی ہے۔ مال ومنال کی خواہشیں دل ودماغ پر قابو پالیتی ہیں لیکن سوچیئے کہ کیا یہی مقصدِ حیات ہے؟ اور انہی اُلجھنوں کا نام نیکی ہے؟ خُدا کے ساتھ رشتہ قائم کرنے کا یہی ذریعہ ہے"[1]۔ بے شک یہ چیزیں دُنیاوی کاروبار چلانے کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کو ہی انسانی زندگی کا مقصود سمجھ لینا غلطی ہے ؎

مانا ہوسِ زر ہے بشر کے لئے عادت
لیکن نہیں دُنیا میں فقط ایک یہی نعمت
کچھ اور بھی جوہر ہیں عطا کردہ قُدرت
غمخواری ودلجوئی وہمدردی واُلفت (چکبست)

یہ ہیں انسانی محل کی سیڑھیاں کہ جن کے ذریعے انسان اُوپر چڑھ سکتا ہے۔ اُونچے اُٹھ سکتا ہے۔ جو انسان محض دنیاوی جاہ وحشمت کو حاصل کر لینا ہی اعلےٰ انسان بننے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وُہ دھوکے میں ہے حقیقی وصف انسانی تو یہی ہے۔ کہ جب وُہ اپنے بھائی کو تکلیف میں دیکھے۔ تو موم کی طرح اس کا دل پگھل جائے اُس کا غم اپنا غم معلوم ہو۔ لیکن یہ محض احساس ہی نہ رہے۔ بلکہ پھر اُس بھائی کی دلجوئی ہو۔ اُس سے ہمدردی ہو۔ اور اُس کے بعد چارہ گری کی جائے۔ اور اس کی تکلیف کو رفع کیا جاوے ؎

مکرم جنس ہے یاں دستگیری نیم جانوں کی
خرید اکرملیں جتنی دعائیں ناتوانوں کی

[1] مفہوم آیاتِ قرآنی سورۃ آلِ عمران رکوع ۲ آیت ۵

انسانیت اسی کا نام ہے۔ کہ انسان کے اندر وُہ دل ہو کہ جو بنی نوع انسان کا درد محسوس کرے۔ نہ صرف انسان کی بلکہ ہر ذی رُوح کی تکلیف اُس کو اپنی تکلیف محسوس ہو۔

حکایت:۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ ایشور بھگت حضرت ابوبکر شبلیؒ جن کا دِل ہمدردی و غمخواری سے لبریز تھا۔ اپنے مالک کی یاد میں مگن ہر ایک چیز پر محبّت کی نگاہ ڈالتے ہوئے خوش خوش ایک بازار میں جا رہے تھے۔ کہ ایک موقعہ پر کسی دکاندار نے ایک گائے کو جو کہ اُس کی دکان کے سامنے پڑے ہوئے غلّہ کو کھانے لگی تھی۔ بڑی بے دردی سے، ایک لاٹھی ماری۔ گائے کی پیٹھ اس کی چوٹ سے جُھک گئی۔ اَور وہاں سے دوڑ گئی۔ حضرت شبلیؒ کہ جو انسانیت کے حقیقی جوہر سے بہرہ ور اَور پربھو بھگت تھے۔ اُس وقت اُس دکان کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ جُونہی اُس لاٹھی کی چوٹ اُس بے زبان گائے کی پیٹھ پر پڑی اَور گائے درد کے مارے نیچے جُھکی عین اُسی وقت اُس خدا دوست سچّے انسان کی پیٹھ بھی جُھک گئی۔ اَور چیخ نکل گئی۔ وُہ بڑے زور سے کراہنے لگے۔ لوگ حیران ہوئے۔ کہ کسی نے اس شخص کو کچھ کہا نہیں چھیڑا نہیں۔ پھر کیا گیا۔ اِدھر اُدھر سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ پوچھا بھائی تم کو کیا ہو گیا کہ یک لخت چیخنا چلاّنا شروع کر دیا ہے۔ لوگ پوچھتے تھے۔ لیکن وُہ ہمدردی و اُلفت کا پتلا درد کے مارے زبان نہ کھول سکتا تھا۔ آخر کہنے لگا۔ کہ اُس بھائی نے لاٹھی ماری ہے۔ وُہ دکاندار اور دیگر دیکھنے والے لوگ حیران ہو کر کہنے لگے۔ کہ اُس نے تو تم کو ہر گز نہیں مارا۔ یہ سُن کر انسانی زندگی کا حقیقی مقصد سمجھنے والے بزرگ نے اپنے جسم پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ تو دیکھا گیا۔ کہ جسم کے جس حصہ پر گائے کو لاٹھی کی ضرب لگی تھی۔ عین اُسی جگہ پر ضرب کا ویسا ہی نشان اُس کے جسم پر موجود تھا۔ اِس کا نام ہے انسان ہونا اَور اِس کا نام ہے انسانیت سے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے (امیرؔ)

جس انسان کے دل میں اُلفت وہمدردی کا جذبہ نہیں۔ وہ آدمیت سے بے بہرہ ہے۔ وُہ دل پھینک دینے کے قابل ہے۔ کہ جس میں دُوسروں کا درد نہیں کیونکہ وُہ دل دِل ہی نہیں بلکہ پتھر ہے ؎

وہ آدمی ہی کیا ہے جو درد آشنا نہ ہو
پتھر سے کم ہے دل میں شرر گر نہاں نہیں (ذکیؔ)

انسان کی شرافت، انسان کی انسانیت، انسان کی بزرگی، انسان کی قدرو منزلت اسی میں ہے۔ کہ وہ دُوسروں کے لئے درد رکھتا ہو۔ اُن سے نیکی کرے نیکی سے دن گذارے ہروقت بھلائی کرنے کا خیال دل میں رکھّے۔ نیکی اور بھلائی کے خیالات اور جذبات ہروقت اُس کے دل میں موجزن رہیں۔ ایسا کرنے سے اُس کی زندگی بڑے امن کی ہوگی۔ اور اسے ہر طرح کا آرام نصیب ہوگا ؎

یہی ہے اک دلیلِ شرافتِ انساں اُمیدِ خیر پہ مبنی ہو عادتِ انساں
گذارے عُمرِ دوروزہ وُہ نیک نامی سے
یہی ہے باعثِ آرام وراحتِ انساں (ذہینؔ)

اَے آرام کے متلاشیو! آرام کی تلاش میں کہاں بھٹک رہے ہو۔ کدھر کدھر سرگرداں ہو۔ کیا کیا پاپڑ بیل رہے ہو۔ کیا کیا نسخے برتتے ہو۔ کیسی کیسی مصیبتیں اور اذیتیں اُٹھاتے ہو۔ کہ کہیں آرام نصیب ہوجائے۔ سمجھو اس راز کو۔ برتو اس نسخے کو اور دیکھو کہ کس طرح سے آرام وراحت خود بخود دوڑے چلے آتے ہیں۔ جو انسان نیکی اور مُحبّت کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھتا۔ اور بدی کی طرف مائل رہتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ انسان نہیں کہلا سکتا۔ بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے ؎

نہ ہر آدمی زادہ از دَد بہ است
کہ دَد ز آدمی زادہ بد بہ است　　　(سعدیؒ)

ترجمہ:- ہر ایک آدمی حیوان سے بہتر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک بد انسان سے چوپایہ بہتر ہوتا ہے۔

حقیقت یہی ہے۔ کہ جس انسان کے اندر اُلفت و نیکی کا جذبہ موجود نہیں۔ وُہ ویسا ہی انسان ہے۔ کہ جیسے ایک دیوار پر انسان کی تصویر۔ اس سے بڑھ کر اس کا رتبہ نہیں۔ اگر دیوار پر کھینچی ہوئی تصویر کو ہم انسان کا نام دے سکتے ہیں۔ تو اُلفت سے بے بہرہ آدمی کو بھی انسان کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ نہیں ؎

چو انساں را نباشد فضل و احساں
چہ فرق از آدمی تا نقشِ دیوار　　　(سعدیؒ)

ترجمہ:- اگر انسان کے اندر مہربانی اور احسان یعنی محبّت اور ... اوصاف موجود نہیں ہیں۔ تو ایسے انسان اور دیوار پر کھچی ہُوئی ایک تصویرِ انسانی میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جیسے وُہ تصویر نکمّی، بے کار اور عضوِ معطّل کی طرح ہے۔ ویسے ہی اُس انسان کی ہستی ہے۔

جو حقیقت بین انسان ہیں۔ وُہ آدمیت کا اندازہ اور کسی پیمانے سے نہیں لگاتے بلکہ ؎

عزّت اُسی کی اہلِ نظر کی نظر میں ہے
سب کچھ بشر میں ہے جو محبت بشر میں ہے　　　(دبیر)

کبیر صاحب نے بھی اسی ترازو سے انسانیت کی کھیپ کو تولا ہے۔ وُہ فرماتے ہیں ؎

جا گھٹ پریم نہ سنچرے سو گھٹ جانو مَسان
جیسے کھال لوہار کی سانس لیت بن پران (کبیر صاحب)

ترجمہ: جس انسان میں محبت کا مادہ نہیں۔ اُسے ایک (زندہ) مسان (قبرستان) سمجھو۔ گویا لوہار کی دھونکنی ہے جو بے جان ہونے کے باوجود سانس لے رہی ہے؛ اسی طرح سے اُلفت و مُحبت سے بے بہرہ انسان سانس تو لیتا ہے۔ یعنی اُس کے اندر ظاہرہ زندگی تو ہے۔ لیکن وُہ حقیقی زندگی سے جو کہ پریم ہے۔ محروم ہے۔

انسان کی عظمت کو جانچنے کے لئے مختلف طبائع کے مختلف معیار رہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں مال و دولت بڑائی کا پیمانہ ہیں۔ بعض لوگ اچھے رُتبے کو بڑائی کی علامت جانتے ہیں۔ بعض کی نگاہ میں جسمانی خوبصورتی اور اچھی صحت بڑائی کے نشانات ہیں۔ لیکن حقیقت بین انسانوں کی نظر میں بڑائی کی کسوٹی اَور ہی کچھ ہے ۔

بُزرگی بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

ایک اَور شاعر نے اس کسوٹی کو اَور بھی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اَور وُہ بھی قابلِ مُلاحظہ ہے ۔

اگر ہے ترے دل میں یہ مدّعا کہ عالم میں رُتبہ ہو تیرا بڑا
کیا کر تواضع یہی ہے بھلا ہر ایک اہلِ معنی نے یُوں ہے کیا
بڑی یُوں تو دولت کی ہُ ب خُوبیاں ولے ہے تواضع کی وُہ عزّ و شاں
کہ یاں نام اَور سیرِ فردوس واں کہا ہے بزرگوں نے اَے مہرباں
تواضع اگر ہوگا تیرا شعار
بڑھے گا نزا سب میں عزّ و وقار (نظیر)

کبیر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر بزرگی حاصل کرنے یا بڑا ہونے کے اوصاف پوچھنا چاہتے ہو۔ تو یہ ہیں۔ کہ اوّل انسان کے اندر فروتنی اور انکساری ہو۔ دوسرے عبادت اور تیسرے ہر ایک سے مُحبّت اور پریم۔ حقیقت میں وہی بڑے انسان ہیں کہ جن کے اندر خوش اخلاقی کا بڑا وصف ہے۔ اہنوں نے لکھا ہے ؎

دین گریبی بندگی سب سے آدر بھاؤ
کہے کبیر تینیٔ بڑا جہاں میں بڑا سوبھاؤ

بعض بھائی انکساری اور فروتنی کو کمزوری اور بے بسی کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر ہی کام چلتا ہے۔ لیکن وُہ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ بے شک آگ اپنا خاص درجہ رکھتی ہے۔ لیکن جب وُہ انکساری اختیار کر کے راکھ بن جاتی ہے۔ تبھی ماتھے پر چڑھائی جاتی ہے۔ اور سادھو سنتوں کے زیبِ تن ہوتی ہے۔ پس جو انسان حقیقتاً عظمت و بزرگی حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ اُن کے لئے ان ہی اوصاف کا اختیار کرنا ازبس لازمی ہے۔ اس کے علاوہ اور طرح سے بڑا بننا اہلِ نظر کی نگاہ میں کچھ معنی یا حقیقت نہیں رکھتا۔ دولتِ دُنیا یا خودی اور غرور سے بڑا بننے کی کوشش کرنا چھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح سے بڑا بننے والوں کی حقیقت کو حقیقت شناس بھگت کبیر نے خوب واضح کیا ہے ؎

بڑا ہوا تو کیا ہوا جیسے پیڑ کھجور
پنتھی کو چھایا نہیں پھل لاگے اتی دُور (کبیر)

وُہ فرماتے ہیں۔ کہ مندرجہ بالا اوصاف کے علاوہ اگر کوئی انسان اور طریق سے بڑا بننا چاہے تو بے معنی ہے۔ کیونکہ اُس کی مثال کھجور کے پیڑ کی سی ہوتی ہے۔ جو کہ نہ تو تھکے ماندے مسافر کے لئے سایہ مہیّا کرتا ہے۔ اور نہ ہی اُس کے

پھل نزدیک ہوتے ہیں۔ کہ جن سے ایک بھوکا انسان فوراً اپنی بھوک رفع کر سکے۔

اے بڑائی کے خواہشمند انسانو! ذرا سوچو کہ آپ کہیں غلط طریقوں سے تو بڑائی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ اگر آپ نے جاہ و حشمت اور زر و دولت اس دنیا میں حاصل کر لئے۔ تو مت سمجھو کہ حقیقی بڑائی حاصل ہو گئی۔ اگر واقعی طور پر بڑائی کے خواہاں ہو۔ تو اُن سے ہمدردی کرو۔ کہ جن کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ اُن کی تواضع کرو۔ جن کو ان کی بےکسی اور بےبسی کی وجہ سے کوئی پاس تک نہیں کھڑا ہونے دیتا۔ ہزاروں یتیم بچے۔ ہزاروں بیوہ عورتیں۔ ہزاروں اپاہج لولے، لنگڑے، اندھے انسان اس دنیا میں لاکھوں مصیبتوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ہزاروں شرفا تنگ دستی کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ اور فاقو پر فاقے کر رہے ہیں۔ اُن کی مدد کرنا اُن کا درد بٹانا سچے انسانوں کا اصلی فرض ہے حقیقی بڑائی ایسے انسانوں کی خدمت میں ہے۔ اور ایسے انسانوں کے درد کی دوا بننے میں ہے ؎

تجھکو اس میلے میں گر پُر نفع سودا چاہیئے
شوقِ استرضائے خلاقِ توانا چاہیئے
اندمالِ زخمِ ناکامانِ بےکس کے لئے
مرہمِ کافورِ ہمدردی کا پھایا چاہیئے (احقرؔ)

ان بےکس خدا کے بندوں کے کام آنا اور اُن سے عملی ہمدردی کرنے کا نام ہی انسانیت ہے۔

بعض انسان بہت پڑھ لکھ جانے کو ہی بڑائی سمجھتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں تحصیلِ علم بڑا ہونے کا ذریعہ ہے۔ تعلیمی درسگاہوں کی ڈگریاں حاصل کر لینا ہی بڑائی کا رتبہ حاصل کرنے کے مترادف ہے۔ اور بڑی بڑی کتابوں پر عبور کر لینا زندگی کا معیار ہے۔ یہ بھی غلط ہے ع

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے

حضرت محمدؐ صاحب بالکل اُمی تھے۔ ایک لفظ بھی کسی اُستاد سے نہیں پڑھا تھا لیکن انسانیت کے وصف سے بہرہ ور تھے۔ آج دُنیا کا ایک بڑا حصہ اُن کا پیرو ہے۔ اُن کا نام زبان پر آتے ہی بے شمار گردنیں فرطِ احترام سے جُھک جاتی ہیں۔ پرم ہنس رام کرشن کہ جن کو بنگال کے اندر بعض لوگ اوتار تک سمجھنے لگ گئے ہیں۔ کتابی علم سے بالکل ناآشنا تھے۔ لیکن ان کو انسانیت کے علم سے پوری پوری آگاہی تھی۔ اُن کی کی ہُوئی نصیحتیں سُن کر ہی لوگ وجد میں آجاتے ہیں۔ اور اُن کے نام اور کلام کی پرستش ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہے۔ کہ کتابی علم کی تحصیل بھی انسانیت کی حقیقی کسوٹی نہیں ہے۔ بعض زاہدِ خشک سال رُوکھی سُوکھی عبادت کو ہی انسانی فضیلت شمار کرتے ہیں۔ یہ پیمانہ بھی غلط ہے۔ جس مالکِ کل کی عبادت کی جاتی ہے وُہ تو قادرِ مطلق ہے۔ قائم بالذات اور دائم الصفات ہے۔ سب سے بڑا ہے۔ سب سے افضل ہے۔ اس کی بڑائی یا اس کے اوصاف کا شمار کرنا یا ان کا اندازہ لگانا طاقتِ انسانی سے باہر ہے۔ پھر ایک یا ہزاروں انسانوں کا اس کی بڑائی کرنا یا اُس کی حمد و ثنا کے گیت گانا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے ہم اس کی شان میں کوئی ایزادی نہیں کر سکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ عبادت ضروری چیز نہیں۔ عبادت تو انسان کا فرضِ اولین ہے۔ لیکن خشک عبادت عبث ہے۔ مثلاً ایک آدمی بیٹھا ہُوا سندھیا یا نماز میں مشغول ہے۔ ابھی کچھ سندھیا یا نماز باقی ہے۔ کہ سامنے سے ایک پیاسا پیاس سے بیکل ہو کر گر پڑتا ہے۔ اس وقت اگر یہی خیال رہے۔ کہ باقی کے منتر یا رکوع ختم ہوں۔ تب اس پیاسے کی طرف رجوع کیا جائے۔ تو یہ ایک رُوکھی عبادت ہے۔ یہ عبادت وُہ گنا ہے۔ جس میں رس نہیں۔ یہ وُہ پھول ہے جس میں خوشبو نہیں۔ یہ وہ آنکھ ہے۔ جس میں نور نہیں یہ وُہ

چراغ ہے جس میں تیل نہیں یہ تو وہ چشمہ ہے جس میں پانی نہیں۔
اُس پروردگار کی توصیف کرنے کے لئے انسان کے علاوہ اَور بہتیری ہستیاں ہیں۔ کہ جن کا دن رات کا کام ہی یہی ہے۔ انسان تو بھلا اپنے دنیاوی مشاغل کی وجہ سے بہت تھوڑا وقت اس کام کے لئے نکالتا ہے۔ لیکن اُن ہستیوں کو تو اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ لامحالہ یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ انسان کی پیدائش سے خالقِ کائنات کا کچھ اَور ہی منشا ہے ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں (دردؔ)

یہ دردِ دل، یہ ہمدردی، یہ غم خواری، یہ تلطف، یہ پریم کا ہی جذبہ ہے۔ کہ جس کے لئے انسان کو پیکرِ انسانی عطا ہُوا ہے۔ یہی نیک اخلاق اور یہی اوصاف حسنہ ہیں۔ کہ جن کے اظہار کے لئے اور جن کے مطابق حیات کے قیمتی دن گذارنے کے لئے انسان کو اس دُنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اگر یہ جوہر انسان نے نہیں پایا۔ تو وُہ انسانوں کی قطار میں نہیں گنا جا سکتا ؎

آدمیت کو ہی تم جوہرِ انسان سمجھو جس میں اخلاق نہیں ہیں اُسے حیواں سمجھو

الغرض مال و جمال اَور علم و زہد ہر چند لازمۂ انسانیت ہیں۔ مگر انسانیت کی تکمیل کے لئے جملہ مخلوق کے ساتھ محبّت و ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس بارے میں کہا ہے ؎

اَے دل تو ازیں علم کہ چہ خواہی دانست وز زہد کہ اسرارِ الٰہی دانست
کس نیست الٰہی کہ ز علم و ز عمل
ماہیتِ ذاتِ تو کماہی دانست (حمدؔ)

———×———

انسانیت کا جوہر کیا ہے؟

شاید اسی کا نام محبّت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

عشق، پریم اور مُحبّت مترادف یا ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان کی ماہیت کو یا اُن کے معنی کو سمجھانا آسان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کیفیت طاقتِ بیان سے باہر ہے۔ یہ تو صرف وجدان واحساس کی بات ہے۔ پھر میرے جیسا آدمی اس اہم مسئلہ کی نسبت کیا کہہ سکے۔ وُہ پریم کی باتیں کیا جانے۔ کہ جس نے اس کوچہ میں کبھی قدم ہی نہ رکھا ہو۔ پریم کے بازار میں سے کبھی ہو کر بھی نہ گذرا ہو۔ پریم کی راہ دشوار گذار ہے۔ پریم کا مقام بہت اونچا ہے۔ کبیر صاحب نے کہا ہے ؎

یہ تو گھر ہے پریم کا خالہ کا گھر نا ہنہ
سیس اُتارے بھوُئیں دھرے تب بیٹھے گھر ماہنہ

ہر ایک انسان پریم کا گاہک نہیں ہوسکتا۔ نہ ہر ایک آدمی پریم کی کہانی سُنا سکتا ہے۔ نہ ہی عشق یا پریم کی تعریف کرسکتا ہے جن لوگوں نے اس کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے یقینی طور پر کچھ بیان نہیں کیا ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

دیکھئے اوّل تو لفظ شاید کا استعمال ہُوا ہے۔ پھر کہا ہے کہ آگ سی لگی ہوئی ہے۔ یعنی حقیقتاً آگ نہیں ہے۔ کوئی جلن ہے۔ جو آگ کی سی ہے۔ کہہ نہیں سکتے کہ

وُہ کیا بلا ہے۔ پریم ایسی چیز نہیں۔ کہ جو ہر جگہ ملتی ہے۔ اور نہ ہی یہ اتنی سستی ہے۔ کہ ہر کوئی اس کا خریدار بن سکے کبیر صاحب فرماتے ہیں ؎

پریم نہ باڑی اُوپجے، پریم نہ ہاٹ بکائے
راجا پرجا جیہہ رُچے، سیس دیہہ لیجائے (کبیر)

ترجمہ:۔ پریم کھیت کے اندر نہیں اُگتا۔ نہ کسی دکان پر فروخت ہوتا ہے۔ امیر و غریب جو بھی اس کا خریدار ہو سر دے کر لے سکتا ہے۔

اسی بات کو ایک اُردو شاعر نے یُوں لکھا ہے ؎

سطرِ منصُور کے لہُو سے ہوئی یہ تحریر
یعنی سرداؔر[1] نہیں وُہ جو سرِ داؔر[2] نہیں (انشاد)

حضرتِ سوداؔ فرماتے ہیں ؎

سوداؔ خمارِ عشق میں خسرو سا کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو چکا
کس مُنہ سے اپنے آپکو کہتا ہے عشق باز
او رُوسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا! (سوداؔ)

ایسی صُورت میں مجھ ایسے ڈرپوک انسان کے لئے پریم کی کتھا سُنانا ناممکن ہے۔ لیکن ہاں دل میں ولولے ضرور اُٹھتے ہیں۔ حالاتِ حاضرہ میں پریم کی مٹی پلید ہوتے دیکھکر رگِ حمیت ضرور پھڑکتی رہتی ہے۔ دل کا جوش کم کرنے کے لئے کچھ کوشش کروں گا۔ جو کچھ بزرگوں اور مہاتماؤں سے سُنا ہے۔ یا جو کچھ مذہبی اور اخلاقی کتابوں میں پڑھا ہے۔ اُس کی بنا پر اس موضوع پر کچھ نہ کچھ پیش نظر کرونگا۔

پریم کے اصل معنی اگر دریافت کرنے ہوں۔ یا اس کی ٹھیک ٹھیک تعریف سُننی ہو۔ تو وُہ تو کوئی پریمی یا عاشق ہی بتا سکتا ہے۔ بشرطیکہ سچا پریمی ہو۔

آنکھوں سے مخربِ اخلاق نظارے دیکھنے والے۔ گناہ آلود کام کرنے والے۔ اور

---

[1] لیڈر [2] سرکو قربان کرنے والا

نظر بد رکھنے والے اور اخلاق کی جڑ پر کلہاڑی چلانے والے آج کل کے نوجوان یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ وُہ بھی پریم کے بازار کے گاہک ہیں۔ یہ تو سب دُودھ پینے والے مجنُوں ہیں۔ ایک دفعہ لیلےٰ نے ڈھنڈورہ پٹوایا۔ کہ وُہ مجنوں کو دُودھ پلانا چاہتی ہے۔ مجنُوں جہاں ہو آجائے۔ وقت مقررہ پر لیلےٰ کو بتایا گیا کہ باہر تو آدمیوں کا تانتا لگ گیا ہے۔ اور سبھی اپنے آپ کو مجنوں بیان کرتے ہیں۔ لیلےٰ مسکرائی اور پُوچھا کہ اُن کا حُلیہ کیسا ہے۔ تو وہ کہنے لگے۔ بڑے موٹے تازے خوش رُو نوجوان ہیں سب پیالے کر دُودھ پینے کو آئے ہیں۔ لیلےٰ نے کہا میرا مجنُوں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے مجنُوں کا حُلیہ تو یہ ہونا چاہئے۔ ع

چشمِ تر، ضعفِ بدن، زردیٔ رنگ، خشکیٔ لب

پھر لیلےٰ نے کہا۔ کہ اچھا آزمائش کئے لیتے ہیں۔ یہ لے جاؤ چھُری اور پیالہ اور کہو کہ دُودھ پلانے سے پیشتر لیلےٰ مجنُوں سے خُون مانگتی ہے۔ جب ان نقلی مجنُوؤں سے کہا گیا۔ تو ایک ایک کر کے یہ کہتے ہوئے کھسک گئے۔ کہ "حضرت ہم دُودھ پینے والے مجنوں ہیں۔ خُون دینے والا تو کوئی اور ہوگا"۔ اور دم کی دم میں میدانِ عشق خالی ہوگیا۔ آخر اُنہوں نے اصل مجنوں کو بھی ایک درخت کے نیچے اپنے حال سے بے خبر کھڑا دیکھا۔ ؎

نرالی صورتیں ہیں بادہ نوشانِ محبّت کی
کبھی ہوشیار رہتے ہیں کبھی مدہوش رہتے ہیں

اس سے جب خُون مانگا۔ تو اُس نے اپنے جسم میں جگہ جگہ پر چھُری چلائی لیکن کہیں سے خُون کا قطرہ بھی نہ نکلا۔ ٹھیک تو ہے۔ عاشقی اور خُون کی موجودگی متضاد باتیں ہیں ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا حال ہوا خُونِ جگر ہونے تک

آج کل کے نوجوان، پہلے اس راز کو سمجھ لیں۔ اُن کا جھوٹا اور مخربِ اخلاق

عشق تو نفس پرستی ہے۔ اس کی کیفیت کیا ہے ؎

اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
ہر بوالہوس کا حُسن پرستی شعار ہے

اُن کو خبردار ہونا چاہیئے۔ اس نفس پرستی کے نتیجے بُرے ہوتے ہیں۔ یہ نفس پرستی ذِلت و خواری کا باعث بنتی ہے۔ اور اس کا ماحصل بربادی اور تباہی کُلّی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

عشقِ حقیقی یا سچے پریم کی کتھا سننی ہو۔ تو منصُور سے پوچھو۔ کہ جو انا الحق کہتا ہُوا قُربان ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسےؑ سے پُوچھو۔ کہ جو اپنے پریتم کی دُھن میں چورا ہے میں دار پر لٹک جاتے ہیں۔ میراں بائی سے پوچھو۔ کہ جو زہر کا پیالہ غٹ غٹ پی جاتی ہے۔ گوروارجن دیو سے پُوچھو جنہوں نے گرم توں، گرم ریت اور دیگر کئی قسم کی اذیتوں کو سہ کر بھی پریم کی رٹ کو نہ چھوڑا۔ یا حضرت محمدؐ سے پُوچھو۔ کہ جن کو ہر قسم کے لالچ اور دُکھ دئے گئے لیکن اپنے اُصول سے ٹس سے مس نہ کی۔ سوامی دیا نند سے پُوچھو۔ کہ جن پر پتھر پھینکے گئے اور جن کو زہر پلایا گیا لیکن وُہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ بھگت نیلتا نند کو پُوچھو۔ کہ جنہیں پریم کا پرچار کرنے پر سر میں ٹوٹے ہُوئے ٹھیکرے مارے گئے۔ خُون بہ رہا تھا۔ اور وہ کہتے تھے یہ پریم کا پہلا زینہ ہے۔ میرا مارنیوالا پریمی ابھی ابھی اگلے زینہ پر چڑھ جائیگا۔ اور ایسا ہی ہُوا وُہ پاؤں پر آگرا ؎

آہ کیا سہل گذر جاتے ہیں جی سے عاشق
ڈھب کوئی سیکھ لے ان لوگوں سے مرجانے کا (میر)

اس راہ میں جان دینے کی چاشنی کچھ عجیب ہوتی ہے۔ اس کا لطف کچھ انوکھا ہوتا ہے۔ اس کی چاٹ بڑی عجیب ہوتی ہے۔ اسکا مزا کچھ نرالا ہوتا ہے ؎

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

ایسے سچے پریم کے پریمیوں کو پریم کے سوا دُوسری کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔ پریم ہی اُن کا ملجا و ماوا ہوتا ہے۔ پریم ہی اُن کا گھر بار اَور مال و دولت ہے حتیٰ کہ پریم ہی اُن کا دھرم ایمان ہوتا ہے ؎

میری ملّت ہے محبّت میرا مذہب عشق ہے
خواہ ہوں مَیں کافروں میں خواہ دینداروں میں ہوں (ظفرؔ)

ان کی پرستش گاہ بھی پریم ہی ہوتی ہے۔ وُہ ان اینٹ پتھّر کی عبادتگاہوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ ان عبادت گاہوں میں اُنہیں حقیقی پریمی دکھائی نہ دینے کی وجہ سے ٹھیرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ پریم کی نگری اور مُحبّت کی بستی میں بسنا چاہتے ہیں ؎

چل عشق کہیں لے چل یہ دَیر و حرم چُھوٹیں
ان دونو مکانوں میں جھگڑا نظر آتا ہے (بیدلؔ)

ایک فارسی شاعر یُوں گویا ہے ؎

منزلِ عشق‌ش مکانے دیگر است
ایں زمیں را آسمانے دیگر است

ترجمہ:۔ اُس کے پریم کی منزل کا مقام دُوسرا ہے۔ اس زمین کا آسمان ہی اَور ہے ؛

سائیں بُلھے شاہ کی طرح اِن کا خیال ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ؎

دھرم سال وچ دھاڑوی رہندے ٹھاکر دوارے ٹھگ
مسیتاں وچ کُستّی رہندے بُلھا عاشق رہن الگ

یعنی گُوردواروں میں محض لیٹرے رہتے ہیں۔ اور مندروں کے پُجاری ٹھگ ہیں۔ مسجدوں کے مُلّا جھوٹے ہیں لیکن جو سچے ایشور بھگت ہیں۔ وُہ ان تمام مقاموں سے الگ رہتے ہیں۔ ان پریمیوں کا حج اور تیرتھ کا مقام بھی پریم ہی ہوتا ہے۔ وُہ اسی مقام کا طواف کرتے ہیں۔ اور اُسی کی یاترا کرتے ہیں جن مقاموں کو عام لوگ

تیرتھ اور حج کے مقام کہتے ہیں۔ اُن کے لئے وُہ بغیر پریم کے کچھ معنی نہیں رکھتے۔ وُہ پریم کے بس میں ہو کر کہتے ہیں ؎

مکّہ، مدینہ، دوارکا، بدری اور کیدار
بنا پریم سب جھوٹ ہے کہے ملوک بچار (ملوک)

اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ پریمی ان مقاموں کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ پریمی اور حقارت، پریمی اور نفرت، پریمی اور مغائرت، یہ متضاد باتیں ہیں۔ پریمی کی لغات میں ہی یہ الفاظ نہیں ملتے۔ ان کا محض یہ مطلب ہوتا ہے۔ کہ پریم ڈھونڈنے کے لئے تسکینِ قلبی تلاش کرنے کے لئے، طمانیت کی ٹوہ لگانے کے لئے کہیں گھومنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دور جانا یا منزلیں طے کرنا لاحاصل ہے وُہ کیا کہتے ہیں ؎

شیخ و برہمن! دیر و حرم میں ڈھونڈتے ہو کیا لاحاصل
مُوند کے آنکھیں دیکھو تو ہے ساری خُدائی سینے میں (انشاء)

جس وقت عام لوگ مندروں اور مسجدوں کا قصد کرتے ہیں۔ ان عبادت گاہوں کی راہ لیتے ہیں۔ اور وہاں پہنچ کر بیرونی پُوجا اور نمازیں مصروف ہوجاتے ہیں لیکن دل کہیں اور جگہ چکر لگاتا ہے۔ تب اس نظارے سے متاثر ہو کر پریمی کہتا ہے ؎

شور کیوں گبر و مسلماں نے مچا رکھا ہے
دَیر میں کچھ بھی نہیں کعبہ میں کیا رکھا ہے
شیخ اگر کعبہ میں خوش ہے تو برہمن دَیر میں
اپنے اپنے طور پر ہر شخص بہلاتا ہے دِل
گر شیخ و برہمن سُنیں افسانہ کسی کا
معبد نہ رہے کعبہ و بتخانہ کسی کا (اکبر)

تو کیا پریمی ان مقامات سے پرے ہٹ کر کچھ نہیں کرتا۔ کیا وہ اپنی زندگی

کے بے بہا لمحوں کو ضائع کرتا ہے؟ نہیں! ایسا نہیں ہوتا۔ پریمی بھی ایک آستانہ پر جا کر بیٹھتا ہے ؎

شیخ کعبے میں شوالے میں برہمن بیٹھے
ہم تو کوچہ میں ترے مار کے آسن بیٹھے (اکبر)

پریمی تو پریم کے کوچہ میں آسن لگاتا ہے۔ وہیں دو زانو ہوتا ہے۔ وہیں آرتی اُتارتا ہے۔ وہیں نماز گذارتا اور وہیں سجدہ کرتا ہے ؎

جائے جو چاہے سُوئے دیر و حرم
ہم تو بیٹھے ہیں درِ دلدار پر (ریحان)

سوال ہو سکتا ہے۔ کہ پریمی بھی کوئی نہ کوئی دروازہ تو آخر ڈھونڈتا ہی ہے وہ دُوسرے لوگوں کی بنائی ہوئی عبادت گاہوں میں نہیں پہنچتا۔ تو اپنی بنائی ہوئی عبادت گاہ میں تو جاتا ہی ہے؟ یہ سوال واجب ہے۔ کیونکہ آخر وہ بھی کسی کوچہ میں یا کسی دروازہ پر جا کر بیٹھتا ہی ہے۔ لیکن وہ دروازہ کہاں ہوتا ہے ؎

کچھ کلیسا پہ ہے موقوف نہ کچھ کعبہ پہ
ہر جگہ ہم نے تجھے جانِ جہاں دیکھا ہے (رفیق)

پریمی کے پریم کا کوچہ ہر ایک مقام پر موجود ہے۔ اس کو پریم کی لہر ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس کا معبود، اس کا محبوب، اس کا معشوق کہیں کسی خاص جگہ پر قیام نہیں رکھتا۔ وہ ہر جائی ہے۔ اس لئے پریمی کا پریم بھی ہر جائی ہے۔ جب کوئی پریمی سے اس کے پیارے کے مقام کا سوال کرتا ہے۔ تو وہ ناچتا ہوا جواب دیتا ہے ؎

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا کہیں ظاہر، کہیں چھپا دیکھا
کہیں ممکن ہوا، کہیں واجب کہیں فانی، کہیں بقا دیکھا
کہیں موجود اور کہیں غائب کہیں بندہ، کہیں خدا دیکھا

کہیں بیگانہ وش نظر آیا کہیں صُورت سے آشنا دیکھا
کہیں عاشق نیازؔ کی صُورت
سینہ بریاں ودِل جلا دیکھا (نیازؔ)

اب سُن لیا آپ نے کہ عاشق کے کُوچۂ پریم اور اس کا معبد کہاں ہوتے ہیں۔ پریم کا کُوچہ کہیں دُور نہیں ہوتا۔ پریم کی لہر ہر جگہ چل رہی ہے۔ پریمی کو شادی کے نغموں اور دُکھی کی آہ میں ایک ہی قسم کی لہر دکھائی دیتی ہے۔ پریم بہت ہی لطیف شَے ہے۔ وُہ ہوا سے بھی ہلکا ہے۔ خیال سے بھی لطیف ہے۔ اس لئے وہ سب جگہ سمایا ہُوا ہے۔ پریم کا منبع کیا ہے؟ پریم کا مخزن ہے۔ پریم سُروپ پرماتما۔ اس لئے جس طرح سے وُہ مالکِ عزّوجلّ ہر ایک چیز کے اندر سمایا ہُوا ہے۔ اُسی طرح سے پریم کی کیفیّت ہے۔ پریم پرماتما کا دُوسرا نام ہے۔ ان میں کوئی بھید نہیں ہے۔ سچ تو کہا ہے:۔

GOD IS LOVE & LOVE IS GOD

یعنی "پرماتما پریم ہے۔ اور پریم پرماتما ہے" ؂

کسی ہندی کوی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

پریم ہری کو رُوپ ہے، تیوں ہری پریم سُروپ
ایک ہوئے دوٹے یُوں لسیں جیوں سورج اور دُھوپ (رسخانؔ)

یعنی "پریم پرماتما کا رُوپ ہے۔ اور ایسے ہی پرماتما پریم کا رُوپ ہیں۔ یہ دونو حقیقت میں ایک ہیں۔ لیکن دو صرف اس طرح سے دکھائی دیتے ہیں۔ کہ جیسے سُورج اور دُھوپ" ؂

پریم کی اصلی توصیف کرتے ہُوئے، حقیقی عشق کی حمد گاتے ہوئے ایک اُردو شاعر نے کیا خُوب کہا ہے ؎

مُحبّت کا عالم میں پھیلا ہے نُور
نہ ہوتی مُحبّت نہ ہوتا ظہور (میرؔ)

پریم پرماتما کا سُروپ ہونے کی وجہ سے احاطۂ تحریر و تقریر سے باہر ہے یہ بھی اتنی لطیف شے ہے۔ کہ مادی طاقتیں نہ تو اس کا اندازہ لگا سکتی ہیں۔ اور نہ ہی اس کی حد باندھ سکتی ہیں۔ ایک ہندی کوی کہتا ہے ؎

پریم اگم انوپم امت ساگر سرس بکھان
جو آوت یہی ڈھگ، بوہر جات نہیں رس کھان (رسخاںؔ)

یعنی "عشق ایک ایسا گہرا بے اندازہ، بے تول سُمندر ہے۔ کہ جو کہنے میں نہیں آسکتا جو اس کے نزدیک آتا ہے۔ وُہ پھر واپس نہیں جا سکتا"۔

بے شک پریم ساگر میں پہنچ کر پھر واپسی کا سوال نہیں رہتا۔ پتنگا شمع کے پاس آکر کیسے لوٹ سکتا ہے۔ وُہ تو وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ پریم ایسی ہی شے ہے پریم کی تعریف کرتے ہُوئے ایک مغربی فلاسفر ٹیپر صاحب لکھتے ہیں۔ کہ "پریم! یہ ایک انوکھی شے ہے۔ پریم کے ایک لفظ میں ساری کتاب کا مطلب آجاتا ہے۔ پریم کے ایک آنسُو میں سُمندر سما جاتا ہے۔ پریم کی ایک نظر میں چودہ طبق سما جاتے ہیں پریم کی ایک ایک آہ میں سو سو طوفان جوش مارتے ہیں۔ پریم کی ہر ایک لمس[1] میں بے شمار بجلیاں کوندتی ہیں۔ پریم کے ایک ایک لمحے میں جُگ بیت جاتے ہیں۔ آہا! پریم کے اندر کیا کیا راز پنہاں ہیں!"

ایک اور فلاسفر مسٹر ہنری وان نے لکھا ہے۔ کہ "پریم میں لین کا حساب نہیں ہوتا۔ دین کا ہی ہوتا ہے۔ پریم خوشی کا یا خواہش کا پاگل پن نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ پریم تو پاکیزگی، تسکین اور پاک زندگی کا نام ہے۔ بے شک اسی کا نام پریم ہے۔ پریم سے افضل تر دُنیا میں کوئی چیز نہیں ہے اور پریم ہی ایک ہمیشہ رہنے والی چیز ہے"

کیا حقیقتاً پریم سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ کیا واقعی یہ ایسی گراں بہا شے ہے؟ ہاں بلاشبہ یہ وہ نگینہ ہے۔ کہ جس کے ہاتھ آنے سے پھر کوئی لعل و گوہر آنکھ

[1] چھونا

میں جچتے نہیں۔ یہ وُہ دولت ہے کہ جس کے مقابلہ میں سارے شاہی خزانے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ پریم وُہ پُونجی ہے۔ کہ جس کے قبضہ میں یہ ہو۔ اس کو کبھی خسارہ کا خیال ہی نہیں آسکتا۔ پریم وہ مشعل ہے۔ کہ جو سدا روشن رہتی ہے پریم وہ سُریلا ساز ہے۔ کہ جس کے لطیف تاروں سے سدا ہی من موہنے راگ نکلتے رہتے ہیں۔ پریم وُہ بجلی ہے۔ کہ جہاں ایک دفعہ کوند جائے۔ وہاں اس کی رَو کبھی بند نہیں ہوتی۔ پریم وُہ چمک ہے۔ کہ جس کے سامنے باقی سب چیزوں کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ پریم وُہ مٹھاس ہے کہ جس کا مزا بیان سے باہر ہے۔ پریم وُہ پھل ہے۔ کہ جس کا رس زبان سے لگا چھوٹتا نہیں۔ پریم وہ پھُول ہے۔ کہ جس کی خوشبو دماغ کو سدا معطّر رکھتی ہے۔ پریم وُہ عمارت ہے۔ کہ جس کی بنیاد پاتال لوک میں ہے اور کبھی ہل نہیں سکتی۔ پریم وُہ منتر ہے۔ کہ جو سب کو رام کرلیتا ہے۔ پریم وُہ جادُو ہے۔ جو سب پر قابو پالیتا ہے۔ غرضیکہ پریم وُہ پارس پتھر ہے۔ وہ رسائن ہے، وُہ کیمیا ہے۔ کہ جس خوش قسمت انسان کو حاصل ہو جائے۔ اُسے نہ کوئی اور خواہش رہتی ہے۔ نہ کمی۔ اگر یہ الٰہ دین کا چراغ کسی راجہ یا بادشاہ کو مل جائے۔ تو اس کی رعیّت اس پر جان نثار کرتی ہے۔ اگر کسی سردار کے ہاتھ آجائے تو اس کی فوج اس کے اشارہ پر چلتی ہے۔ اگر کسی حاکم کے پاس ہو۔ تو اُس کے انصاف کا ڈنکا بج جاتا ہے۔ اگر کسی نیک عورت کو دستیاب ہو جائے۔ تو سارا کنبہ اُس کو دیوی سمجھ کر پُوجتا ہے۔ اگر کسی بیٹے کے حصہ میں آجائے۔ تو باپ اس پر سَو جان سے قربان ہوتا ہے۔ قصّہ کوتاہ پریم کا نگینہ جس انسان کے پاس بھی ہو۔ اُس کی خوش نصیبی مسلّمہ ہے کوئی تکلیف اس کو زحمت نہیں دے سکتی۔ وُہ سدا خوش و خرم رہتا ہے۔ دُنیا بھر کے انسان نہیں نہیں! بلکہ چرند پرند بھی اُس کے آگے آنکھیں بچھاتے ہیں ایسی مثالیں ملتی ہیں، کہ جنگلوں میں اکیلے رہنے والے خُدا کے بندے جو سچے پریم کے جذبہ سے سرشار تھے۔ خونخوار جانوروں سے کبھی خوف نہ کھاتے تھے۔ بلکہ وُہ جانور اس

پریم کے دائرہ میں آکر کھیلتے تھے۔ کلیلیں کرتے تھے۔ سنو پرانی داستان ہے ؎

یکے دیدم از عرصۂ رودبار   کہ پیش آمدم بر پلنگے سوار

پریم کے متعلق ایک اور بات عرض کرنی ہے۔ اور وہ نہایت ضروری اور اہم ہے۔ پیشتر ازیں ایک مقام پر عرض ہو چکا ہے۔ کہ پریم لینے کی چیز نہیں ہے۔ صرف دینے کی شے ہے۔ جب تک اس خیال سے پریم کیا جائے گا۔ تب تک وُہ حقیقی پریم رہے گا لیکن جونہی اس میں کسی معاوضہ کا خیال آ گیا۔ پریم کے عوض پریم یا کسی اور چیز کی اُمید باندھی گئی۔ تو وُہ پریم پریم نہیں رہے گا۔ بلکہ سودا ہو جائے گا دکانداری کی شکل اختیار کرلے گا۔ اور پریم کا لطیف جوہر۔ پریم کی لطافت اس میں سے اُڑ جائے گی۔ لین دین کے بازار میں پریم نہیں مل سکتا۔ اور نہ ہی معاوضہ کے خیال سے کیا ہوا پریم کسی خوشی کا باعث بن سکتا ہے۔ بلکہ ایسا خود غرضی کا پریم تو تکلیف کا موجب ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر لوگ آجکل یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ کہ زمانہ بہت بُرا آگیا ہے جس کے ساتھ بھلائی کی جائے وُہ ہی بُرائی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے نیکی کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ احسان کے لئے کوئی شکر گذار نہیں ہوتا۔ نیک آدمی کی کوئی عزت نہیں وغیرہ۔ ایسے پریمی پریم کے نام کو بدنام کرتے ہیں۔ وُہ تو سوداگری کرتے ہیں۔ اور بھلائی کرتے ہی اس اُمید سے ہیں۔ کہ اُس سے دُنیا میں عزت اور برتری ہوگی۔ یا لوگ تعریف کریں گے۔ ایسے پریم کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اور اسی لئے اُمید بر نہ آنے سے رنج محسوس ہوتا ہے۔ پریم کرنے میں تو یہ خیال ہونا چاہیے۔ کہ جو ایک ہندی کوی نے بیان کیا ہے ؎

تم یہاں شُدھ لو کہ نہ لو کبھی   اُچت اُتر دو کہ نہ دو کبھی

پر یہی کہتے ہم ہیں رہو
تم سدیو سہرش سکھی رہو   (ملیشفلی شرن بھگت)

یعنی "اے پیارے! تم خواہ ہماری خبر پوچھو یا نہ پوچھو۔ ہماری بات کا مناسب جواب دو یا نہ دو۔ لیکن ہم تو ہمیشہ یہی خواہش کرینگے۔ کہ تم ہمیشہ خوش و خرم رہو"

حافظ وظیفۂ تو دُعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید!

ترجمہ:۔ اے حافظ تیرا کام تو دُعا کر لینا ہے۔ اور بس اس فکر میں نہ پڑ۔ کہ وُہ سُنی گئی یا نہ سُنی گئی ؛

پریم اور موہ میں بُعدین کا فرق ہے۔ موہ کے زیر اثر انسان تو جس کسی کی بھی خُوبصورتی پر دل دے بیٹھتا ہے لیکن پریم میں کسی ایک خاص ہستی پر دل و جان سے شیدا ہوتا ہے۔ خواہ دوسرے آدمی اس ہستی کو کیسا ہی سمجھتے ہوں۔ اور کتنا ہی گھٹیا جانتے ہوں۔ موہ کے اندر عقل گمراہی میں ہوتی ہے۔ اور اس پر ناپاکیزگی کا پردہ ہوتا ہے۔ پریم کے اندر عقل پاکیزہ ہوتی ہے۔ اور نیک رہبری کرتی ہے۔ موہ میں خُود غرضی زوروں پر ہوتی ہے۔ اور پریم میں ایثار اور قربانی کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ موہ کے اندر خواہشات اور ارادے رذیل اور ادنےٰ ہوتے ہیں اور پریم میں نیک اور اعلیٰ۔ اسی لئے موہ کا نتیجہ ذلّت اور رنج ہوتا ہے۔ اور پریم کا نتیجہ سُرور اور آنند۔ موہ میں انسان اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لئے اپنی پیار کی شے سے بڑی بے دردی کا سلوک روا رکھتا ہے۔ پریم کے اندر اس کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو قربان کرنے تک طیار رہتا ہے۔ موہ سے بھرا ہُوا انسان ڈسدل اکو کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ اور پریمی انسان اپنے پریم پاتر کا پُجاری ہوتا ہے۔ موہ میں انسان چمڑے اور لہو سے مُحبت رکھتا ہے۔ پریم کا پجاری باطن کی پرستش کرتا ہے۔ موہ میں انسان لینے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ لیکن پریم میں برخلاف اس کے لینے کا نام تک نہیں ہوتا۔ وہاں دینا ہی دینا ہوتا ہے۔ موہ جمع اور ضرب کے گُر جانتا ہے۔ اور پریم نفی اور تقسیم کے۔ موہ میں دوسری جانب سے لاپروائی یا حسب خواہش رویہ

نہ پاکر نفرت جاگ اُٹھتی ہے۔ لیکن پریم میں نہ صرف لاپروائی اور بے اعتنائی بلکہ ظلم اور سختی ہونے پر بھی پریم کے جذبہ میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ پریمی پریم اس لئے کرتا ہے۔ کہ پریم ہی اُس کی زندگی ہوتی ہے۔ پریم ہی سہارا۔ پریم ہی جیون اور پریم ہی پران۔ موہی انسان کو اگر اپنی پیار کی چیز ملنے کی اُمید نہ رہے تو اور طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یا کسی دُوسری پیار کی چیز کی ٹوہ لگاتا ہے۔ لیکن پریمی اُسی چیز کا ہو چکتا ہے۔ ملنے یا نہ ملنے۔ اُمید یا مایوسی کا وہاں سوال ہی نہیں اُٹھتا وہاں تو پریم پریم ہی کے لئے ہے۔ ہر حال میں پریم کرنا ہے۔

اس دُنیا میں سچے پریم کی مثال کچھ حد تک ماں کی مُحبت سے دی جا سکتی ہے۔ ماں کی محبت بچے سے اکثر خود غرضی اور معاوضہ کے خیال سے نہیں ہوتی۔ وُہ جس طرح تکلیف سے دن رات مُصیبت جھیل کر بچے کو پہلے اپنے بطن میں رکھتی ہے۔ جس تکلیف سے اُس کو جنتی ہے۔ اور جس دُکھ سے اُس کو پالتی ہے۔ پھر جس طرح سے ہر وقت اُس کی بھلائی کی خواہاں رہتی ہے۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ سچے پریمی اپنے محبُوب کے عیبوں کو نہیں دیکھتے۔ وُہ تو اس کے لئے ہر وقت قربان ہونے کو طیار رہتے ہیں۔ اور اگر اُن کے پریم کے رستہ میں نثار ہونے کے لئے کوئی چیز رکاوٹ پیدا کرے۔ تو برداشت نہیں کر سکتے ؎

فانوس کو پروانوں نے دیکھا تو یہ بولے
کیوں ہم کو جلاتے ہو کہ جلنے نہیں دیتے (اکبر)

سچے پریم کے متعلق کبھی حساب یا گنتی شمار نہیں کیا جاتا۔ جمع تفریق کا سوال وہاں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہاں اس سُنہری اُصول کے سوا اور کسی دوسرے اُصول کی پابندی نہیں ہوتی۔ کہا بھی تو ہے ؎

جہاں پریم تہاں نیم نہیں، تہاں نہ بدھی ویوہار پریم مگن جب من بھیا، تب کون گنے تتھ وار (کبیر)

ترجمہ :- جہاں سچی محبت ہوتی ہے - وہاں اصول کی پابندی نہیں ہوتی - نہ ہی وہاں سوچ سمجھ کا کام ہوتا ہے - جب دِل کے اندر حقیقی محبت نے جگہ لے لی - تب وہاں گنتی حساب کو کوئی دخل نہیں رہتا "

سچے پریم کی ماہیت کو واضح کرنے کے لئے ایک حکایت عرض کی جاتی ہے۔

حکایت :- کسی راجہ کا لڑکا اپنے پروہت کی لڑکی کی خوبصورتی کا شکار ہوگیا۔ اور اس بات کے لئے مصر ہوا - کہ اس کو اپنی زوجیت میں لائے - یعنی اپنی دھرم پتنی بنائے - پروہت کے لئے ایک طرف تو ذات پات کی تمیز کی رکاوٹ تھی - اور دوسری طرف راجہ صاحب کی ناراضگی کا خیال تھا۔ اس لئے وہ بڑا رنجیدہ خاطر رہنے لگا - لڑکی نے لگاتار کئی دنوں تک ایسی حالت دیکھ کر اپنے باپ سے اس کا سبب پُوچھا لیکن وہ بیچارہ زبان نہ کھول سکتا تھا - لڑکی کے اصرار کرنے پر اُس نے سارا ماجرا کہہ سُنایا - لڑکی نے اپنے باپ کو تسلی دی اور کہا کہ آپ مطمئن رہیں مَیں اپنے خاندان کے نام پر ہرگز کوئی بٹہ نہ لگنے دوں گی۔ آپ یُوراج سے کہہ دیں کہ ساتویں دن آکر رسومِ شادی ادا کرلے - پروہت بچارا بڑی شش و پنج میں تھا لیکن آخر لڑکی کے کہنے کے مطابق اُس نے پیغام بھیج دیا - لڑکا بہت خوش ہوا - اور بڑے ذوق و شوق سے شادی کے دن کی تیاریاں کرنے لگا - اُدھر لڑکی نے ایک علیحدہ کمرہ اپنے لئے تجویز کرلیا - اور ایک سخت دست آور دوائی کھالی - اجابتیں بڑے زور سے شروع ہوگئیں - جو غلاظت نکلتی تھی - وُہ اُس کو وہیں ایک گھڑے میں جمع کرتی جاتی تھی - متواتر کئی روز تک دست آنے کی وجہ سے لڑکی نہایت کمزور ہوگئی - خُون کا نام و نشان نہ رہا - رُخساروں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں - وُہی سُندری جو خُوروش تھی - چڑیل سی نظر آنے لگی - اور غلاظت کے کئی دن تک وہاں پڑے رہنے سے وُہ کمرہ عفونت سے بھر گیا - آخر مقررہ دن آپہنچا - راجہ کا لڑکا سج دھج کر وہاں بو تجا اُس کو گندے کمرے میں پہنچایا گیا۔

اُس کو پروہت کی حرکت پر سخت غصّہ آیا۔ اور قریب تھا۔ کہ وُہ پروہت کو تلوار کے گھاٹ اُتار دے۔ کہ اندر سے لڑکی نے اپنی کمزور آواز سے کہا۔ کہ راج پُتر آئیے۔ آپ کی معشوقہ موجود ہے۔ جب اُس نے آواز کے مقام پر نگاہ ڈالی۔ تو وُہ اور بھی زیادہ غضب ناک ہوگیا۔ اور کڑک کر کہا۔ کہ او ڈائن تو کون ہے؟ وہ محبوبہ کہاں ہے۔ کہ جس کے حُسن کا مقابلہ عرش کی حُوریں اور اندر کے اکھاڑہ کی پریاں بھی نہ کر سکتی تھیں۔ اُس نے کہا: "وُہ مَیں ہی ہُوں البتہ جس چیز کی وجہ سے آپ کی رگِ محبّت پھڑک اُٹھی تھی اور آپ کے عشق نے جوش مارا تھا اگر اسے دیکھنا چاہتے ہو۔ تو وُہ گھڑوں میں موجود ہے۔ سوائے اس چیز کے میرے اندر سے اور کوئی شئے جُدا نہیں ہُوئی جس حُسن کا آپ ذکر کرتے ہیں۔ وُہ بجنسہٖ اس گھڑے میں محفوظ رکھا ہے" لڑکے کو سمجھ آگئی۔ اُس کی چیخ نکل گئی۔ اور وہ اُس کے پاؤں پر گر کر کہنے لگا۔ "اے بہن! واقعی مَیں جھوٹے پریم کا دعویدار تھا۔ میری محبّت غلاظت اور عفونت سے تھی۔ لیکن اب مَیں تیرا سچّا پریمی ہوں۔ تیری خُوبی، تیری نیکی، تیری عصمت اور تیرے اندرونی حُسن کا پُجاری ہُوں"۔ عزیز و یہ ہے۔ سچّے اور جھوٹے پریم کا فرق! ؎

نہ رسد عاشقی بہ بوالہوساں عاشقی دیگر و ہوس دگر است

ترجمہ:۔ حریص آدمی عاشقی حاصل نہیں کر سکتا۔ عاشقی ایک علیٰحدہ چیز ہے اور ہوس علیٰحدہ ::

اپنے پروردگار سے بھی خود غرضی کا پریم نہ ہونا چاہیئے۔ جو لوگ دُنیا کی فانی چیزوں کے لئے یا سُورگ اور بہشت حاصل کرنے کی نیت سے اپنے مالک سے پریم کا اظہار کرتے ہیں۔ وُہ بھی بنیا پن دکھلاتے ہیں۔ اور اپنے مالک سے بھی بیوپار کرتے ہیں۔ ایسا پریم حقیقی راحت کا مُوجب نہیں بن سکتا۔ سندھیا یا نماز ادا کر کے یا دیگر طرح سے عبادت کر کے کسی چیز کی بھی خواہش نہ رکھنی چاہیئے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خُدا کی ہے
زاہد مگر جزا کی تمنّا بھی چھوڑ دے 	(اقبالؒ)

اگر کچھ مانگنا ہی ہو۔ تو بس یہ کہہ ؎
ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہُوں مَیں تجھی کو
تیرے سوا تو میرا کچھ مُدّعا نہیں ہے 	(میر)

آہ ہر کس بخیالِ خود دارد ز تو مقصودے
ایں جُملہ طفیلِ تو من از تو ترا خواہم 	(جامیؒ)

بھگوان سے پریم بے اندازہ ہونا چاہئے۔ ایک منٹ کی بھی جُدائی اس سے نہ ہونی چاہیئے۔ لیکن پریم کا معاوضہ نہ مانگ کر کہنا ہی چاہئے ؎

جیتا رکھے تو ہم کو یا دھڑ سے سر اُتارے 	اب تو فقیر عاشق کہتا ہے یُوں پکارے
راضی ہیں ہم اسی میں جس میں ہیں تیری رضا ہے 	یاں یُوں بھی واہ وا ہے اور وُوں بھی واہ وا ہے

پریم کتھا تو بہت لمبی ہے۔ افسانۂ اُلفت طویل ہے۔ اس کو کہاں تک بھلا بیان کیا جائے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں اس سارے افسانے کو ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں ہے لیکن جس قدر عرض ہوا ہے۔ اس کو ہی اگر ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے تو ہماری ۹۹ فیصدی تکالیف رفع ہو سکتی ہیں۔ یہ تکالیف اور رنج کہیں باہر سے نہیں آتے۔ ہم خود ہی اُن کو پیدا کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور اُن کو دُور کرنے کے لئے بھی کوئی باہر کی طاقت کام نہیں کر سکتی۔ دُور بھی ہم خود ہی کر سکتے ہیں۔ ہم خود ہی اُن کا سبب ہیں۔ اور خود ہی اُن کے معالج بن سکتے ہیں۔ پریم اور اُلفت کے راز سے آگاہ ہو جائیں۔ تو ہمارے سارے رنج والم راحت و مُسرّت میں تبدیل ہو جائیں فی زمانہ ہم اوّل تو پریم کو اپنی زندگی میں اور اپنے شعار میں جگہ ہی نہیں دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ زندگی بے لُطف ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص مٹھائی تیار کرنے۔ اور

اس میں قند نہ ڈالے۔ تو وُہ مٹھائی نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اس کے اندر مٹھاس موجود نہیں۔ ایسے ہی زندگی کی مٹھائی کے اندر اگر پریم کی قند شامل نہ کی جائے۔ تو وُہ بدمزہ پھیکی اور بد ذائقہ رہے گی۔ اس میں نہ اپنے آپ کو لطف آئیگا۔ نہ اُن کو جن سے ہمارا دنیا کے اندر واسطہ پڑتا ہے۔ خواہ وہ گھر کے آدمی ہیں۔ یا باہر کے۔ جس قدر پریم کا جزو زیادہ ہوگا۔ اتنا ہی زیادہ لُطف ہم کو بھی آئے گا۔ اور دُوسرے بھی اُس سے اتنا ہی زیادہ محظوظ ہوں گے۔

بعض بھائی پریم کا جزو تو کچھ کچھ شامل کرتے ہیں لیکن اُس کے اُوپر چھلکا لگا دیتے ہیں جسکی وجہ سے مٹھاس پُورے طور سے شامل نہیں ہوتی۔ اگر چاشنی بنانے کے لئے گُڑ کی ڈلی پر غلاف چڑھا کر پانی میں چھوڑ دیا جاوے۔ تو چاشنی پھیکی تیار ہو گی۔ اگر مٹھاس کا پُورا لطف لینا ہو۔ تو غلاف کو ہٹا دینا پڑے گا۔ تبھی ٹھیک، رسدار اور پُوری چاشنی تیار ہوگی۔ ایسے ہی جو بھائی پریم کے اُوپر غیریت کا غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ اُن کی زندگی کی چاشنی بھی پھیکی تیار ہوتی ہے۔ یعنی ایک انسان کہتا ہے۔ کہ جس کے سر پر چوٹی ہوگی وُہی پریم کے لائق ہے۔ ایک کہتا ہے۔ کہ جس کے سر پر رُومی ٹوپی ہو۔ وُہی میری مُحبّت کا اہل ہوسکتا ہے۔ تیسرا کہتا ہے۔ کہ جس کے سر اور مُنہ پر بال ہوں گے۔ اسی سے مَیں پیار کرسکتا ہوں۔ یہ غلاف ہیں۔ یہ چھلکے ہیں۔ کہ جو پریم کی مٹھاس کو باہر نہیں آنے دیتے۔ اگر سچ مچ زندگی کو شیریں بنانا منظور ہو۔ تو ان رکاوٹوں کو دُور کر دینا چاہئیے۔ پھر دیکھئے کیسا سُرور آتا ہے۔ زندگی کیسی پُر لُطف ہو جاتی ہے۔ اور پھر کیسے مستی کے سرور آمیز ترانے اُٹھتے ہیں۔ اور خود بخود زبان سے نکلتا ہے ؎

ہندو سے عداوت نہ مسلمان سے کینہ　　گنگا بھی پیاری ہے پیارا ہے مدینہ
ہم طالبِ حق ہیں ہمیں چاہیئے آتش
پہنچاوے جو حق تک وہی عُرفان کا زینہ　　(آتش)

پریم کا چھلکا اگر اتر جائے۔ تو وہ وشو پریم بن جائے گا جس کو ایک چشمہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ ہر ایک انسان کے پریم کا انفرادی جذبہ ایک قطرے کی مانند ہوتا ہے۔ اگر وہ قطرہ الگ تھلگ غلاف میں بند رہے گا۔ تو زمانے کے گرم جھونکے اس کو خشک کر کے نیست و نابود کر دینگے۔ لیکن اگر وہ کینچلی اُتار کر چشمہ سے ہم آغوش ہو جائیگا تو اُس کو ابدی زندگی مل جائے گی۔ اور وہ خود بھی چشمہ ہی بن جائے گا۔ سچ ہے ع

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

ایسا بن کر ایک تو قدرت کی خوبصورتی کو بڑھائے گا۔ دوسرے ہر ایک کو پیارا اور بھلا معلوم دے گا۔ اور علاوہ ازیں اور لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں گے اگر وہ پریم کا قطرہ وشو پریم کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو گا۔ تو نتیجہ کیا ہو گا۔ ع

خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہُوا

ہم نے موجودہ زمانے میں اپنے اپنے انفرادی پریم کے اُوپر چھلکا چڑھا رکھا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ خشک ہو رہا ہے جس کی وجہ سے باہمی ہمدردی و اُلفت کے جذبے بڑے کمزور پڑ گئے ہیں ایسے بُرے حالات کو دیکھ کر کوئی کوئی جو سچا پریمی موجود ہے۔ دل برداشتہ ہو جاتا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ موجودہ بے رُخی، ناروا داری، نزاع و تکرار، بے جا چھیڑ چھاڑ اور بلا وجہ جنگ و جدال دیکھ کر غالب کی طرح کہتا ہے ؎

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور گر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

میر نے بھی کچھ ایسا ہی کہا ہے ؎

ان اُجڑی ہوئی بستیوں میں جی نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں، ویرانہ جہاں ہو

جدھر نگاہ ڈالیں۔ خود غرضی کے پتلے۔ غرض کے بندے۔ اپنے بھائیوں کی کھال اُتارنے والے انسان ملتے ہیں۔ بلکہ آدم بو آدم بو کہنے والے ملتے ہیں۔ اُن کو جو چاہو نام دے لو۔ کوئی سچا پریمی جو شو پریم کے راز سے باخبر ہو نظر نہیں آتا۔

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بُت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا (اکبر)

حالاتِ حاضرہ کو دیکھ کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ سینہ دہکتا ہے۔ گلا رکتا ہے نہ معلوم یہ بُرا وقت ہماری آنکھوں کے لئے کیوں رکھا ہُوا تھا۔ کاش کہ یا تو یہ حالاتِ بد نہ ہوتے یا ہم ہی نہ ہوتے لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس مالکِ برتر کی بارگاہِ عالی سے ہر وقت نیک اُمید رکھنی چاہیئے۔ وہ خدائے عزّوجل تو ہر وقت ہماری بہتری چاہتے ہیں۔ لیکن ہم خود ہی اس حالتِ زبوں کے ذمّہ دار ہیں۔ ہم جان بوجھ کر اور دیکھ بھال کر چاہِ مذّمت میں گر رہے ہیں۔ اس لئے میں اس پاک ذات کی درگاہِ عالی سے یہی اُمید رکھتا ہُوں۔ کہ وہ ہمیں بھی دین و دنیا میں سربلند کرے گا۔ اور ہمیں بھی اپنے بھگتوں کی صف میں شامل ہونے کی توفیق عطا کرے گا۔ بھارت ورش کا شمار بھی دُنیا کے نیک نام ملکوں میں ہو گا۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است تو بدیں آرزو مرا برساں

ترجمہ:- اے میرے مالک یہ میری خواہش کیسی اچھی ہے۔ تو اس میری آرزو کو بار آور کر۔

ممکن ہے میری کمزور لیکن پُر درد آواز میرے بھائیوں کے کان میں پہنچے اور وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ اسلئے میں یہی اُمید رکھتا ہوں کہ

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے (اقبالؒ)

انسان اور انسان

کیا غضب ہے نہیں انساں کو انساں کی قدر
ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

لوگ کہتے ہیں۔ کہ سب ملک ترقی کر رہے ہیں۔ نئی نئی ایجادیں کر رہے ہیں۔ سائینس کے نئے نئے کرشمے دکھا رہے ہیں۔ اب بجلی کے ذریعہ ایک آدمی بنایا گیا ہے، جو نوکر کی طرح بہت سے کام سرانجام دیتا ہے۔ یعنی دروازے پر موجود رہتا ہے۔ کسی آنے والے کی اطلاع اندر اپنے مالک کو پہنچاتا ہے۔ واپس آکر جواب دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے ملکوں کی ترقی کی تعریف کرتے ہوئے لوگ ہندوستانیوں کو کوستے ہیں۔ کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے ہیں۔ جو چرخہ رام کی ماں کاتتی تھی۔ وہی آج تک موجود ہے۔ جس کشتی پر حضرت نوح سوار ہوئے تھے۔ بعینہ وہ آج تک چلی آ رہی ہے۔ جو ہل حضرت آدم نے چلایا تھا۔ اس کو پوری قدر و منزلت اور احترام کے ساتھ آج تک برقرار رکھا گیا ہے۔ وغیرہ۔ شائد ہندوستانیوں کے خلاف یہ الزام درست ہی ہو۔ لیکن میں تو اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کام ایک ہندوستانی خاص کر وہ ہندوستانی جو آج کل مذہب کا پیرو ہونے کا مدعی ہے۔ کر سکتا ہے۔ وہ کسی ملک کا ہئیت دان یا سائینس دان نہیں کر سکتا۔ آپ سوال کریں گے کہ یہ کیسے سنیے۔ میں ابھی آپ کی حیرانی کو رفع کئے دیتا ہوں۔ جس مغربی سائینس دان نے بجلی کا آدمی بنایا ہے۔ اس نے کئی سال کے تجربات اور محنت و کاوش کے بعد اس کی تکمیل کی ہوگی۔ اور ابھی جو خامیاں اسے معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے دور کرنے میں شائد کئی سال اور لگیں گے۔ اور پھر بھی وہ قدرتی انسان جیسا نہیں بن

سکتا۔قدرتی طور پر بھی جو انسان بنتا ہے ۔ اُس کو بھی کئی سال لگتے ہیں۔ پہلے ماں کے پیٹ میں نو ماہ تک حمل کی صورت میں رہتا ہے ۔ پھر پیدا ہونے پر ہزار مصیبتوں سے ماں باپ اُس کی پرورش کر کے بڑا کرتے ہیں ۔ اور تعلیم و تادیب کے ذریعہ لاکھ جتن کر کے کہیں اس کو انسان کا درجہ حاصل کرنے کے لائق بناتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں آج کل کا مذہبی دیوانہ ہندو سناتی پانچ منٹ میں پلا پلایا ہٹا کٹا رگ و خون والا انسان طیار کر سکتا ہے ۔ آپ حیران ہوں گے یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ بھی سُن لیجئے ۔ دیکھئے ایک شخص ہے جس کا نام ہے کریم بخش ۔ وہ نہایت پاکباز ۔ خوش اخلاق اور خدا ترس آدمی ہے ۔ لیکن گوپال داس کی نظر میں وہ انسان ہی نہیں ہے ۔ گوپال داس کا اگر بس چلے ۔ تو بھارت بھومی کی حدود سے اُسے باہر کر دے ۔ اب گوپال داس کو دھن سماتی ہے ۔ کہ اُسے انسان بنا دے ۔ کسی طرح سے کریم بخش کو اپنا ہم خیال کر لیتا ہے ۔ آگ کے اندر تھوڑا گھی اور خوشبودار چیزیں جلا کر اس کے سر پر چوٹی رکھوا کر اور گلے میں جنیو پہنا کر اس کا نام رکھ دیتا ہے دیال دت بس اب گوپال داس کی نظر میں وہ بھی انسان ہو گیا ۔ حالانکہ اس شخص کے جسم و جان میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ اور اس کے نام کریم بخش کے بھی وہی معنی ہیں ۔ جو دیال دت کے ہیں ۔ دوسری طرف ایک شخص بھگوان داس ہے ۔ وہ وحدانیت کا قائل ہے ۔ اور ایک اونکار کا جاپ کرتا ہے ۔ ہر ایک انسان میں ایک ہی مالک کا نور دیکھتا ہے لیکن عاشق محمدؐ کی نگاہ میں وہ انسان نہیں ہے ۔ اس کا بس چلے ۔ تو اس کافر کی گردن اُڑا دے ۔ عاشق محمد کو بھی خبط سماتا ہے ۔ اور بھگوان داس کو راضی کر کے اُس کی چوٹی کٹوا دیتا ہے ۔ لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھا دیتا ہے ۔ اور عبد الباری نام رکھ دیتا ہے ۔ بس دو منٹ میں اس کو انسان بنا دیتا ہے ۔ حالانکہ پہلی مثال کی طرح بھگوان داس اور عبد الباری کے معنی میں بھی کوئی فرق نہیں ۔ ایک اونکار

اور لا الٰہ الا اللہ ہم معنی کلمے ہیں۔ تاہم وہ پہلے انسان نہیں تھا۔ لیکن اب پورا انسان بن گیا۔ اب آپ کو پتہ لگ گیا ہوگا۔ کہ کس طرح سے جنت نشاں ہندوستان کا مذہبی دیوانہ ہندوستانی مداری کی جادو کی لکڑی کی طرح منٹوں میں انسان بنا لیتا ہے۔ اور اس طرح سے انسان طیار کرنے میں قدرت اور یورپ کے سائنس دانوں سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ وائے بدقسمتی! ہے کوئی حد جہالت اور نادانی کی؟ انسانیت کا معیار کیا رکھ لیا گیا ہے۔ نہ کوئی اخلاق کی قدر ہے۔ اور نہ سیرت کا خیال۔ رام لعل خواہ اوّل درجہ کا غنڈہ ہے۔ دیا کرشن کو عزیز ہے۔ کیونکہ اس کا نام رام لعل ہے۔ دین محمد خواہ بد اخلاقی اور بدچلنی کا پتلا ہے۔ انسانی امن میں ہر وقت خلل ڈالنے والا ہے۔ لیکن اللہ دتہ کو پیارا ہے۔ کیونکہ اس کا نام دین محمد ہے۔ ہے کوئی ٹھکانا اس پاجی پن کا؟ ؎

راہ وہ چلتے ہیں ہم لگتی ہے جس میں ٹھوکر
کام ہم کرتے ہیں وہ جس میں ضرر دیکھتے ہیں
(احسان)

کیا ہم اسی عقل و ذہانت کے برتے پر سوراج کے طلبگار ہیں۔ کیا ہم سوراج لے کے سنبھال سکیں گے؟ ہے ہمارے اندر وہ مادہ اور اہلیت؟ ہرگز نہیں ہمارے اندر تو DISCIPLINE یا تنظیم کا مادہ نام کو بھی نہیں۔ رواداری کا نشان تک نہیں۔ بُردباری کا سایہ بھی ہم پر نہیں پڑا۔ ایسی حالت میں سوراج کے خواہاں ہونا نادان بچے کی طرح چاند کے لئے لپکنا نہیں تو اور کیا ہے؟ مَیں تو کم از کم ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ کہ جس قوم کا اخلاق اتنا نیچا ہے۔ وہ اول تو سوراج کے اہل ہی نہیں۔ اور اگر اسے مِل بھی جائے۔ تو اس سے زیادہ سر پھٹول ہو گی۔ سوراج کی طلب تو ناجائز نہیں۔ لیکن پہلے اپنی طبائع پر اور اپنے اخلاق پر سوراج حاصل کرنا لازمی ہے۔ اندر کا سوراج جب تک ہاتھ نہ آجائے باہر کا سوراج اوّل تو مِل ہی نہیں سکتا اور اگر ملے بھی تو بجائے فائدہ کے نقصان دے گا۔ کیا آپ کو

معلوم ہے ؟ کہ کیوں اہلِ مغرب بر سرِ اقتدار ہیں ۔ اگر نہیں تو سُن رکھو ؎

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں (اکبرؔ)

یہ ہے فرق !

کہیں رٹ لگائی جاتی ہے کہ تعلیم کی کمی اس ملک کی پس ماندگی کی ذمّہ دار ہے میں تعلیم کا بڑا حامی و مددگار ہُوں ۔ لیکن ملکوں کو ترقی کی شاہراہ پر چلانے کیلئے کوئی اور چیز بھی درکار ہے ۔ جو اس ملک میں معدوم ہے ۔ وہ بھی سُن لو ؎

قوم میں گر علم پھونکے بھی ہوائے زندگی
جان کیا پیدا ہو جب دو شخص بھی یکدل نہیں (اکبرؔ)

ہم تو پڑے ہوئے ہیں فضولیات میں ۔ حقیقت کی طرف اور اصلی مدعا کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی ۔ اصلیت کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں منتقل ہوتا ۔ انسان کی عقل و دانش کا اندازہ ہی اس بات سے لگتا ہے ۔ کہ کہاں تک وُہ ہزلیات سے دُور رہتا ہے ؎

اتنا ہی آدمی میں سمجھیے کمالِ فہم
جتنا کہ احتراز کرے وہ فضول سے (اکبرؔ)

اس ملک میں کوئی ایک مرض تھوڑا ہی ہے ۔ یہاں تو جسم کی رگ رگ میں جراثیم امراض پیدا ہو گئے ہیں ۔ خود غرضی کا وہ عالم ہے ۔ کہ خدا پناہ ۔ کہیں نوکریوں کا جھگڑا انسان کو انسان سے جُدا کر رہا ہے ۔ عبدالغفور چاہتا ہے ۔ کہ الٰہ بخش اور شاہ نواز ہی سارے ملازمت میں آجائیں ۔ اور دیو داس کی خواہش رہتی ہے ۔ کہ رام کرشن اور کرپا رام ہی سب آسامیوں پر قابض ہو جائیں ۔ کوئی آدمیت کی کسوٹی نہیں ۔ کوئی لیاقت کا لحاظ نہیں ۔ پھر یہ بات بھی سوچنے کے قابل ہے ۔ کہ کیا سب کو ملازم کرا لو گے ۔ نوکریوں کی تعداد تو مقررہ ہے ۔ اس میں ہر سال کالجوں کی

مشین سے نکلے ہوئے سارے کے سارے پُرزے کس طرح کھپ سکتے ہیں۔ خواہ وُہ ہندو ہیں یا مُسلمان۔ کیا اپنی اپنی مِلّت کے افراد کو ملازمت میں حلقہ بگوش کرنے کی کوشش کرنا بے روزگاری کا علاج ہے۔ یا کیا اس کو ملک و مِلّت کی خدمت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اکبرؔ نے کہا ہے ؎

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تُو صنعت و حرفت کو دیکھ عزّت کے لئے کافی ہے دل کی نیکی

ہم اگر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اور اپنے اپنے راگ الاپنے کو ہی مِلّت کی حقیقی خدمت سمجھتے ہیں۔ اور ایک تنگ دائرہ میں مقیّد رہنے کو ہی ترقی خیال کرتے ہیں۔ یا تنگ نظری کو ہی قومی خدمت کا نام دیتے ہیں۔ تو ہاتھ تو کچھ آئیگا نہیں۔ البتہ موجودہ حالات کو ہم اور بھی بدتر بنا دیں گے۔ ہمارا موجودہ رویّہ پہلے ہی کافی مصیبت ہم پر لا چکا ہے اگر اس میں نمایاں اور فوری تبدیلی نہ کی گئی تو اور بلائیں نازل ہونگی۔ مَیں یہ بات اپنے پاس سے نہیں کہتا۔ بلکہ یہ صائب الرائے اہلِ نظر کا نظریہ ہے۔ کہ اس طریقۂ کار سے بہتری کی صُورت نہیں نکل سکتی۔ سُنئے حضرت اکبرؔ الہ آبادی کیا فرماتے ہیں ؎

کھینچے چلائے کُودے اُچھلے ٹھیلے
ہر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے
حالت تو وہی ہے بلکہ اس سے بدتر
یوں مُنہ سے جو جسکے دل میں آئے کہہ لے
(اکبرؔ)

یہ طریقے غلط ہیں۔ یہ تمیزیں اور تفریقیں سچّے ایمان کے منافی ہیں۔ اس غیریت کی وجہ بلاشبہ یہی ہے۔ کہ لوگوں کے سامنے محض روٹی کا سوال یا تنگ دلی رہ گئی ہے۔ اور خُدا کو لوگ بُھلا بیٹھے ہیں۔ اگر ہم اپنے پیارے پربھُو کی ہستی کو سچّے معنوں میں تسلیم کریں۔ تو کیسے ممکن ہے۔ کہ انسان اور انسان کے درمیان محض اس بناء پر فرق دیکھیں کہ وُہ مختلف شریعتوں کے پابند ہیں۔ اگر ہم کو پروردگار کی ہستی کا حقیقی معنوں میں

یقین ہو۔ تو اس کے بندوں میں ہرگز تمیز نہ کریں۔ ان فرضی حد بندیوں اور اس بناوٹی حدِ فاصل کی وجہ سے باہمی صلح اور آشتی کو ترک کر دینا اس امر کی بیّن دلیل ہے۔ کہ ہم کو خالقِ کونین کے واحد و یکتا ہونے سے انکار ہے ؎

میں دیکھتا ہوں صلح و محبت ہے اُٹھ گئی ہر دل سے ہر گروہ سے ہر خاندان سے
اس کا سبب نہیں ہے سوا اس کے اور کچھ
یعنی کہ اٹھ گیا ہے خدا درمیان سے (اکبرؔ)

جو اہلِ نظر ہیں۔ جن کو چشمِ بینا عطا ہوئی ہے۔ اور بصیرت جن کے حصّہ میں آئی ہے۔ وہ ان تمیزوں کا دل میں خیال بھی نہیں لا سکتے۔ ان کی نظر میں تو سب انسان ایک ہی نور کی شعاعیں۔ ایک ہی سمندر کی لہریں۔ ایک ہی آفتاب کی کرنیں ایک ہی بحر کے قطرے۔ حتیٰ کہ ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں ؎

ہردم بذاتِ جملہ عیاں ست آں یکے در جملہ ہست و بود نہاں ست آں یکے
در صورتِ بشر تو نگاہے چہ می کنی
نے نے بشر کجا ست عیاں ست آں یکے (مولانا رومؔ)

ترجمہ:۔ وہ ایک خالقِ کُل ہر ایک چیز کے اندر ہر وقت موجود ہے۔ تو انسان کی شکل وصورت کو دیکھ کر کیا قیاس آرائیاں کرتا ہے۔ (اے بے سمجھ!) یہ انسان کہاں ہے؟ یہ تو سب اُسی ذات کی جلوہ آرائیاں ہیں!

حقیقت یہی ہے۔ کہ اُس صانعِ قدیر کا جلوہ ہر ایک بشر میں چمکتا ہے۔ پھر جو شخص ایسا نہیں دیکھتا۔ وہ کس طرح سے اس ذاتِ پاک کی ہستی کا قائل کہا جا سکتا ہے۔ ؎

ایک ہے اللہ اور بندے بھی سارے ایک ہیں
پھر بتاؤ تفرقہ کیوں ہندو و مسلم میں ہے

جو لوگ سچے معنی میں اس حکیمِ مطلق کی رحمت کو سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں۔

کہ اُس ذاتِ مقدس کے نزدیک تنزلیتوں کی وجہ سے کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ہاں اعمال اور نیکی کے لحاظ سے درجے ضرور ملتے ہیں۔ بھگوان کرشن گیتا کے نویں ادھیائے میں فرماتے ہیں کہ "میں سب ہستیوں میں یکساں طور پر موجود ہوں۔ نہ مجھے کسی سے رغبت ہے۔ نہ نفرت، جو سچی عقیدت مندی سے مجھ کو یاد کرتے ہیں وہ مجھ میں سماتے ہوئے ہیں۔ اور میں اُن کے اندر سمایا ہوا ہوں"۔ سچی عقیدت مندی سے یاد کرنا کیا ہوتا ہے۔ اس کے متعلق وہ ایک اور مقام پر لکھتے ہیں۔ کہ "جو شخص میرا جلوہ ہر ایک ہستی میں چمکتا ہوا دیکھتا ہے۔ اور مختلف ہستیوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ وہی حقیقت بین ہے۔ لہذا اس کو میں کبھی نہیں بھلاتا"۔

جو لوگ اپنے مالک کی سچی محبت سے سرشار ہوتے ہیں۔ اُن کی نظر میں یہ ظاہری امتیاز کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ تو قدم قدم پر جبینِ نیاز ٹیکتے ہیں۔ اور پاؤں ہی سے نہیں بلکہ راہِ محبت میں سر کے بل جاتے ہیں ؎

مجھے تو بے خودیٔ شوق میں منظور سجدہ تھا مجھے یہ ہوش ہی کب تھی کہ پیشانی کہاں رکھدی

سوال ہو سکتا ہے۔ کہ یہ تو بڑی ناواجب بات ہے۔ کہ انسان دوست و دشمن میں تمیز ہی نہ کرے۔ قدرتی طور پر جو انسان ہم سے اُنس کرتا ہے۔ وہ ہماری توجہ کا زیادہ مستحق ہے۔ یہ سوال ضرور صحیح ہے۔ لیکن دراصل نہایت ادنیٰ درجے کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ بعض لوگ ایک انسان کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور بعض ایسا نہیں سمجھتے اچھا جاننے والے لوگ دوست کے لقب سے پکارے جا سکتے ہیں۔ اور دوسری قسم کے لوگوں کو مخالف یا دشمن کہتے ہیں۔ لیکن حقیقت بین انسان اس بات کی پڑتال نہیں کرتا۔ کہ کون مجھے نیک سمجھتا ہے۔ اور کون بد۔ وہ ان کے خیالات کا جائزہ ہی نہیں لیتا۔ ان کے خیالات اُن کو مبارک رہیں۔ وہ ایسا نہیں سمجھتا بلکہ۔ اس سے اگر پوچھو کہ تمہارا کون دوست ہے۔ اور کون دشمن تو اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے ؎

سب میں جلوہ اسی کا کیا میں دیکھوں سُوئے دوست
میری نظروں میں ہے یکساں روئے دشمن روئے دوست (برقؔ)

ایسے حقیقت بین انسان کے لئے سب ہی دوست ہوتے ہیں۔ ایسی نگاہ رکھنے والے کے لئے دوست اور دشمن کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ؎

خوش بخت ہے وحدت کا جسے جام ملا کیا خُوب یہ سرکار سے انعام ملا
آنکھوں سے اُٹھا دئے دُوئی کے پردے
ہر رنگ میں بسملؔ ہے سری رام ملا (بسملؔ)

سچّی محبّت کے رنگ میں رنگے ہُوئے انسان نہ صرف یہ کہ انسان انسان میں تمیز نہیں کرتے۔ بلکہ ہر ایک انسان میں جلوہ الٰہی کی تجلّیاں دیکھتے ہیں ؎

دُوئی محال ہے اہلِ وجود کے نزدیک
تو جس کو کہتا ہے بندہ وُہی خُدا بھی ہے (اکبرؔ)

اہلِ نظر کے آئین میں وُہی سچّا خُدا دوست ہے۔ وُہی مالکِ کُل سے پیار کرنے والا ہے۔ وُہی حقیقی پربھُو بھگت کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کی ہی سچی عبادت اور بھگتی ہے جو اس مالک کو ہر ایک بشر کے اندر دیکھتا اور پہچانتا ہے۔ اگر ایسی حالت پیدا نہ ہُوئی۔ تو وُہ اپنے مولیٰ کا سچّا عاشق نہیں ہے ؎

ہر جان میں ہر بان میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے اگر اس کو تو ہر رنگ میں پہچان (نظیرؔ)

حقیقت بین انسان اس دُنیا کی چند روزہ زندگی کو بے حقیقت سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دُنیا ایک کاروانِ سرائے ہے۔ اُن کو یقین ہے۔ کہ یہ دُنیا ضرور چھوڑنی ہے۔ یہاں کا قیام عارضی ہے ؎

ایک دم سستانے کو ٹھہرا ہُوں چلنا ہے مجھے + ملکِ ہستی کو سمجھتا ہوں میں تکیہ راہ کا (آباد)

قرآن شریف میں موت کا نام یقین لکھا ہے۔ اس لئے کہ اور چیزوں میں خواہ کسی کو شک بھی ہو۔ لیکن موت کے آنے میں ہرگز شک نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک لازمی اور یقینی شے ہے۔ جس سے کوئی کہیں بھی بھاگ کر نہیں بچ سکتا۔ موت کی گرفت سے نہ کوئی بڑا بچ سکتا ہے۔ نہ چھوٹا۔ نہ کوئی شہ زور بچ سکتا ہے نہ کمزور نہ کوئی چکرورتی راجہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ نہ ایک کنگال ؎

مسکیں ہو گدا ہو یا ہو شاہِ ذی بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ
آہی جاتا ہے زندگی میں اک وقت
کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ (اکبر)

جب اس موت کے بعد کی حالت کو دیکھتے ہیں۔ تو ہمیں صاف نظر آتا ہے۔ کہ انسان انسان میں جو تمیز کی جا رہی ہے۔ یعنی پیشانی پر تلک لگانے والے اور جس کے ماتھے پر سجدہ کا نشان ہو۔ ان دونو کو جو مختلف ہستیاں سمجھا جاتا ہے یہ یہیں کی اُپج ہے۔ اسی دُنیا کی ایجاد ہے۔ اور یہیں کے ڈھکوسلے ہیں ؎

مرگ چوں آید ز جاں بے جاں کند ایں مراتب ہا ہمہ یکساں کند

ترجمہ: جب موت آکر جاندار کو بے جان کر دیتی ہے۔ تو یہاں کی درجہ بندیوں اور تمیزوں کو اڑا کر سب کو یکساں کر دیتی ہے۔

یہاں پر کوئی کہہ لے کہ وہ ایسا بڑا ہے یا اس کو ایسا جاہ و مرتبہ ملا ہے یا وہ ایسا عالی نژاد ہے۔ یا وہ اعلےٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یا وہ لاکھوں کی جائیداد کا مالک ہے۔ لیکن ؎

دکھالیں تزک و حشمت چار دن افلاک کے نیچے
شہنشاہ و گدا سب ایک سے ہیں خاک کے نیچے

جاؤ جا کر دیکھو قبرستان میں اور شمشان بھومی میں پہچانو وہاں کونسی ہڈی

بادشاہ کی ہے۔ اور کونسی دربدر پھرنے والے گدا کی۔ کیا اس وقت کوئی تمیز یا شناخت رہتی ہے؟ ؎

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے
خاک میں جب مل گئے دونو برابر ہو گئے (برقؔ)

وہ سب کا مالک سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔ سب کو اپنے بندے سمجھتا ہے۔ اُس کی نظر میں ہندو مسلمان کی کوئی تمیز نہیں۔ اُس کی رحمتیں سب کے لئے یکساں ہیں۔ اُس کے بنائے ہوئے سورج، ہوا، پانی اور آگ وغیرہ نہ ہندو کے لئے مخصوص ہیں۔ نہ مسلمان کی وراثت قرار دی گئی ہے ؎

سلوک تیرے ہیں سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہیں یا مسلماں
نہ ان سے کچھ تیرا بیر پایا نہ اُن سے کچھ تیرا پیار دیکھا

اُس مالک کو اپنی ہی واحد وراثت سمجھنا ہی بڑی نادانی ہے۔ وہ سب کا مولیٰ ہے۔ سب کا مالک ہے۔ سب کا محافظ ہے۔ اسلئے ؎

مرے اللہ مرے اللہ نہ کر صرف اللہ اللہ کر
یہ ہٹ دھرمی ہے اے زاہد خدا سب کا برابر ہے

ایسا سمجھ کر اصلیت پر نگاہ رکھنے والے اور انسانیت کے جوہر سے بہرہ ور انسان ہر ایک ہستی میں ایک ہی نور چمکتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اُن کو ہر ایک انسان کی شکل میں اپنا بھگوان نظر آتا ہے ؎

جلوۂ حق یوں نمایاں صورتِ انساں میں ہے
نورِ خورشیدِ فلک جیسے مہِ تاباں میں ہے

اس حقیقت کو سمجھنے والے کب کسی انسان کو غیر سمجھ کر اس سے نفرت کر سکتے ہیں۔ کب کسی سے بیر رکھ سکتے ہیں۔ کیا کوئی اپنے باپ کی تصویر کو بُرا کہہ سکتا ہے یا

اس کو نظرِ بد سے دیکھ سکتا ہے یا اس کی بے حرمتی کر سکتا ہے۔ اگر نہیں تو حقیقت بین انسان بھی ہر ایک انسان کو اس ذاتِ پاک کی صنعت کاری سمجھ کر اس سے محبّت کرتے ہیں ؎

ہم نے مخلوق میں خالق کی تجلّی پائی   دیکھ لی آئینہ میں آئینہ گر کی صورت

مالک کے سچے پیارے اس کے حقیقی جاننے والے جب اِدھر اُدھر نگاہ دوڑاتے ہیں۔ تو سوائے اس ذاتِ احدیت سمات کے انہیں کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ وُہ سب جگہ ہی برہم ورشن کرتے ہیں۔ ہر ایک نام اور شکل میں بلکہ ہر ایک خیال میں انہیں اسی ذاتِ پاک کا جلوہ نظر آتا ہے ؎

سراپا میں اس کے نظر کر کے تُم
جہاں دیکھو اللہ ہی اللہ ہے (میر)

جن کی آنکھوں میں اُس مالک کی تصویر سما جاتی ہے۔ بصیرت اُس تجلّی سے آشنا ہو جاتی ہے جن کی نگاہ رازِ حقیقت کو بھانپ لیتی ہے جن کی نظر سطح کو چھوڑ کر تہہ پر پہنچتی ہے۔ جو باطنی آنکھوں سے پسِ پردہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ؎

سمایا ہے تو جب سے نظروں میں میری
جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تُو ہی تُو ہے

لیکن مشکل یہ ہے۔ کہ انسان اس دید کو حاصل نہیں کرتا۔ اس بصیرت سے فیض یاب نہیں ہونا چاہتا۔ اس دریائے سُرور میں غوطے لگانا نہیں چاہتا۔ دُنیا ایک سی ہے۔ اس کے اندر سامان ایک سے ہیں۔ لیکن سارے انسان ان سے یکساں مستفید نہیں ہوتے۔ بچھڑا بھی گائے کے تھن سے مُنہ لگاتا ہے۔ اور جونک بھی تھن کے ساتھ چمٹتی ہے۔ بچھڑا اُس تھن میں سے دُودھ پیتا ہے۔ جونک خُون چوستی ہے۔ یہی حال دُنیا کے بندوں کا ہے۔ سارے انسان اپنے ہم جنسوں

کو دیکھتے ہیں لیکن ان میں سے بہت کم ہیں۔ جو ہر ایک انسان کو محبت کا چشمہ سمجھ کر اس سے پیار کر کے اس سے اپنا سُرور حاصل کر لیتے ہیں ؎

بشر کی صُورت و سیرت کا دیکھنے والا
نظر پڑا ہمیں لاکھوں میں کوئی انساں ایک (ریحاں)

اپنی اپنی عینک کے مطابق، اپنے اپنے دل کے رنگ کے مطابق انسان اس دُنیا کو دیکھتے ہیں ؎

گہر کو جوہری صَراف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کو دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

ورنہ اکثر انسان تو نفرت و غیریت کے جذبہ سے بھرے ہوئے دُوسروں کے لئے دُکھ کا باعث بنتے ہیں۔ اور اپنے دل کو جلتی ہوئی بھٹی کی طرح بنا کر خود بھی آرام اور چین سے سدا محرُوم رہتے ہیں۔ اپنے غرُور کے اندر اپنے تعصب کے اندر اپنی تنگ نظری کے اندر جکڑے ہُوئے خود بخود اپنے لئے دُکھ اور مصیبت پیدا کر لیتے ہیں۔ ایسے انسانوں کے لئے ایک اُردو شاعر نے کیا اچھا کہا ہے ؎

او بشر او خاک کے پُتلے تجھے اتنا غرور!
تیرے ہم جنس اور پھر تو ہی رہے ان سے نفور!
نشۂ زر نشۂ زر کی طرح کیوں چڑھ گیا
ہو گئی اُلٹی سمجھ کیوں کیا ہُوا تیرا شعُور؟
اَے بشر تجھ پر نہ ہوتا فضل گر اللہ کا
تجھ کو کب ملتی یہ عزت یہ شرافت یہ سُرور
کر خُدا کا شکر کیا تھا کیا سے کیا تو ہو گیا
جو ہو کرنا آج کر لے کل تو ہے مرنا ضرُور
ہو کے انساں پھر کرے تُو ہی جفا انسان پر
کیا یہی ہے آدمیت تیرے ہاں اَے بے شعور؟ (ذہین)

اس لئے اپنے غرُور، خودی، تعصب، تنگ نظری کو چھوڑ کر یہ سمجھ رکھنا چاہیئے۔ کہ انسان انسان کا بھائی ہے۔ سب انسان ایک ہی باپ کی اَولاد ہیں۔ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں۔ ایک ہی ساز کے تار ہیں۔ اور ایک ہی سُورج کی کرنیں ہیں وہ لوگ جو

ہندو اور مسلمان کی تمیز کرتے ہیں۔ وہ حقیقت سے بہت دور ہیں۔ حقیقتاً ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں رہ سکتے۔ ان کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ ان کا تعلق سورج اور کرن کا ہے ان کا واسطہ درخت اور سایہ کا ہے۔ جیسے یہ چیزیں ایک دوسرے کو ترک نہیں کر سکتیں اپنی باہمد گر علیحدہ علیحدہ نہیں ہو سکتیں، ایسے ہی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے اس علیحدگی کے خیال کو ہی دل سے اڑا دینا چاہیئے۔ ان کا علیحدہ علیحدہ رہنا امر موہوم ہے۔ ناممکن بات ہے۔ جو شخص ناممکن کو ممکن بنانے کے خیال میں ہے۔ یا اس کے لئے کوشش کرتا ہے۔ اسے تضیع اوقات اور ذلت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

گو کہیں منہ سے مسلماں ہم سے ہند و ہیں الگ
کیا ہوا ہونے بھریں ہندو اگر ہر سو الگ
ہو نہیں سکتے ہیں چہرے سے کبھی ابرو الگ
ہو الگ تو بھی نہیں ہے پھول سے خوشبو الگ

آئنے میں دو ہیں لیکن عکس و صورت ایک ہیں
جو بظاہر مختلف ہیں فی الحقیقت ایک ہیں (ارشد دہلوی)

جو لوگ امتیازوں کو وقعت دیتے ہیں۔ جو ان شریعتوں کے اختلاف کو وجہ نزاع و تکرار اور رغبت و نفرت ٹھہراتے ہیں۔ وہ فی الحقیقت ننگ انسانیت ہیں۔ وہ خدا کو محدود اور خدائی کو نابود کرنے کی کوشش میں ہیں۔ جو ہندو کہتے ہیں۔ کہ مسلمان اچھے نہیں۔ وہ دھرم کے دشمن ہیں۔ یا جن مسلمانوں کا خیال ہے۔ کہ ایمان ہمارے ہی حصے میں آیا ہے۔ اور سب کے سب ہندو کافر ہیں۔ ان سے میں ایک سوال کرتا ہوں۔ اور اس کے جواب باصواب کا منتظر رہوں گا ۔

دوستو میں نے یہ مانا کہ شریعت والے
کفر و ایماں کو برا اور بھلا کہتے ہیں
لیکن از راہِ طریقت ہے میرا سب سے سوال
جو کہ دونو سے بری ہو اسے کیا کہتے ہیں ؟

(باقی)

بتائیے کس گروہ یا ٹولے میں ایسے انسانوں کا شمار کروگے۔ جوان شریعتوں کے وہم سے بالاتر ہیں۔ اے پکے ہندو اور مسلمانو! کیا ایسے انسانوں کا بھی آپ کے خیال میں کہیں شمار ہوگا؟ کیا وہ بھی آپ کے نزدیک کسی گنتی میں آسکیں گے؟ کیا ایسے لوگوں کا بھی جن کو ہر ایک انسان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان ایک سمندر کی لہر دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے اندازہ میں کہیں ٹھکانہ ہے؟ یہ آزاد منش لوگ خدا کی مخلوق ہیں یا نہیں؟ سنو ؎

جو اندھیں اُس کے وہ نیار کھتے ہیں مشرب　　کر دیتے ہیں مذہب کو تو بالکل تہہ و بالا
رکھتے نہیں دونو سے سروکار یہ کچھ بھی　　مسجد ہو مسلماں کی کہ ہندو کا شوالا

ہے اور ہی سمرن یہ جپا کرتے ہیں جس کو
تسبیح کی حاجت ہے نہ درکار ہے مالا　　(وجاہت)

اے میرے بھولے بھائیو۔ کیوں غلطی میں پڑے ہو۔ اس ذاتِ باری نے سب انسانوں کو ایک طریق پر پیدا کیا ہے۔ ایک طریق سے ہی اُن کی پرورش کرتا ہے۔ ایک طرح کے اُن کو ناک، کان، مُنہ، آنکھ ملے ہیں۔ سب کو اُس کی نعمتیں یکساں حاصل ہیں۔ سارے کے سارے ایک ہی موت کا شکار ہوں گے۔ سب کے سب مرنے کے بعد ایک ہی خاک کے نیچے بچھونا لگائیں گے۔ پھر کیوں مفت میں اپنے لئے آزار سہیڑ رکھا ہے۔ کیوں اپنی یہ دُنیا اور آخرت دونو خراب کر رہے ہو۔ اس غلطی کو سمجھو۔ اس بھول سے خبردار ہو جاؤ۔ تنگ نظری چھوڑو۔ ذرا دل کو وسیع کردو۔ اور فراخدلی سے سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کے یہ شعر اس حقیقت کو سمجھ کر پڑھا کرو ؎

ہر جان میری جان ہے ہر ایک دل ہے دل مرا　　ہاں بلبل و گل مہر و ماہ کی آنکھ میں ہے تل مرا

ہندو مسلماں پارسی سکھ جین عیسائی یہود
ان سب کے سینوں میں دھڑکتا ایک سا ہے دل مرا

انسان اَور اُس کا خالق

نشاں کیا کیا دکھائے تُونے یارب بے نشاں ہوکر
عیاں کیا کچھ کیا ہے تُونے اَے خالق نہاں ہوکر

شری گورو گرنتھ صاحب کے اندر آتا ہے۔ کہ باپ کی نسبت بیٹا کیا جانتا ہے یا ایک بنی ہوئی چیز اپنے بنانے والے کی نسبت کیا کہہ سکتی ہے۔ یہی حالت انسان کی اپنے خالقِ باری کی نسبت کچھ کہنے کے متعلق ہے۔ اس کی ذاتِ بے نیاز کو احاطۂ تقریر وتحریر میں لانا ناممکن ہے۔ کیونکہ وُہ اتنی لطیف سے لطیف ہستی ہے۔ کہ اس کے اَوصاف احاطۂ بیان سے باہر ہیں۔ جو چیز خیال میں ہی نہ آسکتی ہو اُس کی نسبت انسان کیا کہہ یا لکھ سکتا ہے۔ اُس کی ذاتِ بابرکات محسُوس کرنے کی شے ہے۔ اَور وُہ بھی ایک خاص حالت میں پہنچ کر ہوتی ہے۔ ان عنصری حواس سے اُس کو سمجھنا یا سمجھانا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ حق تو یہ ہے۔ کہ اس بحرِ بے پایاں کی کوئی موج اس نورِ مطلق کی کچھ جھلک خاص خاص انسانوں کو جوکہ نیکی اَور عبادت کے پُتلے ہوتے ہیں۔ بڑی جانفشانی کے بعد محسُوس ہوتی ہے۔ تو پھر میرے جیسا گنہگار انسان جوکہ اس علم کی ابجد سے بھی آگاہ نہیں۔ اس ذاتِ عالی کے متعلق کیا عرض کرسکتا ہے ؎

کس ندانست کہ منزل گہِ آں یار کجا ست
ایں قدر ہست کہ بانگِ جرس می آید

ترجمہ:۔ کسی کو معلوم نہیں ہُوا۔ کہ اُس یار کی فرودگاہ کہاں ہے۔ ہاں اتنا تو ہے کہ ڈھول کی آواز آتی ہے۔

لیکن ایسا ہوتے ہُوئے بھی اپنے سب سے بڑے محسن۔ اپنے مولے۔ اپنے مالک اپنے خالق کے ان گنت احسانات اور عنایات کا۔ اس کی بے شمار رحمتوں اور نعمتوں کا ذکر نہ کرنا بھی ناشکر گذاری میں داخل ہے۔ ہاں اس کی توصیف کے لئے توفیق بھی اُسی سے مانگتے ہیں۔ زبان اور قلم تو عاجز ہیں۔ خیال کی دوڑ محدود ہے۔ پھر ایسی ہستیٔ بیکراں کے متعلق کچھ عرض کرنے کے لئے بھی اسی کے دربارِ عالی سے امداد کا ملتجی ہوتا ہُوں ؎

کمر کستا ہُوں تیرے نام پر مجھکو ہدائیت دے
سہارے پر ترے اُٹھتا ہُوں تیرا مدح خواں ہو کر
جہاں بھُولوں بتا جس جا بہک جاؤں ہدائیت کر
جو ہو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہرباں ہو کر

بھروسہ پر تیری امداد کے بیڑا اُٹھایا ہے
فلک کے بوجھ اُٹھانے پڑ رہا ہُوں ناتواں ہو کر

سب سے اوّل یہ عرض کرنا ہے۔ کہ اُس صانع حقیقی کی ہستی ایسے ہی ہویدا ہے اور چشمِ حقیقی رکھنے والوں کو اس کا وجُود اسی طرح سے ظاہر ہے۔ جیسے آفتاب نصف النہار لیکن اگر کوئی اپنی آنکھیں بند کرکے آفتاب کی ہستی سے انکار کردے یا آنکھوں میں مرض ہونے کی وجہ سے آنکھیں کھُل نہ سکیں۔ تو اس کو سمجھانا کسی شخص کے لئے بھی ممکن نہیں ہے دیکھنے والوں کے لئے تو پتہ پتہ ذرہ ذرہ وجُودِ باری کی ہستی کی شہادت دے رہا ہے۔ اگر ہم کسی جگہ پر گھاس پھوس اُگا ہُوا دیکھتے ہیں۔ تو اندازہ لگاتے ہیں۔ کہ یہ خود رَو ہے۔ لیکن اگر باقاعدہ دو دو فٹ کے فاصلہ پر پیڑ اور پودے لگے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ کہ یہ کسی ہاتھ کے لگائے ہُوئے ہیں۔ ایسے ہی قدرت کے اندر۔ اگر ہم قُدرت کی چیزوں میں بے قاعدگی پاتے تو شائد سمجھ لیتے کہ یہ خود بخود بن گئی ہیں۔ لیکن کائنات کے اندر ہر ایک چیز میں باقاعدگی پائی جاتی ہے۔ قُدرت کے اُصول اور اُس کا قانون ایسا باقاعدہ ہے کہ

ذاتِ باری کے وجود کو جبراً تسلیم کرواتا ہے۔ سورج کا اُصولِ مقرّرہ کے مطابق طلوع اور غروب ہونا۔ چاند کا گھٹنا۔ بڑھنا۔ اپنے اپنے وقت پر موسموں کا بدلنا۔ ہر ایک موسم کے مطابق مختلف نباتات کا نشوونما پانا۔ گندم کے بیج سے گندم ہی کا اُگنا۔ پانی کا نشیب کی طرف بہنا وغیرہ یہ ساری باتیں قانونِ قُدرت کی باقاعدگی کو پکار پکار کر بتا رہی ہیں۔ کسی انسان کی یا کسی ہستی کی کیا مجال کہ اُس قانون کے اندر ذرا بھی تبدیلی کر سکے۔ انسان بعض دفعہ اپنی نادانی سے خالقِ برتر کی ہستی سے منکر ہوتا ہے۔ یا شک میں پڑتا ہے۔ اتنی قدرت بھی نہیں رکھتا۔ کہ اپنے جسم سے اُکھڑا ہُوا ایک بال بھی پھر اسی جگہ پر لگا دے یا ایک پتّے کو توڑ کر پھر وہیں جما دے۔ بلاشُبہ خالقِ برتر کو یہ سب توفیق ہے۔ وُہی سب کا پیدا کرنے والا پرورش کرنے والا اور خاتمہ کرنے والا ہے ؎

کوئی ہے دُوسرا جو خاک کے پُتلے میں جی ڈالے؟ | یہ قدرت بھی کسی کو ہے کہ سب مخلوق کو پالے؟
کوئی انسان دو ساعت تو اپنی نبض ٹھہرا لے | عنانِ توسنِ عُمرِ گذشتہ پھر تو پلٹا لے

عدم سے لا نہیں سکتا ہے انساں ایک ذرّہ بھی
بنا سکتا نہیں کوئی بشر چھوٹی سی چڑیا بھی (احمدی)

اُس کی قُدرت کے طلسم دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ دُنیا میں کروڑوں انسان ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں، ناک، کان، آنکھ وغیرہ ایک سے ہوتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ باہمی ایک ایسا لطیف فرق ہے۔ کہ ہر ایک انسان کے چہرے کی بناوٹ اس کی آواز اس کی چال اس کے اعضاء کا تناسب ایک دُوسرے سے علیحدہ ہے۔ اور اسی اختلاف کی وجہ سے اس کی لاکھوں میں تمیز اور شناخت ہو سکتی ہے ؎

تری قدرت نے دکھائی ہے عجب نیرنگی
سب کئے تُو نے جُدا شکل میں انساں پیدا (آباد)

اگرچہ یہ قدرت کے اُصولوں کی باقاعدگی قدرت کی یہ گُوناگُوں گلکاری بجائے خود صانع ازلی کی ہستی کا بدیہی ثبوت ہے۔ لیکن پھر بھی اگر کسی کو عقلی دلائل کی ہی ضرورت ہو۔ تو ان کے عرض کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بعض صاحبان کا خیال ہے۔ کہ یہ کائنات ایک دورِ تسلسل سے چل رہی ہے یعنی بیج اور زمین کے ملنے سے نباتات اُگ آتی ہے۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ خالق کی موجودگی تب مانی جاسکتی ہے۔ کہ اگر وُہ تسلسل کو توڑ کر دکھا دے۔ اولاً تو جیسے اُوپر عرض ہُوا ہے۔ یہ کائنات کی باقاعدگی اور اس کے اندر مقررہ اصولوں کی موجودگی بجائے خود خالق کی ہستی کی ناطق ہے۔ اُس کے اُصولوں میں اگر ذرا بھی فرق آجائے۔ تو ایک منٹ کے لئے بھی یہ کائنات قائم نہ رہ سکے۔ مثلاً ہزاروں سیّارے اور ستارے آسمان کے اندر چکر لگا رہے ہیں۔ زمین گھوم رہی ہے۔ اگر یہ اپنے اپنے مقررہ رستے سے ایک سُوت بھر بھی اِدھر اُدھر ہو جائیں۔ تو آج ہی قیامت برپا ہو جائے لیکن یہ اس طرح سے اُس حکیم مطلق کے حکم سے قائم ہیں۔ کہ وہ اپنے چکر میں راستہ کی تبدیلی یا رفتار کی کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ ہے کوئی طاقت جو اُن کو اس طرح سے نکیل ڈال کر چلا سکے؟ بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ ایک دوسرے کی کشش سے اپنے مقررہ مقامات پر قائم رہ کر گھومتے ہیں۔ ما۔ لیکن وہ کشش کہاں سے آئی۔ اُس کا دینے والا کون ہے۔ پھر اُن لوگوں کا سوال بیج سے نباتات کی روئیدگی کے متعلق ہے وہ صاحب شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ کہ بعض حالات میں بیج بو یا ہُوا بھی روئیدگی اختیار نہیں کرتا یا اگ کر بڑھتا نہیں یا پھل پھول نہیں آتے محکمہ زراعت کے ماہرین و دیگر محققین بہتیرے قیاس دوڑاتے ہیں۔ تجربے کرتے ہیں۔ لیکن سبب دریافت نہیں کر سکتے۔ کبھی کچھ نتیجہ نکالتے ہیں کبھی کچھ مگر وہ نہیں جانتے کہ

کس راایں پردۂ قضا راہ نشد ؎ وز سرِ خدا ہیچ کس آگاہ نشد

ہر کس از سرِ قیاس چیزے می گفتند
معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نشد (سعدیؒ)

ترجمہ:۔ کوئی شخص قدرت کے طلسموں سے آگاہ نہیں ہو سکا۔ نہ کوئی اس مالکِ ازلی کے بھیدوں سے باخبر ہوا۔ ہر ایک شخص نے اپنے قیاس کے مطابق کچھ نہ کچھ کہا۔ لیکن حقیقت معلوم نہ ہوئی۔ وہ بھید اُسی طرح سے پردۂ راز میں رہے اُس کی قدرت کے عجائبات کہاں سمجھ میں آ سکتے ہیں ؎

زخارت گل آورد واز نافہ مشک
زر از کان و برگِ تر از چوبِ خشک (مولانا رومؒ)

ترجمہ:۔ وہ حکیم مطلق کانٹے سے پھول کو اور ناف سے مشک عنبر پیدا کرتا ہے۔ کانوں سے سونا۔ چاندی اور خشک لکڑی سے پتے۔

ہوا کا چلنا۔ پہاڑوں کا بلند چوٹیاں نکالنا۔ آسمان سے بارش کا ہونا سب باتیں اس کی قدرت کے عجائبات ہیں ؎

سلیقہ سے صبا جاروبی کی خدمت بجا لائے
قرینہ سے پہاڑوں کی قدر گل مینخیں گڑ وائے
قضا اسباب کی ڈوریں ہر اک سُو ٹھیک کھچوائے
اشارہ ہوتے ہی سقائے باراں مشکیں بھر لائے
جہاں جیسی ضرورت ہو کرے چھڑکاؤ تھم تھم کر
کہیں ہلکا سا چھینٹا دے برس جائے کہیں جم کر
بجز اس کے کوئی ہے بھی کہ برسادے کبھی پانی
دکھادے ابر کے دامن میں بجلی کی درخشانی (احمدی)

یہ بیابان۔ لق و دق صحرا سرسبز و شاداب پہاڑی علاقے۔ انواع و اقسام کے درخت پھل اور پھول کیا یہ سارے اس خالقِ ازلی کی بعید از فہم طاقت کو زبانِ حال سے نہیں پکار رہے ہیں ؎

جنگل سرسبز میل ہا میل
اشجار کی کیا شمار و تفصیل

کیا ہو سکے مجھ سے شرح و تاویل زیبا ہے یہاں بیانِ جبریل
اثمار لذیذ و رُوح پرور
بے غائث و انتہا مُیسّر
اللہ رے شیون پاک قُدرت ہر شے سے عیاں ہے اسکی حالت
جو جانتے ہیں نکاتِ حکمت ہر چیز سے پاتے ہیں نصیحت
سامع ہو تو ہر طرف صدا ہے
بینا کو نظارہ جا بجا ہے

مٹی اور پتھر کی کانوں سے سونا پیدا کرتا ہے۔ اور خشک لکڑی سے سبز پتے ایک ہی زمین میں مختلف بیجوں کو پانی پہنچ کر مختلف اثر دکھاتا ہے۔ دھتورے کے اندر زہر بنتا ہے۔ گنّے کے اندر میٹھا رس بنتا ہے۔ مولانا نے کہا ہے ؎

آب در غورہ ترش باشد ولیک چوں بانگورے رسد شیریں و نیک
باز در خُم او بود تلخ و حرام
در مقامِ سرکگی نعم الادام (مولانا رُومؒ)

ترجمہ:- کچّے انگور میں پانی ترش ہوتا ہے۔ وہی پانی پکّے انگور میں میٹھا اور لذیذ ہو جاتا ہے۔ وُہی پھر انگوری شراب کے اندر کڑوا اور حرام بن جاتا ہے لیکن سرکہ کی شکل میں ایک نعمت ہوتا ہے ؁

اس لئے قدرت کے عجائبات کو اور اس کی نیرنگیوں اور حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ ہم ہر ایک چیز کا اندازہ اپنی محدود عقل سے لگاتے ہیں۔ اور کوئیں کے مینڈک کی طرح جو کچھ ہماری سمجھ میں بیٹھتا ہے۔ اُس کو ہی علم کی حد سمجھتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ وُہ صانع مطلق یہ اصول نہ بناتا۔ کہ بارش بادلوں سے ہو اور اگر بارش بادلوں کے بغیر ہی ہو جاتی۔ تو ہم کسی وقت بھی خدشہ سے محفوظ نہ رہ سکتے۔

ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا ۔ کہ نہ جانے کس وقت آسمان سے پانی کی دھاریں بہنے لگ جائیں لیکن اب یہ قانونِ قُدرت ہمارے لئے کتنا اطمینان بخش ہے۔ کہ جب کبھی ہم ابر دیکھیں گے۔ تبھی بارش کے آنے کا امکان سمجھیں گے۔ اور اُس وقت ہر ایک شئے کو بھیگنے سے بچانے کا ضرور تردد کریں گے۔ اگر مختلف چیزوں کے اندر خاص خاص خاصتیں نہ رکھی جاتیں۔ تو کتنی گڑبڑ ہوتی۔ سنکھیا سمِ قاتل ہے۔ شہد موجبِ شفا ہے۔ تجربہ اور علم کی برکت سے ہم سنکھیئے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور شہد سے رغبت رکھتے ہیں۔ اگر قانونِ قُدرت اٹل نہ ہو۔ اور شہد کبھی شفا دینے والی خاصیت رکھے۔ اور کبھی زہر قاتل بن جائے۔ تو کسی چیز کو بھی ہم اطمینان سے استعمال میں نہیں لاسکیں گے۔ پس اس حکیمِ مطلق نے جو خواص ہر ایک چیز اور جسم کے اندر رکھے ہیں۔ اس سے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ ان کے بغیر ہماری زندگی بڑے خطرے میں رہتی اور ہمیشہ دغدغہ لگا رہتا۔

ہر ایک چیز کا دورِ تسلسل بھی نہیں چلتا۔ کئی خاندانوں کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ کئی قسم کے جانور اور پرند جن کا وجود ایک وقت میں تھا۔ اب ختم ہو چکے ہیں۔ کئی درختوں اور نباتات کا یہی حال ہے۔ سمندر اور زمین کی تہ میں سے ایسے جانوروں کی ہڈیوں وغیرہ کو دیکھ کر سائینس دان لوگ ہم کو ایسا بتاتے ہیں۔ اندریں حالات یہ اعتراض کہ اس کائنات کا سلسلہ از خود چل رہا ہے۔ بے معنی معلوم ہوتا ہے خاص کر یہ بات قابلِ غور ہے۔ کہ عناصر جن کی باہمی آمیزش سے کائنات کا تسلسل ظہور میں آتا ہے۔ نہ تو اپنی ذات سے قائم ہیں۔ اور نہ اس کے آئندہ قیام کی طاقت رکھتے ہیں۔ یعنی انہیں نہ ارادہ ہے نہ استعداد۔ نہ وہ اپنے خواص کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اور نہ کسی خاص حکم کی تعمیل کا انصرام ان سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً پانی ایک نشیب میں پڑا ہوا آگے نہیں چل سکتا۔ جب تک کہ اس کو اور زیادہ نشیب کی جگہ نہ ملے

آگ بغیر رگڑ کے پیدا نہیں ہوتی۔ بغیر ایندھن کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اس لئے مادی اشیاء سب مجبور اور ماتحت ہیں۔ انسان ہر ایک مادی شے پر قادر نہیں ہے۔ اس لئے اس سارے سلسلۂ کائنات کو چلانے والا قادرِ مطلق کے سوا اور دوسرا کوئی نہیں ہے۔ زمین ہو جائے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے گر نہ تو تھامے تمام ہی لطف پشتہ بن رہا ہے آسمانوں کا

ارادہ سے تیرے قائم ہے ہر اک سا سلسلہ ورنہ
مدبّر جسم کا پھر کون حافظ کون جانوں کا

بعض اصحاب یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ خدا محسوس نہیں ہوتا۔ پھر ہم کیسے جان لیں۔ کہ وہ ہے۔ اس کے متعلق ایک اور باب میں پہلے بھی کچھ عرض ہو چکا ہے۔ کچھ اور بھی گذارش کرتا ہوں۔ اوّل تو ذاتِ باری کے متعلق کسی دنیاوی چیز سے تشبیہ دے کر موازنہ کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ ایسی بے مثال ذات ہے۔ کہ جس کے کسی وصف کا بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو مثالیں عرض ہوتی ہیں۔ وہ صرف ایک حد تک ہی اصلی غرض کو پورا کرتی ہیں۔ یہ کہنا کہ جو چیز محسوس نہ ہو۔ وہ وجود ہی نہیں رکھتی۔ ایک بڑی بھاری بھول ہے۔ دنیا کے اندر بھی کئی چیزیں ہیں۔ کہ جن کو حواس سے نہیں جان سکتے لیکن وہ موجود ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص عقلمند ہے۔ دانا ہے۔ خردمند ہے۔ اور فلاں شخص جاہل یا بے عقل ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ کس حس سے اُن شخصوں کی عقل کو جانچا گیا ہے۔ کس پیمانہ سے اُن کی عقل کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ تو کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ ان کی عقل کا اندازہ اُن کے افعال کو دیکھ کر لگایا گیا ہے۔ جو آدمی سوچ وچار کے بعد سلیقے سے پس و پیش کا خیال کر کے کام کرتا ہے اُس کو عاقل کہہ دیتے ہیں اور جو شخص اندھا دھند نتیجہ سوچنے کے بغیر جلد بازی سے کام کرتا ہے۔ اُس کو بے وقوف کہتے ہیں۔ یعنی اُن کے افعال ہی اُن کی عقل کی کسوٹی ہیں۔ حالانکہ اور کسی طرح سے عقل کا ادراک تصور میں نہیں آسکتا۔ کیونکہ یہ جسمانی

طور پر محسوس نہیں ہو سکتی۔ سو کشم یعنی لطیف ہے۔ اس طرح سے اس ذاتِ پاک کے کاموں کو دیکھ کر اُس کی موجودگی کا کوئی شک نہیں رہتا۔ چاند اور سورج کو کس نے چمک دی۔ دن کے بعد رات اور رات کے وقت اندھیرا کون کرتا ہے۔ بجلی کے اندر تڑپ۔ چمک اور تیزی کہاں سے آئی۔ بادلوں سے پانی کون برساتا ہے۔ سمندری اور ہوائی مخلوق کو خوراک کون مہیا کرتا ہے۔ انسان کو دیکھنے۔ بولنے اور سُننے کی طاقت کس نے دی۔ ننھے سے بیج میں سے اتنا ننا ور درخت کون بناتا ہے۔ ماں کے پیٹ کے اندر بچے کی خوراک کا انتظام کون کرتا ہے۔ مقناطیس میں کشش کس نے رکھی۔ پسّو اور اس سے بھی کم تر مخلوق کے اندر سانس چلنے اور جان رکھنے کا انتظام کس نے کیا۔ یہ وُہی ذاتِ عالی ہے۔ جو یہ سب کام کرتی ہے۔ اُسی نے اناجوں میں غذائیت اور پھلوں میں ذائقہ پیدا کیا۔ اُسی نے ہر ایک چیز کے اندر علیحدہ علیحدہ خواص پیدا کئے ہیں۔ اُسی نے انسان کو عقل بخشی۔ کہ جس سے وہ حیران کر دینے والے کام کر کے دکھا سکتا ہے۔ ان سب چیزوں میں تصرّف کی طاقت اس صانعِ مطلق کے سوا کس کو ہے۔ وُہ اُسی کی انصافِ مجسّم ذات ہے کہ جس کے سامنے ایک شہنشاہ اور فقیر ایک درجہ رکھتے ہیں۔ ایک ہاتھی اور ایک پشہ مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ایک سی جان سب کو بخشی ہے۔ اور قُدرت کی چیزوں کے استعمال کا حق بھی ان سب کو یکساں ہے۔ اُسی کے خوانِ نعمت سے انسان۔ حیوان۔ چرند۔ پرند۔ کیڑے مکوڑے اور دیگر حشرات الارض پل رہے ہیں ؎

تو ہے اجسام کا خالق مربّی تو ہے جانوں کا
ترے خوانِ کرم پر جمگھٹا ہے مہمانوں کا

وُہ پتھر میں بیٹھے ہوئے کیڑے کی بھی سنبھال رکھتا ہے۔ وُہ علّام الغیوب اور قادرِ مطلق ہے۔ ہر جاندار کا ربّ اور روزی رساں ہے ؎

اقرار کیا کیڑے نے پتھر سے نکل کر	رازق کی عنایت میں ہوا شک جو کسی کو

بچہ کی پیدائش سے پہلے اس کے لئے خوراک مہیا کی جاتی ہے۔ اس کا رزق اُس کی ماں کی چھاتیوں میں دُودھ کی شکل میں پہلے ہی طیار ہو جاتا ہے۔ وہ بچہ جو کئی مہینوں تک کسی چیز کا بھی ہوش نہیں رکھتا۔ اپنے رزق کا شعور لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور پیدا ہوتے ہی سنبھال لیتا ہے ؎

غمِ روزی مخور برہم مزن اوراقِ دفتر را
کہ پیش از طفل ایزد پُر کند پستانِ مادر را

ترجمہ:۔ اے انسان اپنی روزی کے لئے پریشان مت ہو۔ اور کھلبلی مت مچا۔ کیونکہ دیکھ بچے کی پیدائش سے پہلے ہی وُہ رزّاق ماں کی چھاتیوں کو دُودھ سے بھر دیتا ہے ۔

تُلسی داس جی نے بھی کہا ہے ؎

تُلسی بات اچرج ہے من نہ باندھے دھیر	پہلے بنی پراربدھ پاچھے بنا شریر

اس صانعِ ازل کے وجُود سے اس جہان کے نقشہ کو اور اس کائنات کے انتظام کو اور اس جہان کی چیزوں کو دیکھنے کے بعد کون مُنکر ہو سکتا ہے ؎

ظہورِ آدم دکھا رہا ہے کہ دِل میں ہے کوئی آنیوالا	نظامِ عالم بتا رہا ہے کوئی ہے اسکا بنانیوالا

نسیمِ مستانہ چل رہی ہے چمن میں پھر رُت بدل رہی ہے
صدا یہ دل سے نکل رہی ہے وہی ہے یہ گل کھلانیوالا	(اکبرؔ)

ایک شاعر نے ایک نظم میں اس بات کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے ؎

کوئی بانی نہیں دُنیا کا اس بانی سے باز آؤ	کہا اِک سادہ دِل نے فکر و حیرانی سے باز آؤ
جو ہوتا کوئی بانی دیکھتے اُس کو کبھی تو ہم	مہیا خود بخود سامان ہوتے رہتے ہیں ہر دم
نظر آنا ہر اک موجُود شے کا شرط ہو کیونکر	کہا اُس سادہ دِل سے بند کج فہمی کا کر دفتر

کبھی آنکھوں سے تُو نے عقل بھی دیکھی ہے اَے مضطر کبھی قوت بھی دیکھی ہے مجسّم اندر اور باہر
یہ ہیں لیکن نظر آتی نہیں کیسے اچنبھا ہے مگر کیا اُنکے ہونے میں ذرا بھی تجھکو شبہا ہے

پھر اس بانی کے تو ہونے سے منکر ہے خطا پر ہے
ترے سر کی قسم ناداں ہے جھوٹے اِدّعا پر ہے (احمدی)

حیرانی کی بات ہے۔ کہ انسان جو اس ذاتِ مقدّس کے متعلّق اتنے تشکوک کرتا ہے۔ اور اُس ذاتِ لطیف کو اپنی کثیف حواس سے نہ جان کر معترض ہوتا ہے اُسے تو اپنے متعلق بھی کوئی علم نہیں ہے۔ اُس سے پُوچھنا چاہیئے ؎

اس فلسفی کو کہئے کچھ اپنی بھی ہے خبر
جس کو ہزار شک ہیں خدا کی صفات پر (اکبر)

بعض بھائی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ اگر وُہ خالق برتر ہر ایک چیز پر قادر ہے تو دُنیا میں اتنے دُکھ کیوں ہیں۔ جھگڑے فساد کیوں ہیں۔ وُہ یہ سارے جھگڑے کیوں نہیں مٹا دیتا۔ اور ساری خلقت کو کیوں سُکھی نہیں کر دیتا۔ یہ اعتراض کوئی وزن دار نہیں ہے۔ اُس مالکِ کُل نے جُملہ اشیاء کے اندر خواص رکھ کر اور انسانوں کو اُن کے جاننے کی عقل دے کر۔ اپنے بھلے اور بُرے کی تمیز سکھا کر سُکھ اور دُکھ کا رستہ دکھا دیا ہے۔ اب جو انسان جانتا بُوجھتا ہُوا آنکھیں بند کر کے کُوئیں میں گرے یا آگ میں ہاتھ ڈالے تو اس میں اُس کا اپنا قصور ہے۔ آگ روٹی پکانے کے بھی کام آتی ہے۔ اور گھر بھی اُسی سے جلائے جاتے ہیں۔ اس کا مفید اور مُضر ہونا اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ ایسے ہی انسان اپنی عقل کا اچھا یا بُرا استعمال کر کے اپنے لئے آرام یا تکلیف کے سامان پیدا کر سکتا ہے۔

جو کچھ اُوپر عرض ہُوا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے۔ کہ کائنات کے نظام کو چلانے والی اور اُس کو اُصول میں باندھ کر رکھنے والی اور اُن میں حسب موقعہ تصرّف

کرنے والی ایک اعلیٰ طاقت ہے۔اب یہ سوال ہو سکتا ہے۔کہ وُہ طاقت جس کے ہزاروں کروڑوں نام ہیں۔کس طرح کی ہے؟ اور آیا اُس کو کسی طرح سے جانا بھی جا سکتا ہے۔یہ بتانا کہ وُہ ذات کس قسم کی ہے۔اُس کے صفات کیا کیا ہیں۔یہ تو ممکن نہیں۔کیونکہ وُہ مالک آپ ہی جانتا ہے۔کہ وُہ کیا ہے یا شائد کچھ کچھ وُہ نیک انسان جان سکتے ہیں۔جنہوں نے اپنا تن من اَور دھن سب کچھ قربان کرکے اُس کی حقیقت دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ان لوگوں میں اکثر تو ایسے ہیں۔کہ جس وقت وُہ نور سے واصل ہوتے ہیں۔تو چُپ لگا لیتے ہیں۔اور اُن پر یہی بات صادق آتی ہے ؎

بھیکھا بات اگم کی کہن سُنن کی نا نہہ
جو جانے سو کہے نہیں کہے سو جانے نا نہہ

ترجمہ:۔بھگت بھیکھا جی فرماتے ہیں۔کہ اُس کی ذات بے پایاں ہے کہنے سُننے میں نہیں آسکتی۔جو اُس کو جان لیتے ہیں وُہ کہتے نہیں۔اور جو اُس کی نسبت کچھ کہتے ہیں۔وہ ز ر حقیقت جانتے نہیں۔فارسی شاعر نے کہا ہے ؎

ستانی زباں از رقیباں راز   کہ تا رازِ سلطاں نگویند باز

تاہم بعض بعض جیون مُکت انسان (REALIZED MEN) یعنی ایسی خدا رسیدہ ہستیاں جنہوں نے اس زندگی میں ہی اُس نُورِ مُطلق کے پرتو کی جھلک دیکھ پائی ہے۔اُس بے نیاز کی نسبت کچھ کچھ کہتے ہیں لیکن وُہ اصل حقیقت کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا۔ساری مذہبی کتابیں اور ساری مقدّس ہستیاں آجتک اُس کے متعلق کہتی ہی چلی آئی ہیں۔لیکن اُن کا کہنا اب تک ختم نہیں ہُوا۔اور آخر اُن کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا   اس جا ہے بے زباں دہن قال و قیل کا
(ظفر)

جیسے اُوپر عرض ہُوا ہے۔ حقیقت میں تو انسان اُس ذاتِ برتر کی نسبت کہنے سے بالکل قاصر ہے۔ کیونکہ اُس کی عقل، اُس کا علم، اُس کی طاقت، سب محدود ہیں ؎

کس کو طاقت ہے کہ تیرا مدح خواں ہووے کریم
آپ ہی حامد ہے تو اور آپ ہی محمود ہے
(جوشؔ)

جب اُس ذاتِ باری کے اوصاف کو خیال کے اندر ہی نہیں لایا جا سکتا تو بیان کس طرح سے ممکن ہے۔ خیال کی دوڑ بھی محدود ہے۔ یہ خیال بھی ایک خاص مقام تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ اور وہاں ویدِ مقدس کے الفاظ میں "نیتی نیتی" کہنا پڑتا ہے۔ یعنی "اتنا ہی نہیں"۔ "اتنا ہی نہیں" ؎

تُو ہے خیال سے بلند تیرا خیال ہو تو کیا
تیری صفت میں عقل کو لافِ کمال ہو تو کیا
تیرا حریمِ ناز جب اُونچا ہو لامکاں سے
لاکھ بلند و تیز رَو مرغِ خیال ہو تو کیا
(قوی امروہی)

وید اور اُپنشدوں کے اندر یہ بھی لکھا ہے۔ کہ پربھو زبان کی قوتِ بیان اور ہاتھوں کی طاقتِ گرفت سے پرے ہے۔ نہ جسم نہ رنگ، نہ آنکھیں رکھتا ہے۔ اور نہ پاؤں۔ ہر زمانہ میں موجود۔ ہر جگہ پر ظاہر، ہر مقام پر پہنچنے کی قدرت والا۔ لطیف ترین، غیر فانی اور لامثال ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ ہزاروں سروں والا ہزاروں آنکھوں والا۔ ہزاروں کانوں، ہاتھوں اور پاؤں والا ہے۔ بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا، دُور سے دُور۔ نزدیک سے نزدیک۔ باہر بھی ہے اندر بھی ہے۔ سارے نوروں کا نُور ہے۔

قرآن شریف کی سُورت شوریٰ کے رکوع ۲ میں آیا ہے۔ کہ کسی چیز کو اس سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ سُورت کہف میں آیا ہے۔ کہ اگر سارے سمندروں کو سیاہی کی شکل میں بدل لیا جائے۔ تو وہ سیاہی ختم ہو جائے گی

لیکن اُس کی صفت ختم نہیں ہوگی۔ سُورت لقمان میں آیا ہے۔ کہ سارے درختوں کو اگر قلم بنایا جاوے اور سارے سُمندروں کو سیاہی۔ تو یہ سب ختم ہو جائیں گے لیکن ربِّ اعلیٰ کی تعریف ختم نہ ہوگی۔ پھر سُورت بقر کے رکُوع نمبر ۳۴ کی آئتِ کُرسی میں آیا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ رہنے والا اور ہمیشہ قائم ہے۔ نیند یا اُونگھ اُس کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ کوئی سفارش اُس کے سامنے نہیں چلتی۔ جو کچھ ہمارے آگے پیچھے ہے۔ اُس کو وُہ جانتا ہے سُورۃِ حدید میں آیا ہے۔ کہ وُہی اوّل ہے۔ وُہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے۔ وہی باطن ہے وغیرہ وغیرہ۔

وید اور اُپنشدوں کی طرح گورو گرنتھ صاحب میں بھی لکھا ہے:۔

سورٹھ محلّہ پہلا

الکھ اپار اگم اگوچر نہ تِس کال نہ کرما
جاتی اجاتی اجونی سمبھو نہ تس بھاؤ نہ بھرما

تبھی تو کہا ہے ؎

تقریر سے وُہ فزوں بیان سے باہر اوراک سے وُہ پرے گمان سے باہر
اندر باہر ہے وُہ نہ پیدا پنہاں
ہے سرحدِ مکاں ولامکاں سے باہر
(اسمٰعیل)

اور بھی کہا ہے ؎

تصوّر تیری ذات کا ہے محال کیسے یہ سکت اور کہاں یہ مجال
جو ہوتی مشابہ تیرے کوئی چیز تو کچھ کام کرتی سمجھ یا تمیز
سمجھ کیا ہے اور کیا سمجھ کی بساط
سمندر سے قطرے کو کیسا ارتباط
(اسمٰعیل)

خیال عقل۔ اندازہ۔ بچار سب سے کام لے کر یہی کہنا پڑتا ہے ؎

اُس ذات کی غائت کو کوئی پا نہیں سکتا کیسا ہے کہاں ہے کوئی بتلا نہیں سکتا
اوجِ نظر اس نور کو دکھلا نہیں سکتا آغوشِ تصور اُسے ٹھہرا نہیں سکتا
یہ علم اُسی ذات کو ہو گا کہ وُہ کیا ہے
ہم صرف یہ سمجھے ہیں وُہ بے مثل خُدا ہے
(احمدی)

اگرچہ اُس کی ذات کی نسبت کچھ جانا یا کہا نہیں جا سکتا۔ تاہم اس میں بھی کوئی شک نہیں۔ کہ کوئی چیز اور کوئی جگہ اُس سے خالی نہیں سہ

خورشیدِ درخشاں میں چمک تیری ہے اور گوہرِ مرصع میں دمک تیری ہے
ہیں کون و مکاں نور سے تیرے پُر نور
ہر ذرۂ تاباں میں چمک تیری ہے
(شاکر)

باوصف اس بات کے کہ اُس کی نہ کوئی شکل ہے۔ نہ کوئی جسم ہے نہ کوئی رنگ ہے نہ رُوپ ہے۔ وُہ ذرّے ذرّے میں۔ کوہ و دشت میں۔ پتّے پتّے میں جلوہ نما ہے سہ

تنہا نہ اُسے اپنے دلِ تنگ میں پہچان ہر باغ میں ہر دشت میں ہر سنگ میں پہچان
بے رنگ میں با رنگ میں نیرنگ میں پہچان منزل میں مقامات میں فرسنگ میں پہچان
نت روم میں اور ہند میں اور زنگ میں پہچان ہر راہ میں ہر ساتھ میں ہر سنگ میں پہچان
ہر عزم ارادے میں ہر آہنگ میں پہچان ہر دھوم میں ہر صُلح میں ہر جنگ میں پہچان
ہر آن میں ہر بات میں ہر ڈھنگ میں پہچان
عاشق ہے تو دلبر کو ہر اک رنگ میں پہچان

جب وُہ مالک ہر جائی ہے۔ ہر جگہ موجود ہے۔ تو اس سے واصل ہونے کے لئے کیا طریقہ ہے۔ کس طرح سے وہ جانا جا سکتا ہے؟ انسان کے پاس مادی اشیاء کی ماہیت کو جاننے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ اس کی عقل و دانش یا

بڑھی ہے لیکن ؎

جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
سُن سُن کے مسکراتا ہے دیوانہ آپ کا (شاد)

پھر کیا اُس ذات کی پہچان زیادہ لکھنے پڑھنے سے یا کافی علم حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے۔ دُنیا کی باقی چیزوں کی اصلیّت تو علم حاصل کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے لیکن اس مُدّعا کو علم بھی پُورا نہیں کرتا۔ وُہ کہاں تک لے جاتا ہے ؎

علومِ دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا (اکبر)

بلکہ زیادہ پڑھنا لکھنا اور اُس ذاتِ پاک کی پہچان کے لئے زیادہ علم حاصل کرنا بعض دفعہ اُلٹے نتائج پیدا کرتا ہے یعنی ؎

بڑھتا جاتا ہے جس قدر علمِ بشر کرتے جاتے ہیں تنگ خیالات میں گھر
ہوتی جاتی ہے دھندلی اتنی فضا
جتنی کہ وسیع ہوتی جاتی ہے نظر (حالی)

تو پھر شائد فلسفہ دان لوگ اپنے فلسفہ کے زور سے اس کو جان سکتے ہوں کیونکہ فلسفہ واقعی بال کی کھال نکالتا ہے۔ بڑی باریکیوں تک لے جاتا ہے۔ بات کی تہہ کو پہنچنے کے لئے مدد کرتا ہے۔ تو پھر کیا اُس ذات کی پہچان فلسفہ سے ہو سکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خُدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں (اکبر)

دلیل ایک زبردست ہتھیار ہے۔ جو بات اور کسی طرح سے سمجھ میں نہ آئے وہ دلیل سے سمجھی جا سکتی ہے جس مسئلہ کی تائید میں دلیل پیش کر دی جائے وُہ

حل ہو جاتا ہے۔ تو کیا دلیل سے اُس بھگوان کو جان سکتے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کیونکہ

دلیلیں دل میں پیدا نورِ باطن کر نہیں سکتیں
کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں (اکبرؔ)

بلاشبہ اس راہ میں عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ بے شک دلیلیں، فلسفے۔ ذہنی اور عقلی پھیلاؤ اس منزل کے ساتھی نہیں۔ ان سے تو اُس ذاتِ باری کو عار ہے۔ جو چالاکی اور ہوشیاری سے اس دربار میں داخل ہونا چاہے۔ وہ باریابی نہیں پاسکتا تو پھر وہاں داخلہ کس طرح ہوتا ہے؟ کب وُہ ذاتِ اعلیٰ اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے؟

سب کے سب باہر ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردہ کر دیا (اکبرؔ)

جب تک نری عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ اس وقت تک اُس تجلّی کے سامنے ایک ڈراپ سین رہتا ہے۔ پردہ پڑا رہتا ہے لیکن جس وقت سالک سب سہارے چھوڑ کر کہتا ہے اے میرے مالک میری عقل مجھ کو کام نہیں دیتی عقل نے مجھے تو پریشان کر دیا۔ دماغ چکرا رہا ہے۔ میں اب عقل و دماغ کا بھروسہ چھوڑتا ہوں۔ تو آپ ہی اپنے کرم سے اس پردے کو ہٹا۔ تب کیا ہوتا ہے

چشمِ خرد سے عار تھا حُسنِ جنوں پسند کو
عقل نے آنکھ بند کی اُس نے حجاب اُٹھا دیا

اس بازار کا۔ اس منڈی کا۔ اس منزل کا اصول ہی مختلف ہے۔ جہاں دُنیا کے اندر زیادہ عقلمند آدمی زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ وہاں اس راہ پر کیا حال ہے

دیوانہ ہے اس رہ میں جو دیوانہ نہیں ہے
عاقل وہی ہوتا ہے جو عاقل نہیں ہوتا

اس ذاتِ لطیف کی دید سے بہرہ ور ہونے کے لئے پہلے تو ہوشیاری کو چھوڑنا ہوگا۔ پھر وُہ نظر پیدا کرنی ہوگی۔ وُہ بصیرت حاصل کرنی ہوگی۔ جس سے اس نُور کی جھلک دیکھی جاسکے ؎

جہاں جلوے سے اس محبوب کے یکسر لبالب ہے
نظر پیدا تو کر اوّل تماشہ دیکھ قُدرت کا

ہم اُس ذاتِ باری سے دُور نہیں۔ وُہ ذات ہم سے دُور نہیں۔ تعارف کی ضُرورت ہے۔ تعارف کے لئے خواہشِ صادق کی ضُرورت ہے ؎

اگر ہے دید کی خواہش نگاہِ شوق پیدا کر
نہ تُو باہر ہے عالم سے نہ وُہ بیروں ہے دنیا سے

وُہ آنکھ کہ جس سے اس ذات کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں۔ باہر نہیں ہے باطن میں ہے۔ باہر کی آنکھیں دُنیاوی چیزوں میں لگائے رکھنے سے باطن کی آنکھ وا نہیں ہوتی۔ ان باہر کی آنکھوں کو دُنیا کی طرف سے ہٹانا ہوگا۔ پھر چشمِ بصیرت اپنا وظیفہ خود عمل میں لائے گی ؎

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

باطن کی آنکھ کو کھولنے کے لئے سب سے پہلے یہ لازمی ہے۔ کہ انسان خُودی سے پاک ہو۔ جب تک وُہ اپنے آپ کو دیکھتا رہے گا۔ تب تک باطن کی آنکھ کور رہے گی۔ اس میں اندر دیکھنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی۔ وُہ اس قابل نہ ہوگی۔ کہ تجلّی کو دیکھ سکے ؎

ملا ہے ہم کو یہ مضمونِ روشن بینا سے
کہ چھوڑی جس نے خود بینی اُسے سب کچھ نظر آیا

اس کے بعد ایک اور زبردست پٹی اس آنکھ پر رہ جاتی ہے۔ اور جب تک وُہ نہ اُترے ۔چشمِ باطن وا نہیں ہوتی ۔وُہ پٹی ہے غیریت کی ۔دُوئی کی ۔ یہ پٹی ایسی مضبوط اور سیاہ رنگ کی ہے ۔کہ اُس کے اندر سے تو اس نور کی ایک شُعاع بھی نہیں جاسکتی ۔جب تک یہ پردہ یہ پٹی علیحدہ نہ کی جائے ۔تب تک دیدار ناممکن ہے

خُوب ڈھونڈا خُوب دیکھا کچھ نظر آیا نہیں
آجتک اپنے میں ہم نے آپ کو پایا نہیں
چشمِ ظاہر بیں سے تو دیکھا نہیں جانا ہے یار
تمنے بھی اے دِل کی آنکھو! اُسکو دکھایا نہیں
ہو مُیسّر کیونکر اس پردہ نشیں کا دیکھنا
ہے جو پردہ درمیاں وُہ اُس نے اُٹھوایا نہیں (ظفرؔ)

بھائی یہ بات تو پتھر کی لکیر سمجھو ۔سولہ آنے دُرست اور سو فیصدی ٹھیک سمجھ لو ۔کہ جب تک غیریت دِل میں رہے گی ۔جب تک ہندو ۔ مسلمان ۔سِکھ ۔ عیسائی کی باہمی غیریت دل کے اندر قائم رہے گی ۔جب تک کافر اور ملیچھ کا خیال دل میں بیٹھا رہے گا ۔جلوۂ الٰہی کا دیکھنا ناممکن ۔ناممکن سراسر ناممکن ۔ ایک زندگی میں کیا لاکھوں زندگیوں میں ناممکن ہے

چشمِ حق بیں کو جہاں میں کفر سے کیا کام ہے
ہر صنم خانہ نظر میں کعبۂ اسلام ہے (برقؔ لکھنوی)

ہاں ان غیریت کے خیالات کو دل میں مضبوط کرنے سے اور ان کو عمل میں لانے سے شائد سرکاری نوکریاں زیادہ مل جائیں ۔کونسل اور کمیٹی کے اندر ایک آدھ ممبری اور حاصل ہو جائے ۔یا چند ٹکڑے روٹی کے زیادہ ہاتھ آجائیں لیکن مالک کی دید ۔توبہ! توبہ! نورِ الٰہی کی جھلک تو اُن خیالات کے آنے ہی کوسوں دُور جا پڑتی ہے ۔یہ دونو متضاد باتیں ہیں ۔ان میں بُعد المشرقین ہے ۔یہ ضدّیں ہیں ؎

آئینہ کو بس صفائی نے دکھایا روئے دوست
دُور کر دل کی کدورت محو ہو دیدار کا

دل کے اندر ایسی صفائی ہونی چاہیئے۔ کہ اس میں دُوئی کی ذرا بھی میل نہ رہے۔ یعنی ہر ایک انسان کے اندر اُسی مالک کا جلوہ نظر آتے غیریت کا نام ونشان نہ رہے۔ آئینۂ دِل کے اُوپر دُوئی کا ذرا سا بھی زنگ نہ رہ جائے۔ کیونکہ ؎

جمع میں افرادِ عالم ایک ہیں
گل کے سب اوراقِ برہم ایک ہیں
ہووے کب وحدت میں کثرت سے خلل
جسم وجاں گو دو ہیں پر ہم ایک ہیں (درد)

مالک نے تو ایک ہی شبد سے ایک ہی "کن" کے کہنے سے سب کو پیدا کیا ہے۔ ہم اپنی جہالت سے یا خود غرضی سے خواہ کسی قسم کی تمیزیں کھڑی کرلیں ؎

جب دونو کی خلقت ہوئی اک 'کن' کی صدا پر
پھر شیخ میں کیا ہے جو برہمن میں نہیں ہے (احمد)

جب یہ دُوئی اور غیریت کی پٹی بالکل اُتار کر علیحدہ پھینک دی جائے۔ اور اپنے دل کو چشمۂ محبت بنا لیا جائے۔ تب ہم اس ذاتِ پاک کے دیدار کے اہل بن سکتے ہیں جس کا نام ہے رحمان یعنی رحیمِ مطلق اور محبتِ جاوید۔ جب اس طور سے تیاری ہوگئی۔ یعنی زمین طیار ہوگئی۔ تو پھر مزید تردد کی ضرورت ہے۔ ایسے وسائل اختیار کرنے چاہئیں۔ کہ جن سے وصالِ باری حاصل ہوسکے۔ اس کے متعلق جو کچھ کتبِ مقدسہ میں پڑھا ہے۔ اور پاک ہستیوں سے سُنا ہے۔ وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے۔ کہ اس تجلّی کے دیدار حاصل کرنے کے لئے کوئی مقررہ شاہراہ نہیں ہے۔ نہ کوئی مخصوص سڑک ہے۔ کہ جس کی نسبت یہ کہا جاسکے۔ کہ اُسی راستہ یا سڑک پر چلنے سے ہی اُس منزلِ مقصود تک پہنچ ہوسکتی ہے۔ جو کچھ دل کے متعلق اوپر عرض ہُوا۔ اگر وہ حاصل ہو جائے۔ تو اس کے بعد مالکِ برتر خود ہی اپنے وصال

کی راہ دکھاتا ہے۔ اور انسان کا اپنا آئینۂ دل اگر صاف ہو جائے۔ تو وُہ خود بخود رہبری کرتا ہے۔

اکثر لوگ اس بات کے شاکی ہوتے ہیں۔ کہ مدتیں گزر گئیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ پُوجا اور سندھیا باقاعدہ کرتے ہیں۔ مالک کی اُستتی یعنی حمد و ثنا بھی کرتے ہیں۔ دُعا اور پرارتھنا بھی کرتے ہیں۔ کہ مالک ہمارا ہر طرح سے مددگار رہے۔ لیکن پھر بھی طمانیتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی۔ جو مردانِ خُدا اس راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ وُہ وثوق سے فرماتے ہیں۔ کہ یہ ناممکن ہے۔ کہ نماز یا پُوجا ٹھیک طور پر ادا کی جائے۔ اور اس دیا کو مالک کے دربار میں عرضداشت دُرست طور پر کی جائے اور پھر وُہ کارگر ثابت نہ ہو۔ وُہ فرماتے ہیں۔ کہ اصل میں مقصود دنیاوی مفاد ہوتا ہے۔ ہماری پُوجا یا نماز حقیقی نہیں ہوتی۔ وہ اس بات کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں:۔

حکایت:۔ ایک صاحبِ استطاعت آدمی نے تین شخص ملازم رکھے اور ان کو خاص خاص کام سپرد کیا۔ ان میں سے ایک نوکر تو صبح اُٹھتے ہی اپنے آرام اور آسائش کی پرواہ نہ کرتا ہُوا اس کام میں لگ جاتا۔ مالک کے آنے سے پیشتر سب کام دُرست کر لیتا۔ اور پھر مالک کے آنے پر نہائت عزت سے پیش آتا اور اس کی ہر طرح سے خدمت بجالاتا۔ دُوسرا نوکر کام تو سب ٹھیک ٹھاک کر دیتا اس میں کسی قسم کی کمی نہ رہنے دیتا لیکن مالک کے آنے پر اس کی خاص پروا نہ کرتا۔ اُسے صرف یہی خیال رہتا کہ میرا فرض کام کو ٹھیک طور پر کرنا ہے۔ نہ کہ مالک کی بیجا خوشامد وغیرہ۔ تیسرا آدمی مالک کے بتائے ہوئے کام کی طرف دھیان بھی نہ دیتا لیکن جب مالک وہاں پہنچتا۔ تو اس کی بڑائی کرنا شروع کر دیتا۔ کہ آپ حاتم ثانی ہیں۔ آپ راجہ ہرلیش چندر ہیں۔ آپ کی دھاک زمانہ میں بندھ گئی ہے۔ آپ کا کوئی ہمسر نہیں۔ مالک قدرتی طور پر پہلے آدمی کو بہت زیادہ پسند کرتا۔ دُوسرے

کو اس سے کم۔ اور تیسرے کو محض خوشامدی ٹٹو اور بانونی آدمی سمجھتا۔

ہماری پُوجا یا نماز عام طور پر تیسرے ملازم کی سی ہوتی ہے۔ ہم محض مالک کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے سُپرد کیئے ہوئے کام کی طرف توجّہ نہیں دیتے دونو کام اگر ساتھ ساتھ ہوں۔ تو مالک کی پُوری پُوری خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے تبھی سچّی راحت بھی مل سکتی ہے۔ ہماری اُستتی، ہماری پرارتھنا اور ہماری پُوجا وندھیا کے نتائج اُسی وقت ہی ہماری خواہش کے مطابق حاصل ہو سکتے ہیں۔ جب ہم ساتھ ساتھ اس کے احکام کی پوری پوری تعمیل کر کے اس کی خوشنودی حاصل کریں ؎

ہمیں لازم ہے سچّے صانع برحق کے قائل ہوں	رضا جوئی میں اسکی جان سے اور دل سے مائل ہوں

کریں ہم اپنے ہمجنسوں کی خدمت اور وہ شاداں ہو

ہم اپنے بھائیوں سے صاف دل رہیں وُہ فرحاں ہو	(احمدی)

کوئی پُوجا یا نماز نیک نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر دل میں غیریت ہے یا دل میں نفرت کا جذبہ موجُود ہے۔ یا ہر ایک انسان کو ایک ہی خالق کی مخلوق سمجھ کر اُس کو مُحبّت اور اُلفت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور بغیر تمیزِ ذات و ملّت کے ہر ایک انسان کی خدمت کے لئے دل نہیں اُٹھتا۔

وصالِ باری کی منزل مشکل سے مشکل ہے۔ اور آسان سے آسان ہے۔ جلوۂ الٰہی کا نظارہ دُور سے دُور ہے۔ اور نزدیک سے نزدیک ہے۔ مشکل اور دُور اُن لوگوں کے لئے ہے۔ کہ جو اپنے دل میں انسان اور انسان کے درمیان فرق سمجھتے ہیں۔ اور بعض شریعتوں کے اختلاف کی وجہ سے ایک انسان سے رغبت اور دوسرے سے نفرت رکھتے ہیں۔ آسان اور نزدیک اُن کے لئے ہے۔ کہ جن کا دل محبّت کا چشمہ بن گیا ہے۔ اور اس میں سے پریم کی دھاریں نکل کر مالکِ کل کے ہر ایک

بندے پر پڑتی ہیں۔خواہ وُہ ہندُو ہے یا مسلمان۔بھنگی ہے یا چمار۔مشرقی ہے یا مغربی۔کوئی بھی طریقہ،کوئی بھی سادھن،کوئی بھی سمادھی یا مراقبہ اس مالک کی دید کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔لیکن ابتدائی شرط صفائے قلب اور دُوئی کا دُور کرنا ہے۔سب سے پہلے دل کو گُناہ اور نفرت سے پاک کرنا چاہئیے۔اس مالکِ برتر کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اخلاص وارادت اور صدقِ نیت کی ہے۔مالکِ اعلیٰ کی رضا یہ ہے۔کہ ہم جھوٹ نہ بولیں۔جھوٹے معاملات نہ کریں۔ہر ایک انسان کو اپنا بھائی سمجھیں۔کسی دُوسرے کے حقوق پر چھاپہ مارنے کی کوشش نہ کریں۔کسی کو نقصان نہ پہنچائیں۔کسی کی دِل آزاری نہ کریں۔جھگڑے نہ خریدیں۔شرارت سے باز رہیں۔اگر ان تمام احکام کی پیروی ہم ٹھیک طور پر کریں۔تو ہمارے اپنے معاملات بھی دُرست طور پر چلتے رہیں اور ہماری پُوجا اور نماز بھی ہمارے لئے سُودمند ثابت ہو۔اور اس طرح سے ہم اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔جب مالک اس طرح سے خوش ہوتا ہے۔تو اپنی کریمی صفات سے اپنے تک رسائی کے وسائل خُود بخُود اپنے بندے کے دل میں ڈال دیتا ہے۔لیکن اول صفائے قلب لازمی شرط ہے ؎

ہے اگر شوقِ جمال اُس کا تو اس کو صاف کر
یہ جو ہے دل کا پُر از زنگِ کدُورت آئینہ

دِل سے غیریت اور نفرت کی کدُورت ہٹ جانے پر اس مالک کی دید کا عکس ہر طرف سے پڑنے لگتا ہے ؎

ہر سمت سے ہو سایہ فگن یار کی صُورت
آئینۂ خاطر میں اگر کچھ بھی ضیا ہو (دانور)

وُہ مالکِ اعلیٰ تو اپنے سچے بندوں سے وصال کرنے کے لئے بیتاب رہتا

ہے۔اس کا بندہ اگر صدق دِلی اور خلوص سے ایک قدم بھی اس کے ملنے کے لئے اُٹھاتا ہے۔ تو مالک دس قدم آگے بڑھتا ہے۔لیکن کمی اور خامی اندر ہے ۔

ے ترے کرم میں نہیں کچھ کمی کریم ہے تُو
مرا قصور ہے جھوٹا امیدوار ہوں میں (شہیدی)

توبس اس بات کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔کہ دُعا اور نماز پُوجا اور پرارتھنا کے ساتھ ساتھ دُوسری شرط بھی لازمی ہے۔کہ جس کا اُوپر ذکر ہوا ہے۔یعنی صفائے قلب اور غیریت کا دُور ہونا۔بعض اصحاب صرف اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ ے

ہُوئی ہیں کشوریں مفتوح خاصوں کی دُعاؤں سے
اُلٹ جاتے ہیں تختے اولیا کی بد دعاؤں سے

دُعا حقیقت میں ایسی ہی طاقت رکھتی ہے۔دُعا کی چھپی ہوئی طاقت بے اندازہ ہے۔دُعا کے اثرات وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے۔سچے دل سے نکلی ہوئی دُعا کیا کچھ نہیں کر سکتی۔کون سی آفت نہیں ٹال سکتی۔کونسی مُصیبت رفع نہیں کر سکتی کون سے رنج وآلام کا داڑو نہیں بنتی۔کون سے دُکھ کی دوا ثابت نہیں ہوتی۔کون سی دولت کے لئے اکسیر کا کام نہیں دیتی۔کونسا مقصد اس کے احاطہ سے باہر ہے لیکن دُعا اُسی وقت اثر پذیر ہوتی ہے۔کہ جب یہ مقولہ بھی ہمارے پیش نظر رہے ے ہمیشہ جانچتے رہنا کہیں ناحق نہ ہو جائے

دلِ داناہوس کے رنگ میں احمق نہ ہو جائے

یہ دیکھنے کے لئے کہ کس حد تک دل کے آئینے کی کدُورت صاف ہو چکی ہے۔اور کہاں تک وُہ جلوۂ الٰہی کو دکھانے کے لئے تیار ہو چکا ہے۔تمثیل ذیل سے واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔فرض کیجئے کہ ایک اہلکار ترقّی سے محرُوم کیا

گیا ہے۔اس سے وجہ دریافت کرنے پر وہ اپنے دل کی حالت کے مطابق مفصلّہ ذیل جوابات میں سے کوئی ایک جواب دے گا:۔

۱۔ آج کل فرقہ دارانہ دَور جاری ہے۔مخالف فرقہ کے لوگ ہم لوگوں کو کہاں ترقّی لینے کا موقعہ دیتے ہیں۔

۲۔ ان دنوں آپا دھاپی کا معاملہ ہے۔لوگ اپنے اپنے رشتہ داروں کی مدد کرتے ہیں۔اَور ہم جیسے آدمی پیچھے پھینکے جاتے ہیں۔

۳۔ یہ زمانہ سفارشوں کا ہے۔جس کی سفارش چل گئی۔وُہ آگے ہو گیا جس کی کوئی سفارش نہیں۔اُس کو کس نمی پُرسد کہ بھیّا کون ہو؟"

۴۔ بھائی قسمت کا پھیر ہے۔حق تو میرا ہے۔افسر بھی خوش ہیں۔لیکن قسمت یاوری نہیں کرتی۔بدقسمتی کے چکّر میں پڑے ہوئے ہیں۔

۵۔ ترقی وغیرہ کے معاملات مالک کے ہاتھ میں ہیں۔رنج وراحت وُہی دیتا ہے۔مجھے بھی ترقی دیدے۔تو اس کے خزانہ میں کوئی کمی تو نہیں آتی۔لیکن شائد مولیٰ کریم مجھ کو اس لائق نہیں سمجھتا۔

۶۔ مالکِ برتر میری بہتری کو بہتر جانتا ہے۔ترقّی نہ ہونے میں میری بھلائی ہے۔اسی لئے مجھ کو ترقی نہیں دی گئی۔ترقّی ہونے میں ضرور میرا نقصان ہو گا۔اس لئے مالک نے مجُھے اسی جگہ رکھا ہے۔یقیناً میری بھلائی ترقی کے نہ ہونے میں ہے۔

۷۔ میرا فرض ہے۔اپنے فرائض کو احسن طور سے سرانجام دینا۔نتیجہ کی فکر مجھ کو نہیں۔وُہ میرے مالک کو ہے۔

۸۔ سب ہستیوں کے اندر ہی تو میرے مالک کا جلوہ رونق افروز ہو رہا ہے۔جس کو بھی ترقّی ملی ہے۔اس کے اندر بھی وہی میرا مالک ہے۔اس کی ترقی سے مَیں کم خوش نہیں ہوں۔میرے کسی بھی بھائی کی ترقی ہونا میرے ترقی یاب ہونیکے مترادف ہے۔

یہ انسانی قلب کی حالت درجہ وار بیان ہوتی ہے۔ جس شخص کا آخری جواب ہوتا ہے ساور صد قدلی سے ہوتا ہے۔ اور اس میں دکھاوے یا مایوسی یا بناوٹ کی شعاع بھی نہیں ہوتی۔ اس شخص کا دل تجلّی کا دیدار حاصل کرنے کے لیئے تیّار ہوچکا ہے۔ اور دیگر جوابات دینے والے بھائیوں کا دل اُسی اُسی تناسب سے زنگ آلودہ ہے۔ جس سلسلے میں جوابات مندرج ہیں۔

یہ عرض ہوچکا ہے کہ پُوجا اور نماز نیک نتائج پیدا نہیں کرتیں۔ کیونکہ اکثر پُوجا اور نماز مالک کے دیدار کے لیئے یا اس سے وصال حاصل کرنے کے لیئے نہیں کی جاتیں۔ بلکہ دنیاوی خواہشات کو مدِ نظر رکھ کر کی جاتیں ہیں۔ حالانکہ اصل غرض صرف دیدارِ حق ہونی چاہیئے۔ جب دُعا کے لیئے ہاتھ اُٹھیں۔ تو بس یہی التجا کی جائے کہ ؎

ہر صبح اُٹھ کے تجھ سے مانگوں ہوں میں تجھی کو
تیرے سوا تو میرا کچھ مدّعا نہیں ہے (میرؔ)

جو لوگ دیدارِ حق کے شائق ہیں۔ اُن کے لیئے دنیاوی چیزوں کی طلب تو بہت ہی گھٹیا چیز ہے۔ بلکہ جنت اور سورگ کا طالب ہونا بھی کوئی اعلےٰ مقصد نہیں ہے۔ کیونکہ کہا ہے ؎

دنیا طلبا چہ گویند رنجوری عقبیٰ طلبا چہ گویند مزدوری
مولا طلبا کہ داغِ مولا داری درہر جہاں مظفر و منصوری

طالبِ دُنیا :- سگ۔
طالبِ عقبیٰ :- سوداگر۔
طالبِ حق :- مرد۔

طالبِ مولیٰ کی تو اُس کے پانے کے لیئے اس قدر زبردست خواہش ہونی چاہیئے۔ کہ جیسے داؤدی نے کہا ہے ؎

عاشق معشوق ہو گیا عشق کہاوے سوئے داؤد اس معشوق کا اللہ عاشق ہوئے

اپنے آپ کو یعنی اپنی خودی کو تلاشِ حق میں بالکل بھلا دینا ہوتا ہے۔ مَیں کچھ چیز ہُوں۔ یہ خیال بھی اُڑا دینا ہوتا ہے۔ پُوجا اَور نماز سے مَیں کچھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس جھوٹی خواہش کا ہی سر قلم کرنا ہوگا۔ اس مالک سے واصل ہونے کے لئے یہ حالت پیدا کرنی ہوگی ؎

تُو کو اتنا مٹا کہ تُو نہ رہے اَور تجھ میں دوئی کی بُو نہ رہے

پھر جب اُس خودی کو دُور کر کے نماز یا پُوجا ادا کی جائے گی۔ تو کیا حالت پیدا ہو جائے گی ؎

دیا ہم نے جو اپنی خودی کو مٹا، وُہ جو پردہ سا بیچ میں تھا نہ رہا
رہا پردے میں اب نہ وُہ پردہ نشیں کوئی دُوسرا اسکے سوا نہ رہا

لیکن اَیسے حقیقی طالب بہت کم ملتے ہیں۔ فی زمانہ بہت جگہ تو دکھاوا ہے یا اگر خواہش ہے بھی تو بہت کمزور۔ کمزور رَو خواہ کوئی ہو، کوئی مُفید مطلب حل نہیں کرتی۔ یہ بات تو نہیں ہے۔ کہ ایسے طالبانِ حق کا عدم ہے۔ لیکن ؎

چاہن ہارے سُکھ سمپتی کے جگ میں بلت گھنیرے
کوؤ ایک بلت کہوں بر ہمی، نگر نگر سب ہیرے (سینہہ ساگر)

یعنی دُنیاوی آرام و آسائش اَور زر و مال کے طالب تو دُنیا کے اندر بہتیرے ملتے ہیں۔ لیکن کوئی سچّا طالبِ حق کہیں کہیں ملتا ہے۔ ہم نے سارے شہر اور جنگل دیکھ بھال لئے ہیں۔

سچّے طالبانِ حق اپنے مقصد کو پانے کی خواہش میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں۔ کہ اُن کے دل کے اندر صرف وُہی خواہش غالب آتی ہے۔ اور وُہ اس دیدار کے لئے اس قدر بے قرار ہو جاتے ہیں۔ کہ اس دیدار کا نقشہ ہر وقت

دل میں باندھ کر اُن کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ جو ایک ہندی شاعر نے بیان کی ہے

ع کاہن بھئے پران تے پران بھئے کاہن تے
چھپے میں نہ جانی پرے، کاہن ہے کہ پران ہے

ترجمہ:۔ جلوۂ الٰہی نے میری زندگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور میری زندگی جلوۂ الٰہی سے مل گئی ہے۔ مَیں اب اپنے اندر یہ تمیز نہیں کر سکتا۔ کہ جلوۂ الٰہی موجود ہے یا میری زندگی ؟

"میں" دوسرا نام ہے خودی کا۔ اور "تُو" کے اندر بے خودی ہے جس نے اپنی "مَیں" کو اپنے پیارے پریتم "تو" میں ملا دیا۔ خودی کو بے خودی کے اندر ڈبو دیا۔ اسی کو اس آبِ حیات کے پینے کا موقع ملے گا۔ جب تک کچھ خواہش رکھ کر انسان اپنی "مَیں" کو زندہ رکھتا ہے۔ اس وقت تک اس تجلّی کے دیدار سے محروم رہتا ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ ع

مجھ میں سما جا اس طرح تن پر ان کا جو طور ہے
جس میں نہ پھر کوئی کہے مَیں اور ہوں تُو اور ہے (سنیہی)

دیدارِ حق کے مقابلہ میں باقی سب چیزیں پھیکی معلوم ہونی چاہئیں۔ بلکہ دُوسری چیزوں کی طرف نگاہ دوڑانا یا ان کو خیال میں لانا ہی گناہ ہو۔ ہم بولیں تو اُسی کی بات، سُنیں تو اُسی کی کہانی۔ دیکھیں تو اُسی کا جلوہ۔ کسی اور طرف دھیان ہی نہ جائے ع

تجھے دیکھیں تو پھر اَور وں کو کن آنکھوں سے دیکھیں
وُہ آنکھیں پھُوٹ جائیں جن سے اَوروں کو کبھی دیکھیں

ایسی زبردست خواہش پیدا ہونے پر اور باقی دنیاوی اشیاء کی خواہشات اصلا ترک کر کے آئینۂ دل کے صاف ہونے پر لازمی طور سے اس مالک کی تجلّی

کے دیدار ہوں گے۔ اَور پھر مُسرّت کی، راحت کی کوئی حد نہ رہے گی۔ سرورِ جاوید حاصل ہوگا۔ زندگی کا مقصد پُورا ہوگا۔ اَور اس کے بعد کسی اور چیز کی خواہش ہی نہ رہے گی۔

اس وصال کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو ذاتِ الٰہی میں غرق کرنا چاہیئے۔

حکایت:- تین دوست نہانے کو گئے۔ ان میں سے ایک کھانڈ کا تھا۔ دوسرا کپڑے کا تیسرا پتھر کا۔ تینوں پانی میں داخل ہو گئے۔ کھانڈ والا تو وہیں پانی کے ساتھ ہی مل گیا۔ دوسرا کپڑے کا باہر آیا۔ لیکن کچھ پانی اپنے ساتھ لایا تیسرا پتّھر کا ویسے کا ویسا باہر آ گیا۔ جو تھوڑا بہت پانی لگا تھا۔ وُہ بھی جھٹ سُوکھ گیا۔

طالبانِ حق کو کھانڈ کا پُتلا بن کر اس ذاتِ باری کے ساتھ ہی مِل جانا ہوگا۔ کپڑے کا بننے میں بھی کچھ کچھ فائدہ ہے۔ لیکن پتّھر کا بننے میں تو محرومی ہی محرومی ہے۔ یہ پتّھر کے انسان وُہ انسان ہیں۔ جو لذّاتِ دنیا کے پیچھے دوڑنے والے ہیں۔ ان کو کوئی تیرتھ۔ کتھا یا وعظ۔ تلاوتِ قرآن یا وید اور گور بانی کا پاٹھ کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

مالک سے وصال پانے کے لئے انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ جو آدمی خیال کرے۔ کہ فلاں فلاں دنیاوی باتیں پُوری ہو جائیں۔ یا فلاں فلاں کام کر لئے جائیں۔ یعنی بیٹیوں کی شادی ہو جائے۔ یا ملازمت سے پنشن مل جائے۔ یا اپنا کاروبار اپنے بیٹوں کے سُپرد کر لیا جائے۔ تب مالک کے ملنے کے لئے کوشش کی جائے گی۔ ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ دُنیا اور دُنیاوی دھندے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ ایسے انسانوں کی وُہی مثال ہے۔ کہ جو دریا پر نہانے کے لئے

جائیں۔ لیکن اس بات کا انتظار کرتے رہیں۔ کہ دریا کی لہریں ختم ہو جائیں۔ تب اشنان کیا جائے۔ ایسے لوگوں کا نہانے کا وقت کبھی آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ نہ دریا کی لہریں بند ہوں۔ نہ وہ وقت آئے۔ دُنیاوی تعلّقات تو انسان کی ریاضت میں اسی طرح سے مخل رہتے ہیں۔ جیسے ایک لڑکی کی چوڑیاں۔ ایک لڑکی جس نے چوڑیاں پہنی ہُوئی ہوں وُہ اگر دھان کوٹنے بیٹھے۔ تو اُس کی چوڑیوں سے شور متواتر ہوتا رہتا ہے۔ اگر لڑکی اس شور کو بند کرنا چاہتی ہے۔ تو اُسے ایک ایک کر کے سب چوڑیوں کو ختم کر کے صرف ایک چوڑی رکھنی پڑے گی۔ اسی طرح سے باقی سب تعلّقات سے بالاتر ہو کر اُسی ایک ذات کو ہی سامنے رکھنا پڑے گا۔ دنیاوی لذّات سے مکمل طور پر دل اور حواس کو ہٹا لینے سے ہی مقصد بر آری ہو گی

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی نُورِ حق بر من بخند (مولانا روم)

ترجمہ:۔ آنکھ۔ کان۔ اور زبان کو بند کر۔ پھر تجھے اگر نورِ الٰہی کے دیدار نہ ہوں۔ تو میرا مذاق اُڑا۔

جو شخص لذّاتِ دنیا میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے گرمی میں کوئی پنکھے کے نیچے بیٹھ کر یہ خیال کرے۔ کہ گرمی چلی گئی یا اعضاء میں درد ہونے سے افیون کے استعمال سے عارضی آرام پا کر یہ سمجھے۔ کہ جسم کا عارضہ چلا گیا۔ دنیاوی چیزوں میں آرام اور راحت اسی طرح سے عارضی اور معمولی درجے کے ہوتے ہیں۔ مستقل اور حقیقی راحت ذاتِ باری سے واصل ہونے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

جیسے اُوپر عرض ہُوا اس ذاتِ پاک سے وصال پانے کے لئے کوئی شاہراہ نہیں ہے۔ جو لوگ اس بات کے مؤید ہیں۔ کہ کوئی خاص ایک ہی راستہ اس

منزل پر پہنچنے کا ہے۔ یا ایک ہی طریقہ اس مدعا کے حصول کا ہے۔ وُہ بھول کرتے ہیں ایک ہی شہر کو جانے کے کئی راستے ہوتے ہیں۔ جو شخص اس شہر کے مغرب کی طرف کھڑا ہے۔ وُہ مشرق کی طرف چلنے سے ہی وہاں پہنچ سکے گا۔ جو مشرق کی طرف کھڑا ہے وُہ بجانب مغرب گامزن ہونے سے ہی ٹھیک مقام پر پہنچے گا۔ اگرچہ ان ہر دو انسانوں کا رُخ متضاد اطراف میں ہے۔ تاہم وُہ درست راستے پر چل رہے ہیں۔ اور دونو ہی منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ ایسے ہی جو شخص شہر کے جنوب کی طرف ہے۔ اُسے شمال کی جانب چلنا ہو گا۔ اور شمال والے کو جنوب کی طرف علیٰ ہذا القیاس اب اگر یہ لوگ اپنے اپنے راستے کو درست ثابت کرنے اور دوسرے کی سڑک کو غلط جتلانے کی کوشش کریں۔ تو وہ کہاں تک حق بجانب ہوں گے۔ دُنیا میں اکثر مذہبی معاملات کے متعلق اسی قسم کی بحث چلتی ہے۔ جس سے مفصلہ ذیل نقصانات ہوتے ہیں:-

۱- اپنی راہ کھوٹی ہوتی ہے۔ منزل دور کی دور رہ جاتی ہے۔

۲- دوسروں کی شریعت کے نقص نکالنے میں عیب بینی کی عادت پڑ جاتی ہے۔

۳- اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لئے سخن پروری۔ خودی۔ خودستائی۔ ریا اور جھوٹ کی بدعادات کا شکار بننا پڑتا ہے۔

۴- باہمی نفرت اور غیریت کے جذبات بڑھتے ہیں۔

۵- ایک دوسرے کی کتبِ مقدسہ اور بزرگانِ دین کے لئے احترام کم ہوتا ہے۔

۶- لڑائی فساد تک نوبت پہنچ کر دوامی عناد قائم ہو جاتا ہے۔ باہمی نزاع و تکرار رہنے سے زندگی بے لطف اور دغدغہ کی ہو جاتی ہے۔

۷- عقلِ سلیم کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اصلیت سے انسان بہت دُور جا پڑتا ہے

۸- اس زندگی کا مطلب و مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اور زندگی ایک طور سے

ضائع ہو جاتی ہے۔

حقیقت بین لوگ ان تکراروں اور مباحثوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ بلکہ چپ چاپ اپنی راہ پر چلے جاتے ہیں۔ اور کبھی نہ کبھی منزل پر پہنچ کر ہی رہتے ہیں۔

لفظی بحث بوجہ کم عقلی اُور نامکمل آگاہی کے ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ ان اندھوں کی جنہوں نے ایک ہی وقت ایک ہاتھی کو دیکھا۔ ایک اندھے نے پاؤں چھوئے۔ ایک نے کان ایک نے سونڈ اور ایک نے دانت ایک نے پشت۔ ہاتھی نکل جانے کے بعد وُہ ایک دوسرے سے ہاتھی کا حلیہ بیان کرنے لگے پاؤں دیکھنے والے نے کہا کہ وُہ ستون جیسا تھا۔ دانت دیکھنے والے نے کہا کہ وُہ نوکدار بھالے جیسا تھا۔ سونڈ دیکھنے والے نے ضد کی کہ وُہ سانپ جیسا تھا۔ کان دیکھنے والے نے کہا وُہ چھاج جیسا تھا۔ پشت دیکھنے والے نے اصرار کیا۔ کہ وُہ چبوترے جیسا تھا۔ اس بحث میں تکرار ہو گئی۔ اور آخر کار سر پھٹول تک نوبت پہنچی۔ آجکل ہماری بحث پروردگارِ عالم کے متعلق اسی قسم کی ہے۔ ہمارا نامکمل علم۔ ہماری محدود عقلیں اُس مکمل رب العالمین، برہمانڈ پتی کے جاننے کے نااہل ہیں۔ جو لوگ حقیقتاً اُس کے وصال کے اُس کے دیدار کے اُس کے درشن کے خواہش مند ہیں۔ انہیں اس فضول قیل وقال میں کبھی نہ پڑنا چاہیئے۔ وُہ کیا ہے۔ کیسا ہے۔ کہاں ہے۔ ان بے فائدہ باتوں میں اپنا تضیع اوقات ہر گز نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ یہ جان کر کہ ایک منزل پر پہنچنے کے لئے کئی راستے ہوتے ہیں۔ دُوسروں کے راستوں کے متعلق معترض نہ ہو کر۔ خاموشی سے اور اعتقاد سے۔ باقاعدگی سے اُور خوشی اور اُمید بھرے دل سے اپنے راستہ پر بغیر اِدھر اُدھر دیکھے چلتے رہنا چاہیئے۔ البتہ منزل طے کرتے وقت مفصلہ ذیل امور کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔

۱ - مالک کا خیال دل سے کبھی نہ بھولے۔ کھاتے۔ پیتے۔ چلتے۔ پھرتے اُٹھتے۔ بیٹھتے۔ سوتے۔ جاگتے ہر وقت دل میں اس کا دھیان رہے۔

۲ - مالک کی موجودگی ہر جگہ ہر وقت ہر ایک چیز میں محسوس کی جائے۔

۳ - دل کے اندر غیریت کے خیال نہ آنے دئے جائیں۔

۴ - اپنی منزل یعنی اپنے پیارے پریتم سے واصل ہونے کا خیال ہمیشہ مدّ نظر رکھا جائے۔

۵ - خیالات ہمیشہ پاکیزہ رکھے جائیں۔ سب کا بھلا سوچا جائے۔ سب کے بھلے کے لئے دُعا کی جائے۔ اور سب کی بھلائی کے ساتھ اپنی بھلائی وابستہ سمجھی جائے۔

۶ - کوئی خیال یا کلام یا کام ایسا نہ ہو۔ کہ جو مالکِ کل کی ناراضگی کا باعث ہو۔

۷ - نیک اور پاک انسانوں کی صحبت اختیار کی جائے۔

۸ - سب انسانوں کو مُحبّت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ بلکہ ہر ذی رُوح کو پریم درشٹی سے دیکھا جائے۔ غریبوں اور تکلیف زدہ انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ اور اُن کی مدد کی جائے۔

۹ - دنیا اور دنیاوی چیزوں سے زیادہ جی لگانے کے نقصانات پر ہمیشہ غور کیا جائے۔

۱۰ - حقیقی راحت دنیاوی چیزوں میں نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی راحت کا چشمہ وُہ پربھو پرماتما ہی ہے۔ یہ بات پختہ طور پر ذہن نشین کر لی جائے۔

۱۱ - موت یقینی ہے۔ اور نہ جانے کس وقت آ جائے۔ یہ خیال دل سے نہ بھلایا جائے۔ اس لئے جلد سے جلد نکو کاری اور ذکرِ باری کا توشہ اکٹھا کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔

۱۲ - اخلاق اور روحانیت کو اُونچا کرنے والی کتابوں کا مطالعہ رکھا جائے۔

۱۳۔غرور اور غصہ سے پرہیز کیا جائے۔اگر کوئی چیز دوسروں کی نسبت اچھی یا زیادہ ملی ہے۔تو اس کے لئے مالک کا فضل جان کر اس کا شکر منایا جائے۔
۱۴۔قناعت سے دِل کو ہمیشہ پُر کیا جائے۔لالچ سے کسی کا حق چھیننے یا حرام کا مال حاصل کرنے کا خیال تک بھی نہ کیا جائے۔کسی دوسرے کو اگر بہتر یا زیادہ چیز ملی ہے۔تو اس کے لئے حسد یا کینہ نہ کیا جائے۔بلکہ اس شخص کو مالک کی زیادہ پسندیدہ ہستی سمجھ کر اس کے لئے زیادہ عزت اور وقار کا بھاو رکھا جائے۔
۱۵۔راستی پر ثابت قدم رہ کر ریا اور جھوٹ سے پرہیز کیا جائے۔
۱۶۔عفو اور رحم کے نیک جذبات دل میں پیدا کئے جائیں۔
۱۷۔کسی کو درشت کلامی یا دلآزاری سے دُکھ نہ دیا جائے۔بلکہ خیال سے بھی بُرائی نہ سوچی جائے۔
۱۸۔غیبت۔بدگوئی یا اور بُرے کلام نہ سُنے جائیں۔
۱۹۔اپنی زبان پر قابو رکھا جائے۔زبان سے کوئی جھوٹا۔سخت یا کڑوا کلام نہ کیا جائے۔بلکہ شیریں کلامی سے کام لیا جائے۔
۲۰۔چلتے وقت نظر حتی الوسع نیچی رکھی جائے۔اور آنکھوں پر اور خیال پر قابو رکھا جائے۔
۲۱۔ہر ایک انسان کی خُوبی کی طرف ہی دیکھا جائے۔اس کے عیبوں پر ہرگز نگاہ نہ ڈالی جائے۔
۲۲۔زیادہ ہجُوموں میلوں اور سوسائٹیوں میں شامل ہونے سے پرہیز کیا جائے۔
۲۳۔خوراک صاف سُتھری۔اندازہ کی اور نیک خیالات کو پیدا کرنے والی کھائی جائے۔دُودھ۔سبزی اور پھلوں کا استعمال زیادہ کیا جائے۔
۲۴۔اپنی کمائی میں سے مقررہ حصہ نیک کاموں۔غریبوں اور یتیموں کی امداد کیلئے خرچ کیا جائے۔

انسان اَور اُس کا دل

ظرف ناپاک ہے تو اُس میں ہے ہر شے ناپاک
دِل نہیں صاف تو کیا خاک عبادت ہو گی

انسان کا دل عجوبۂ روزگار ہے۔ اس کی فلاسفی اَور اس کا مطالعہ اگر بعید از فہم نہیں تو از حد پیچیدہ ضُرور ہے۔ اس کے اندر متضاد طاقتیں چھُپی ہوئی ہیں۔ اگر یہ کمزور ہے۔ تو گیدڑ سے بھی ڈرپوک ہے۔ اَور ایک چیونٹی بھی اس پر غالب آجاتی ہے۔ لیکن اگر یہ اپنی طاقت کو سنبھال لے۔ تو بڑے بڑے ہاتھیوں اور خونخوار شیروں کو بھی مقابلہ میں پچھاڑ دیتا ہے۔ اس میں لالچ آجائے تو ایک تانبے کے پیسے کے لئے اپنے آقا کو مُصیبت میں گرفتار کرا دیتا ہے۔ لیکن اگر اپنی سدھ بدھ رہے تو لاکھوں کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اپنی منزلت سے باخبر نہ ہو تو ذلت کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔ اپنی شکتی سے آگاہ ہو جائے۔ تو آسمان پر چڑھا دیتا ہے۔ غافل رہے تو غلامی کی زنجیروں میں پھنسا دیتا ہے۔ ہوشیار ہو جائے تو تخت شاہی دِلا دیتا ہے۔ بے ہمت ہو جائے تو کاسۂ گدائی دے کر در بدر پھراتا ہے سنبھل جائے۔ تو اپنے پاؤں پجواتا ہے۔ ہمت ہار دے تو ناکامی اور نامُرادی کے گڑھے میں گراتا ہے۔ ہوش مند ہو۔ تو کامیابی اور ترقی کا باعث بنتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے۔ کہ دل کی کمزوری میں نقصان اَور دُکھ ہے۔ اَور اُس کی طاقت میں فائدہ اور سُکھ ہے۔ کبیر صاحب نے اسی لئے کہا ہے کہ ؎

من کے ہارے ہار ہے   من کے جیتے جیت

لہذا یہ بات قابلِ غور ہے۔ کہ کس طرح سے دل کو کمزور نہ ہونے دیا جائے۔ اور اس کی طاقت کو کس طرح بڑھایا جائے۔

دل کا یہ خاصہ ہے کہ جس چیز کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اُسی کا ہو رہتا ہے بلکہ وُہی بن جاتا ہے۔ مثلاً جب دل پر غصہ غالب آجاتا ہے۔ تو یہ آگ کی طرح بھڑک اُٹھتا ہے لیکن جب اُس کے اندر سکون ہو۔ تو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی طرح ہوتا ہے جب اس میں نفرت کی عادت جڑ پکڑلے۔ تو پتھر کا سا سخت اور تلوار کی طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ہمدردی اور اُلفت کے ساتھ میل کرتا ہے۔ تو مکھن کا سا نرم اور پھول کا سا نازک بن جاتا ہے۔ جب یہ عیش وعشرت میں پھنستا ہے تو عیش کا ہی رُوپ بن جاتا ہے۔ جب عبادت میں لگے۔ تو عبادت کا پُتلا بن جاتا ہے۔

اس لئے یہ لازمی ہے۔ کہ اس کے مشغلے ایسے ہوں۔ جو انسان کے لئے مُضر نہ ہوں۔ بلکہ مفید ہوں۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حواسِ انسانی کے اندر دل سردار ہے۔ باقی سب حواس اسکے تابع فرمان ہیں حس اِندری کے ساتھ یہ لگ جائے وُہی اپنا کام کرسکتی ہے۔ باقی بچاری بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں۔ اور پھر جونسی حس کو یہ اپنا کام کرنے کا حکم دے۔ اس کی مجال نہیں۔ کہ پس وپیش کرے۔ یا نافرمانی کرے۔ اگر آنکھوں کو حکم کرے۔ کہ فلاں نظارے کو یا فلاں طرف کو دیکھنا ہے۔ تو وُہ چُپ چاپ اس طرف لگ جاتی ہیں کان اور زبان بھی اسی طرح سے تعمیلِ فرمان کرتے ہیں قس علیٰ ہذا باقی حواس کا حال بھی اسی طرح سمجھ لیجئے۔ غرضیکہ اس کے ہاتھ میں سارے حواس کی نکیل ہے۔ اُن کو جس طرف چاہے لے جاسکتا ہے۔ یعنی اچھی یا بُری سے

کچھ آپ ہی گرا کے آپ ہی چُنتا ہے
کہتا ہے کچھ آپ ہی آپ سُنتا ہے
اے دردؔ ہمیشہ یہ دلِ دیوانہ
کیا کچھ اُدھیڑتا ہے کیا بُنتا ہے

جیسے فوج کے اندر کمانڈر اگر خُوب تجربہ کار۔ تربیت یافتہ۔ جنگ آزمودہ اور موقع شناس ہو۔ تو فوج کا فتحمند ہونا لازمی ہے۔ اِسی طرح سے انسان کا دل اگر سدھا ہُوا اور تربیت یافتہ ہو۔ تو باقی حواس کو ساتھ لے کر انسان کے لئے کامیابی کا باعث بنتا ہے۔ ورنہ کارزارِ زندگی میں ہزیمت اُٹھاتا ہے اور پسپا ہوتا ہے۔ اُپنشد کے اندر لکھا ہے۔ کہ جب انسان کا من قابُو میں ہوتا ہے۔ اس کے حواس سدھائے ہُوئے گھوڑے کی طرح اس پیکرِ انسانی کے رتھ کو بآرام لے جاتے ہیں لیکن جہاں دل قابُو میں نہ ہو۔ تو شریر گھوڑوں کی طرح حواس اس رتھ کو کسی گڑھے یا نشیب میں جا گراتے ہیں۔ اور اُس کو چکنا چُور کر دیتے ہیں۔ دل کو حواس کے گھوڑوں کی لگام سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح گھوڑے لگام کے بس ہو کر چلتے ہیں۔ ایسے ہی حواس دل کے تحت ہو کر کام کرتے ہیں۔ اس لئے جو انسان اس لگام کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا ہے۔ ڈھیلا نہیں ہونے دیتا۔ وہ دُنیا کے اندر بھی آرام پاتا ہے۔ اور اپنی عاقبت بھی سدھار سکتا ہے۔ لیکن جو انسان اس باگ ڈور کو قابُو میں نہیں رکھ سکتا۔ اس کی تباہی اور بربادی میں کوئی شک ہی نہیں ؎

اسپ ہو آزاد سرپٹ قید ہوتا ہے سوار	اسپ ہو مطلق عناں حیران روتا ہے سوار
جانِ من آزاد کرنا چاہتے ہو آپ کو	کرتے ہو آزاد کیوں پھر آستیں کے سانپ کو

روکنے سے من کے مل جاتی ہے راحت سربسر
وار کر پھینکوں میں اس پہ دوجہاں کا مال و زر

ہمارے بزرگوں نے اس حقیقت کو خُوب سمجھا ہُوا تھا۔ پورانوں میں کتھا آتی ہے۔ کہ ایک دفعہ راجہ پریکشت نے اپنی سلطنت کے تمام پنڈتوں اور ودوانوں کو بلایا۔ کہ کوئی ایسا طریقہ بتاؤ۔ کہ جس سے ہمیں پانچ منٹ کے اندر معرفت کے راز معلوم ہو جائیں۔ اُنہوں نے عرض کیا۔ کہ راجن! یہ چیز کچھ آسان نہیں زندگیاں

گذر جاتی ہیں۔ اور پھر بھی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی۔ بڑی کڑی تپسیا اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے۔ لیکن ان کی ساری دلیلوں کے باوجود راجہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ آخر سوامی سکھ دیو جی تشریف لائے۔ اُنہوں نے پُوچھا۔ کہ نریش آپ کیا چاہتے ہیں؟

راجہ۔ مہاراج میں پانچ منٹ کے اندر گیان حاصل کرنا چاہتا ہُوں۔

سوامی جی۔ تو آپ گیان حاصل کرنے کا عوضانہ دے سکیں گے؟

راجہ۔ میں اپنا راج پاٹ گھر بار حتیٰ کہ اپنی زندگی اُس کے عوض دینے کو تیار ہُوں۔

سوامی جی۔ آپ تو پانچ منٹ کہتے ہیں۔ ہم ایک منٹ کے اندر آپ کی خواہش پُوری کریں گے۔ لیکن جو چیز ہم مانگیں یا دلانی چاہیں گے دینی ہوگی۔

راجہ۔ منظور۔ جو کچھ میرے پاس ہے۔ وُہ حاضر کرنے کو تیار ہُوں۔

سوامی جی۔ سوچ لو۔ غور کر لو۔ پھر اگر نہ دے سکے تو جھوٹے ٹھیرو گے۔

راجہ۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ اچھی طرح سے وچار کر لیا ہے۔ میں ہر ایک قُربانی کے لئے تیار ہُوں۔

سوامی جی۔ اچھا تو طیار ہو جاؤ۔ ہم وُہ چیز مانگنے لگے ہیں۔

راجہ۔ فرمایئے لیکن وُہ چیز میرے پاس ہونی چاہئے۔ اور مجھے گیان بھی ساتھ ہی ساتھ ملنا چاہیئے۔

سوامی جی۔ بے شک وُہ چیز تمہارے پاس ہے۔ اور جُونہی اُسے حوالہ کردو گے۔ گیان کی گنگا میں ڈبکیاں لگاؤ گے۔

راجہ۔ بس ٹھیک ہے۔ فرمایئے میں نے کیا چیز حاضر خدمت کرنی ہے۔

سوامی جی۔ راجہ سُنو وہ چیز تمہارے پاس اس وقت موجود ہے جُونہی

ہم مانگیں اَور جس کے حوالہ کرانا چاہیں۔ بغیر تامّل دے ڈالنا۔ ورنہ معاہدہ منسُوخ۔

راجہ۔ (خوف۔ حیرانی اَور خوشی کے ملے جُلے خیالات کے اندر مستغرق ہے خوف اس لئے کہ نہ معلوم کیا مانگا جائے گا۔ حیرانی اس لئے کہ وُہ کونسی ایسی قیمتی شَے ہے۔ کہ جو میرے پاس اس وقت بھی موجُود ہے۔ اور خوشی اس لئے کہ گیان کی پراپتی ہوگی)

ہاں مہاراج ٹھیک ہے۔

سوامی جی۔ اَے راجن خبردار! اپنا دل اُس پرم پتا پرماتما کے حوالہ کردو۔ اِس کے بعد کوئی خیال اپنی طرف سے نہ اُٹھانا۔ کوئی کام اس دل سے نہ لینا۔ اس سیکنڈ کے بعد تمہارا دل تمہارا نہیں ہے۔ یہ اسی مالک پربھو کا ہے۔ مالک جو کام اس سے لینا چاہے لے۔ تم ہرگز اسے اپنے کام میں نہ لانا۔ بلکہ اپنا ہی نہ سمجھنا۔

راجہ نے ویسا ہی کیا اَور اُس کی دِلی مراد بر آئی۔ یہ کتھا ہے۔ قصہ ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ بھگوان کرشن نے گیتا کے نویں ادھیائے میں فرمایا ہے۔

من منا بھومد بھگتو مدیاجی ماں نمسکرو
مامیوئیشیسی یکت ایوماتمانںگ مت پرائنہ

ترجمہ:۔ اپنا دل میرے میں لگا۔ میرا ہی بھگت بن۔ میری ہی پُوجا کر۔ مُجھ کو نمسکار یا سجدہ کر۔ اس طرح سے اپنے آپ کو میرا سہارا لے کر میری طرف لگا کر مُجھ سے ہی واصل ہو جائے گا۔

نشاں پاتے ہیں پہلے جو نشاں اپنا مٹاتے ہیں
خود اپنا ناش کر کے بیج پھر پھل پھُول لاتے ہیں

دل کی یکسوئی میں۔ دل کو قابُو کرنے میں ہی ساری کامیابی کا راز ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ کہ جس کام کی طرف دل مائل نہ ہو۔ وُہ کام سرانجام پائے۔ عبادت

اور ریاضت بھی تبھی بار آور ہو سکتی ہے۔ جب دل کو یکسوئی حاصل ہو جائے۔ ورنہ اگر دل ہی دُوسری جانب راغب رہتا ہے۔ تو نیک نتائج حاصل نہیں ہوتے

؎ بر زبان تسبیح و در دِل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر (مولانا روم)

ترجمہ:- زبان سے اللہ اللہ کرنا۔ لیکن دل میں اپنی گائے اور گدھے کے متعلق خیالات رکھنا کب سودمند ہو سکتا ہے؟

بس دل کو قابو کئے بغیر کوئی بندگی کوئی بھگتی کوئی ریاضت کسی کام کی نہیں۔ دِل پر پہلے اس قدر تسلط جمانا ہوگا۔ کہ وہ بالکل تابع فرمان ہو جائے ؎

بندگی اور حق پرستی کچھ نہ ہونا ہے نیاز
کچھ نہ ہونے کے سوا اور حق پرستی کچھ نہیں
یہ جو کچھ ہونا ہوا ناجسکو کہتے ہیں یہاں
فقر میں پستی یہی ہے۔ اور پستی کچھ نہیں

یہ ہو نہیں سکتا کہ دل مزے اڑائے۔ جہاں چاہے کھُل کھیلے اور زندگی بھی کامیاب ہو عاقبت بھی ٹھیک ہو جائے۔ یہ دونو متضاد باتیں ہیں میل نہیں کھا سکتیں ایک کے ہوتے ہوئے دُوسری کا حاصل کرنا ایسا ہی ہے۔ جیسے ایک نیام میں دو تلواریں رکھنے کی کوشش کرنا یا آگ اور پانی کو یکجا رکھنے کا تردّد کرنا ؎

خُدا خُدا جو کرے اور خودی کا دم بھی بھرے
بڑا فریبی ہے، جھوٹا ہے وہ خُدائی کا

اور بھی لکھا ہے ؎

مزے دُنیا کے بھی تم چاہتے ہو دولتِ دیں بھی
تمہیں تو چاہیئے اے شوخ میٹھا بھی سلونا بھی

اگر دِل قابو میں نہ ہو۔ دِل پر فتح نہ پائی ہو۔ تو سو نصیحتیں سُنو۔ کتھا سُنو۔ وعظ سُنو۔ مندر جاؤ۔ مسجد جاؤ۔ کچھ حاصل ہو نہیں سکتا۔ ریت میں سے تیل نکالنے

کی کوشش ہے۔ زندگی کا سارا راز اس دِل پر قابُو پانے میں ہے ؎

ہم نے اوّل سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک ہم سے پُوچھے کوئی ہوتی ہے عبادت کیسی
جبکہ رہتا نہیں قابُو میں دل اپنے ناصح وحی بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی!

کہیں بھگوے کپڑے پہن کر سادھو کہیں کڑے اور کرپان لگا کر سنت کہیں سبز پوش بن کر بزرگ بننے کی اور کہیں رُنڈ مُنڈ ہو کر الکھ جگا کر بھسم رما کر سِدھ بننے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن حقیقت کیا ہے ؎

ڈاڑھی مُونچھ منڈائے کے ہوا گھوٹم گھوٹ
من کو کیوں نہیں مونڈے ہے جامیں بھریا کھوٹ (کبیر صاحب)

گنگا اور جمنا میں غوطے لگانے سے۔ تری امرت سر میں اشنان کرنے سے۔ آبِ زمزم کے چکھنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ اندر کا بندر ویسے ہی ناچ نچا رہا ہے ؎

نہائے دھوئے کیا بھیا جو من کا میل نہ جائے
مین سدا جل میں رہے دھوئے باس نہ جائے

یعنی اگر من کی میل دُور نہ کی جائے۔ تو باہر کے نہانے دھونے سے کیا بنتا ہے جیسے مچھلی ہمیشہ پانی میں رہتی ہے۔ لیکن اس کی بساند پانی کے ساتھ دھونے سے بھی نہیں جاتی۔ تبھی تو کہا ہے ؎

دِل چو آلودست از حرص و ہوا کے شود مکشوف اسرارِ خُدا
صد تمنا در دلت اے بوالفضول کے کند نورِ خُدا در دل نزُول (مولانا رُوم)

ترجمہ۔ جب دل دُنیاوی لالچ اور خواہشات سے مَیلا ہے۔ تو اس میں مالکِ ازلی کے بھید کیسے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ اے نادان! جس وقت تک دل کے اندر سینکڑوں آرزوئیں موجود ہیں۔ اس وقت تک اُس نورِ مطلق کی تجلّی

دل میں کیسے دخل پا سکتی ہے ؟

باہر کی صفائیاں۔ باہر کے بناؤ۔ بیرونی اڈمبر۔ ظاہری بناوٹیں۔ لمبی ڈاڑھی۔ پیشانی کے تلک اور محراب۔ سر پر لمبی چوٹی یا کیس منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ اگر بناؤ کرنا ہے تو دل کا کرو۔ اگر سنگار کرنا ہے تو اُسی کا کرو۔ ورنہ دکھاوے کے ڈھونگ لاحاصل ہیں ؎

خانۂ دل ہے سیاہ اس کی سیاہی دُور کر   کیا سفیدی سے محل کرتا ہے تو اپنا سفید

مالکِ کُل اُنہیں شخصوں سے محبّت کرتا ہے۔ جن کے دل صاف ہیں۔ جن کے دِل آلودگی سے پاک ہیں۔ قرآن شریف کی سُورتِ توبہ کے رکُوع نمبر ۱۳ میں لکھا ہے۔ کہ وُہ مالکِ ارض و سما پاکیزہ دل انسانوں کو پسند کرتا ہے۔ ان سے ہی مُحبّت کرتا ہے۔ وُہی اس کے پیارے بننے کا فخر حاصل کر سکتے ہیں پھر مشکوٰۃ میں رسُولِ کریم سے ایک حدیث ہے کہ پروردگار نہ تو تمہاری صُورتوں اور شکلوں کا خیال کرے گا۔ نہ تمہارے زر و دولت کا موازنہ لے گا۔ بلکہ اگر وُہ دیکھے گا۔ تو تمہارے دِلوں کی پڑتال کرے گا۔ یا تمہارے اعمال کی۔ سکھمنی صاحب میں آتا ہے کہ ؎

جا کا من ہوئے سکل کی رینا   ہر ہر نام تن گھٹ گھٹ چینا

من اپنے تے بُرا مٹانا   پیکھے سگل سرشٹی ساجنا

ترجمہ: جس کے دل کے اندر سے خودی اور تکبّر دُور ہو کر انکساری آ گئی ہے اُسے ہر ایک انسان کے اندر اپنے مالک کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ جس نے اپنے دل کی مَیل اور غیریت کو رفع کر دیا ہے۔ وُہ ساری کائنات کو دوست کی نگاہ سے دیکھتا ہے ؛

کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس بات کو تو ہر ایک سمجھدار انسان قبول کرتا ہے۔ کہ

دِل پر قابُو پانے کے فوائد بے انداز ہیں لیکن اس کو قابُو کِیا کیسے جائے۔ بڑی کوشش کی جاتی ہے۔ تب بھی یہ پارے کی طرح کہیں چین سے نہیں ٹھہرتا۔ اس کی تھرتھراہٹ برابر لگی رہتی ہے۔ یہ سوال بلا شبہ اہم ہے۔

یہی سوال گیتا میں ارجن نے بھگوان کرشن سے کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اس دل کا قابُو کرنا ایسا ہی ناممکن ہے۔ جیسے ہوا کو مُٹھی میں بند کرنا۔ بھگوان کرشن نے اس سوال کی اہمیت کو مانتے ہوئے فرمایا۔ کہ یہ دُرست ہے کہ دِل کا قابو کرنا ایک مشکل بات ہے۔ لیکن ناممکن نہیں۔ اور پھر بتایا کہ یہ دل دو طریق سے بس میں آسکتا ہے۔

(۱) ابھیاس یعنی لگاتار کوشش کرنا۔

(۲) ویراگ یعنی دُنیاوی چیزوں سے تعلّق توڑنا۔

پہلے ہم کوشش کو لیتے ہیں۔ کہ وُہ کوشش کس شکل میں ہوسکتی ہے۔ اس کے لئے مفصّلہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا مفید ہوسکتا ہے۔ جو کچھ یہاں عرض کیا جائیگا۔ یہ فرض نہ کر لینا چاہیئے۔ کہ اس کے علاوہ اَور کوئی بات نہیں ہے۔ نہیں اَور بھی کئی طریقے ہیں۔ جو جس سے فائدہ اُٹھانا چاہے اُٹھا سکتا ہے۔ غرض تو مقصد حاصل کرنے سے ہے۔ ذرائع کوئی بھی برتے جاسکتے ہیں۔ اپنی اپنی شریعت اپنی اپنی طریقت اپنے اپنے حالات کے مطابق جو طریقہ زیادہ مفید دکھائی دے۔ اس کا استعمال کرنا چاہیئے۔ مقصد دِل کی چنچلتا اَور دل کی تھرتھراہٹ کو دُور کرنا ہوتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے دل کی صفائی ضروری ہوتی ہے۔ جس مَیل کو دُور کرنا ہے۔ وُہ کونسی ہے "گناہ اور نفرت کی"۔ گذشتہ زمانہ میں جو اعمال گناہ اور نفرت کے زیر اثر کئے ہیں۔ اور ان کا جو اثر دل پر بیٹھا ہے۔ اُس کو دُور کرنا اور آیندہ

کے لئے گناہ اور نفرت کے خیالات پاس نہ آنے دینا۔ اس غرض کے لئے اُن کے مقابلہ کے نیک اوصاف کو ہر ایک وقت پیش نظر رکھنا لازمی ہے ایک کمرہ میں اگر اندھیرا ہو۔ اور ایک انسان اس کو دُور کرنے کا خواہش مند ہو۔ تو اگر وہ چاہے کہ دیواروں پر یا کمرے کے اندر جو اندھیرا ہے۔ اس کو ڈنڈے مار کر باہر نکال دے تو اُس کو سوائے ناکامی کے کچھ ہاتھ نہیں آنے کا۔ ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ اندھیرے کی ضد کو یعنی روشنی کو لایا جائے۔ تو اندھیرا خود بخود بھاگ جائے گا۔ اسی طرح سے دل کے اندھیرے یعنی گناہ اور نفرت کو دُور کرنے کی ضرورت ہے۔ پوترتا اور پریم کی جوت جگا دینے کی ضرورت ہے۔ چلتے۔ پھرتے۔ اُٹھتے۔ بیٹھتے۔ جاگتے۔ سوتے۔ کھاتے۔ پیتے۔ نہاتے۔ دھوتے۔ غرضیکہ ہر وقت یہی خیال کرنا چاہئے۔ کہ میرے اندر پاکیزگی اور محبّت کے جذبات آ رہے ہیں۔ مَیں طہارت اور اُلفت کے آبِ زمزم سے گناہ اور نفرت کے سابقہ بد اثرات کو دھو رہا ہُوں۔ جب مالک کے دربار میں بھی دست بدعا ہونا ہو۔ تو اس سے بھی انہی چیزوں کی طلب کی جائے۔ اس مالکِ ارض و سما سے دُعا میں دنیاوی چیزوں کا مانگنا ایسا ہی ہے۔ کہ جیسے ایک سُمندر کے پاس پہنچکر کہ جس کے اندر موتی ہی موتی ہوں۔ پانی کے چند قطرے طلب کرنا۔ یا جیسے ایک بڑے شہنشاہ سے خاک کی مٹھی مانگنا۔ سابقہ بُرے اثرات کی وجہ سے بار بار ناپاکیزگی کے خیالات اندر داخل ہونا چاہیں گے۔ اور دل کا چونکہ اُن سے تعلق ہو چکا ہے۔ وُہ ان سے ہم آغوش ہونے کے لئے دوڑے گا۔ لیکن دل کو اسی وقت پھٹکار دینی چاہئے۔ اور نوراً پاکیزگی اور پریم کے زبردست سانٹے سے اس کو روک دینا ازبس لازمی ہے۔ ایسے انسان کہ جو حقیقتاً نیک سیرت اور سب سے محبّت کرنے والے ہوں۔ اُن کے نیک اوصاف کو اور اُن کے نیک اعمال کو نگاہ کے سامنے لانا چاہیئے۔

یہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ نفرت اور غیریت کے خیالات کو دُور کئے بغیر

تو ایک سیڑھی چڑھنا بھی محال ہے۔ ایک قدم آگے رکھنا بھی مشکل ہے ؎

کبر و حسد و بخل و نفاق و کینہ اوصافِ بشر طبیعت دیرینہ
ہرگز بمقام ہیچ مردے نرسی تازیں ہمہ پاک نسازی سینہ

ترجمہ۔ غرور۔ حسد۔ تنگ دلی۔ نفاق اور کینہ مدت سے انسانوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ تو کسی اچھے مقام پر ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک ان سب سے اپنے دل کو صاف نہ کر لے ؞

موجودہ زمانہ میں ان بدعادات نے خصوصاً اس ملک میں بہت غلبہ ڈالا ہُوا ہے۔ جس کی وجہ سے امن وچین کافور ہو چکے ہیں۔ اس لئے اس طرف زیادہ توجہ اور دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ جُوں جُوں گناہ اور غیریت کے اثرات زائل ہوتے چلے جائیں گے۔ اور اُن کی جگہ نیکی اور مُحبت کے اثرات قائم ہوتے جائیں گے۔ دل کی چلبلاہٹ اس کی تھرتھراہٹ اس کی بے چینی اس کی کود پھاند از خود کم ہوتی چلی جائے گی۔ غیریت اور نفرت کے جذبات آگ کی مانند ہیں۔ کیونکہ وُہ جوش اور سرسراہٹ پیدا کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے اُلفت اور بھلائی کے خیالات ٹھنڈے پانی کی طرح ہیں۔ کیونکہ وُہ سکون اور طمانیت پیدا کرتے ہیں

۲۔ دوسرا طریقہ یا سادھن دل کی تار کو ایک جگہ ٹھہرانا ہے۔ بعض محققین اس کے لئے کسی بیرُونی مقام پر مثلاً سامنے کسی شفاف اور گول چیز پر نظر جمانے کی نصیحت فرماتے ہیں۔ لیکن احسن طریقہ آنکھیں بند کر کے دِل کی تار کو اپنے دل کی جگہ یا پیشانی پر یا سر کی کھوپری کے پچھلے حصّہ کی طرف جمانا ہے۔ وہاں پر دو چیزوں کا خیال باندھا جائے۔ (۱) ایک نہایت خوبصورت کنول پھُول کا اور اس کے اندر جلتی ہُوئی شمع کی لو کا۔ اس روشنی کی مقدار زیادہ بڑھاتے جانا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر مالکِ برتر کے کسی نام کا ورد کیا جاوے۔ تو زیادہ

مفید ہے۔ لیکن تار کا جمائے رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ یہ ابھیاس مقررہ وقت پر مقررہ عرصہ کے لئے عین سورج چڑھتے وقت یا اس سے پہلے کرنا بہت مفید بیٹھتا ہے۔ پہلے تھوڑے وقت کے لئے شروع کیا جائے۔ پھر جیسے جیسے اس میں جی لگے۔ اس کو بڑھایا جائے۔ لیکن ہو باقاعدگی سے اور لگاتار۔

۲۔ جب بھی انسان فارغ ہو۔ خواہ کہیں ہو۔ یعنی جب بھی دل فارغ ہو۔ تو اس وقت پرماتما کا جو بھی نام پیارا لگتا ہو۔ اس کو سانس کے ساتھ ساتھ دل ہی دل سے بولے۔ یعنی نہ زبان سے ہلے نہ ہونٹ۔ سانس کو تیز یا ہلکا کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ سانس اپنی قدرتی رفتار سے چلتا رہے۔ ایک دفعہ سانس کے اندر جاتے وقت ایک دفعہ باہر نکلتے وقت اس نام کا ورد کیا جائے ایک سانس میں کئی بار نام کا ورد کرنے کی بجائے مفصلہ بالا طریقہ سے جپ کرنا دل کے ٹھہراؤ کے لئے زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ جتنا عرصہ اس طرح سے سانس کے اندر اور باہر کی رفتار کے ساتھ ورد جاری رکھا جائے گا۔ کوئی اور خیال دل میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ یہ ابھیاس کوشش کرتے رہنے سے عادت بن جائے گا۔ یعنی خود بخود ہونا شروع ہو جائے گا۔ اور اس طرح سے دل ہر طرح کے بیرونی خیالات سے پاک رہے گا۔ نام خواہ کوئی ہو۔ خواہ رام ہو۔ خواہ کرشن۔ خواہ ہری ہو۔ خواہ گوبند۔ خواہ واہگرو۔ خواہ ایشور۔ خواہ اللہ ہو۔ خواہ رحمان۔ خواہ گاڈ ہو۔ خواہ اہورامزدہ ایک بات کا خاص خیال رکھا جاوے۔ کہ ورد کرتے وقت ہر وقت یہ محسوس کیا جائے۔ کہ اس پاک نام کے ذریعہ دل میں خوشی اور سرور کی لہر جاری ہو رہی ہے۔

۳۔ جتنے اوصافِ حسنہ ہیں۔ مثلاً محبت۔ اُلفت۔ نیکی۔ بھلائی۔ خوش معاملگی خوش اخلاقی۔ شیریں کلامی۔ قناعت۔ پاکیزگی ان کا کچھ دیر کے لئے علی الصبح

بیٹھ کر دھیان کیا جائے۔ اور پھر ہر وقت چلتے پھرتے بھی ایسا ہی کیا جاوے۔ صرف ایک وصف کو ہی ایک وقت میں لینا چاہیئے؟ اس کا ابھیاس کم از کم ایک ماہ تک ہو۔ مثلاً نیکی ہے۔ اُس کی نسبت انسان سوچے کہ میں تو نیک پروردگار کا بچّہ ہوں۔ مَیں کیسے نیکی سے علیحدہ ہو سکتا ہوں۔ مَیں تو نیکی کا چشمہ ہوں۔ بیشک دُنیا میں ہر جگہ نیکی کام کر رہی ہے۔ سُورج ہمارے ساتھ نیکی کر رہا ہے۔ زمین۔ درخت۔ پھل۔ پھُول۔ دِن۔ رات ہر ایک چیز نیکی کرنے میں مشغول ہے۔ مَیں بھی ان کا ساتھی بنوں گا۔ مَیں بھی قدرت کا ایک جزو ہُوں۔ میرا رویّہ بھی قدرت کی باقی چیزوں کے مطابق ہوگا۔ بلکہ میرا قدم نیکی میں ان سے آگے بڑھے گا۔ مَیں اپنا تن۔ مَن۔ دھن نیکی کے لئے لگا دوں گا میرے مالک کی ذات نیک ہے۔ میری پیدائش اُسی ذات سے ہے۔ جیسے جو کچھ سونا ہوتا ہے۔ وہی سونے کا زیور بھی ہوتا ہے۔ ایسے ہی میں بھی نیک ذات سے نیک ہی پیدا کیا گیا ہوں۔ بے شک میں نیک ہی سوچونگا نیک ہی بولُونگا۔ نیک ہی کروں گا۔ نیک ہی دیکھوں گا۔ نیک ہی سنونگا۔ نیکی اور مَیں یک ذات ہیں۔ یک رنگ ہیں۔ ہم آہنگ ہیں۔ نیکی مجُھ سے اور مَیں نیکی سے جُدا نہیں ہو سکتے۔ نیکی میرا ورد ہے۔ نیکی میرا مقصد ہے۔ نیکی میری منزل ہے۔ نیکی میرے جسم کے ایک ایک حصّہ میں سرائت کر رہی ہے۔ میرے جسم کا بال بال نیکی سے لبریز ہو رہا ہے۔ نیکی کرنے کے لئے میں ہمیشہ تیار رہُوں گا۔ نیک آدمیوں کی ہی صحبت میں بیٹھوں گا۔ نیک ہی مقامات پر جاؤں گا۔ نیک خیالات دینے والی ہی کتابیں پڑھوں گا۔ نیکی کا پُتلا بن جاؤں گا۔ جب لوگوں نے نیکی کی کوئی زندہ مثال دینی ہوگی۔ وہ میرا نام لیں گے۔ مَیں خیال سے اور قول و فعل سے نیک ہونے کا ثبوت دُوں گا۔ مجھے جس کام پر میرے مالک نے لگایا ہے۔ اُس میں قدم قدم پر نیکی کا نمونہ پیش کروں گا۔ خواہ مَیں حاکم ہوں یا دوکاندار۔ اہلکار ہُوں یا مزدُور۔ خواہ میں

دولت مند ہوں یا غریب۔ نیکی کی قلم سے اور نیکی کے ہاتھوں سے اپنے فرائض کو سرانجام دوں گا۔ اس طرح سے ایک ماہ تک نیکی کا خیال ہر وقت سامنے رکھا جائے پھر خوش خلقی کو لے لیا جائے۔ پھر شیریں کلامی کو وغیرہ وغیرہ۔ اوّل تو ایک ہی نیک وصف کے مضبوط خیالات دل پر جمنے سے باقی کے اوصاف خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ یہ آپس میں سب بھائی بند ہیں۔ جب ان میں سے ایک کہیں اپنا پختہ طور پر قیام کر لیتا ہے۔ تو دوسرے اوّل اوّل اس کے ہاں مہمان کے طور پر جاتے ہیں۔ اور پھر وُہ بھی اپنا گھر وہیں بنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح سے ان سب کی مکمل بستی بس جاتی ہے۔

جب یہ جذبات اچھی طرح سے جاگزیں ہو جائیں گے۔ تو دل کی ہلچل بند ہو جائے گی۔

۵۔ دِل اکثر چاہتا ہے۔ کہ اس کا کہنا ہر موقعہ پر مانا جائے۔ لیکن اُس کا غلام نہ بننا چاہیئے۔ بلکہ اس پر کڑی نگرانی رکھنی چاہیئے۔ اور جب وُہ کوئی بُری خواہش کرے تو اس کی تعمیل سے انکار کر دینا چاہیئے۔

حکایت۔ ایک بزرگ کی روایت ہے۔ کہ باوجود خود ضبطی کی زندگی بسر کرنے کے ایک دن بازار میں چلتے ہوئے ان کا کھجوریں کھانے کو جی چاہا۔ پیسہ تو پاس تھا ہی نہیں۔ اس لئے کھجوریں کہاں سے لے سکتے۔ لیکن گھر پہنچ کر انہوں نے دِل کو بڑی کڑی ملامت کی۔ دُوسرے دن پھر وہاں سے گذرنے پر ویسی ہی حالت ہوئی۔ تب اُس بزرگ نے ایک پیسہ کہیں سے حاصل کر کے کھجوریں خریدیں اور پاس رکھ لیں۔ جب واپس مکان پر آئے۔ تو دل سے کہنے لگے۔ دیکھ اے دِل یہ وہی چیز ہے۔ جس کے لئے تُو نے دو دن متواتر میرے امن میں خلل ڈالا ہے۔ یہ چیز موجود ہے۔ لیکن تجھ کو نہیں ملے گی۔ اگر مَیں آج کھجوروں کے لئے تیرا

کہنا مان لُوں۔ تو کل تو حلوہ مانگے گا۔ پرسوں کوئی اور چیز مانگے گا۔ بھلا کبھی تیری فرمائشیں بھی پُوری ہو سکتی ہیں۔ ایسا کہہ کر اُنہوں نے وُہ کھجوریں ایک غریب آدمی کو دے دیں۔ چنانچہ پھر دل کو کبھی ایسی خواہش نہیں ہوئی اور چُپ چاپ زیرِ فرمان رہ کر چلنے لگا۔ برخلاف اس کے اگر اس کی خواہش پوری کی جائے۔ تو وُہی مثال ہوگی ؎

یکے بچۂ گرگ می پرورید چو پروردہ شد خواجہ برہم درید
چُل بر پہلوئے جاں سپردن بخفت جہاندیدۂ بر سرش رفت وگفت
چو دشمن بناز وطرب پروری ندانی کہ ناچار زخمش خوری

ترجمہ۔ ایک شخص نے بھیڑیئے کا بچّہ پالا۔ جب وہ بڑا ہُوا تو اس نے پالنے والے کو پھاڑ کھایا۔ جب اس کو دفنایا گیا تو ایک اہلِ نظر کا وہاں سے گذر ہُوا۔ اُس نے کہا۔ جو شخص اپنے دُشمن کو ناز و نعمت سے پالتا ہے۔ ایک نہ ایک دن اس کے ہاتھوں سے تکلیف اُٹھاتا ہے۔

اس لئے اس دل کے کہنے پر نہ چلنا چاہیئے۔ اس کا غلام بننے سے ہر حالت میں ذلّت اور خواری ہوتی ہے۔ شیخ سعدیؒ صاحب فرماتے ہیں ؎

مرد درپئے ہر چہ دل خواہدت کہ تمکینِ تن عزّ و جاں کاہدت
کند مرد را نفسِ امّارہ خوار
اگر ہوشمندی عزیزش مدار (سعدیؒ)

ترجمہ۔ دِل کی خواہشوں کے پیچھے نہ لگنا۔ ورنہ ظاہری عزّت اور باطنی منزلت کی خیر نہیں۔ نفسِ امارہ کی پیروی سے انسان ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ عقلمند انسان اُس کا کبھی گرویدہ نہیں ہوتا۔

پھر کرنا کیا چاہیئے۔ اس کے متعلق لکھا ہے کہ ؎

نفس راآں بہ کہ درزنداں کنی   ہرچہ فرمائد خلافِ آں کنی
کامِ نفسِ بدبرآوردن خطاست   زانکہ دشمن راپروردن خطاست

ترجمہ۔ نفس (جوخواہشات کا منبع ہے) کے متعلق تو یہی بہتر ہے۔ کہ اس کو زنجیروں میں جکڑا جائے۔ اور جو کچھ یہ کہے اس کے خلاف عمل کیا جائے۔ اس بُرے نفس کی خواہشات کو پُورا کرنا غلطی ہے۔ کیونکہ دشمن کو پالنا بڑی بھول ہے ؎

کبیرؔ صاحب نے بھی فرمایا ہے کہ

کبیر من گجند ہے آنکس دے دے راکھ

یعنی دل ہاتھی کی مانند ہے۔ اس کو آنکس لگا کر قابو میں رکھنا چاہیئے

حضرتِ داغؔ دہلوی نے خوب فرمایا ہے ؎

بعد مدت کے یہ اے داغ سمجھ میں آیا   وہی دانا ہے کہا جس نے نہ مانا دل کا

مشہور رومن پروفیسر مسٹر ایل۔ اے سینیکا لکھتے ہیں۔ کہ سب سے زبردست اور طاقتور اور شہزور انسان وُہی ہوتا ہے۔ جو اپنے دل پر قابو پاسکے۔ کیونکہ دِل اگر قابو میں ہو۔ تو وُہ انسان بادشاہ بنا رہتا ہے۔ اور اگر بے قابو ہو۔ تو بڑی ذلت وخواری اُٹھانی پڑتی ہے ؎

کبھی لاتا ہے خرابی کبھی کرتا ہے ذلیل
بادشاہی ہے اگر دل پر حکومت رکھے   (رنجبر)

یہ ایک حقیقت ہے کہ دُنیا میں دل سے بڑا نہ کوئی دوست ہے نہ دشمن اگر یہ بس میں ہے۔ تو اس جیسا دوست نہیں۔ اگر یہ خود مختار ہے تو اس کا سا دُشمن بھی کوئی نہیں ؎

نہ کوئی دوست ہے میرا نہ کوئی دشمن ہے
اگر یہی دل ہے مگر دوست ہے یا دشمن ہے   (جوشؔ)

۶۔ خوراک کا اثر بھی دِل کی ہلچل پر بہت ہوتا ہے۔ اس لئے خوراک کے

متعلق ان باتوں کا دھیان رکھنا چاہیئے :۔

الف ۔ دیکھنے میں بھلی معلوم ہو۔

ب ۔ زود ہضم ہو۔ سادہ لیکن اچھی ہو۔

ج ۔ بھوک رکھکر کھائی جائے

د۔ صاف جگہ پر عام لوگوں کی نظر سے بچا کر کھائی جائے۔

ہ۔ غذا نہ بہت گرم ہو۔ نہ بہت ٹھنڈی۔ نہ جلی ہوئی۔ نہ زیادہ خشک نہ کڑوی نہ سڑی ہوئی۔ نہ زیادہ چرپری۔ نہ زیادہ مرچ مصالحہ والی چٹپٹی۔

و۔ متضاد چیزیں نہیں کھانی چاہئیں یعنی جن کی آمیزش سے کیمیائی اثر کے ذریعہ ایک قسم کا زہر بن جاتا ہے۔ مثلاً دودھ اور کھٹائی۔

ز۔ ایسی چیزیں ہرگز نہ کھانی چاہئیں۔ جو دل میں جوش پیدا کریں۔ کیونکہ ان کے استعمال سے طبیعت میں غصہ بڑھتا ہے اور غصہ دل کے قابو کرنے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔

س ۔ اُصولاً غذا ایسی ہونی چاہیئے۔ جو جسم کی پرورش تو صحیح طور پر کرے۔ مگر جذباتِ سفلی کو مشتعل نہ کرے۔ اور VITAMINS صحیح اور موزوں اندازے پر ہوں۔

ص ۔ سب سے آخر مگر سب سے ضروری یہ بات ہے جو کچھ بھی کھایا جائے۔ وہ جائز طریقہ سے کمایا جائے۔ ایمانداری۔ سچی محنت اور نیک نیتی سے پیدا کی ہوئی روزی سے ہی اندرونی صفائی پیدا ہو سکتی ہے۔

منو بھگوان نے بہت قسم کی صفائیاں لکھی ہیں مثلاً جسم کی صفائی۔ کپڑوں کی صفائی۔ گھر کی صفائی وغیرہ۔ لیکن آخر میں لکھا ہے۔ کہ سب سے ضروری اور سب سے اعلےٰ صفائی کمائی کی ہے۔ کمائی میں اگر آلودگی یا ناپاکیزگی ہوگی۔ تو دل

کبھی دُرست نہیں ہوسکتا جتنی پاکیزہ کمائی ہوگی۔ اتنا ہی زیادہ دل پاکیزہ ہوجائیگا
۷۔ بہت زیادہ بولنا نہیں چاہیئے۔ بہت زیادہ باتیں کرنے کے کئی نقصانات
ہیں۔

اوّل۔ بہت زیادہ بولنے میں آدمی کئی باتیں بناوٹی۔ مبالغہ آمیز۔ جھوٹی۔
خودستائی کی۔ دُوسرے کی عیب جوئی کی کہہ جاتا ہے۔

میں بتاؤں آپ کو اچھوں کی کیا پہچان ہے
وُہ ہیں خود اچھے جو اَوروں کو نہیں کہتے بُرا

دوم۔ انسان کے ہر ایک عضو میں ایک بجلی بھری ہوئی ہے۔ وُہ جس حد تک قائم رکھی جائے۔ اسی قدر صحت کے لئے۔ دل پر قابُو پانے کے لئے اور خیالات کی یکسوئی کے لئے بڑی مفید ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ بجلی ہاتھ۔ آنکھ اور زبان میں ہوتی ہے۔ مسمریزم اور ہپناٹزم کے جتنے ابھیاس[۵] ہیں۔ وُہ ان تینوں اعضا سے کئے جاتے ہیں۔ جب کبھی کوئی رُوحانی ابھیاس کرایا جاتا ہے۔ تو اس میں بیٹھنے کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہوتی ہے۔ کہ ہاتھ سیدھے رکھو۔ یعنی ہتھیلی اُوپر کی جانب ہو۔ آنکھیں بند کرو اور خاموش ہوکر بیٹھو۔ اس کی غرض یہی ہوتی ہے۔ کہ وُہ بجلی یکجا ہوسکے۔ اس لئے بعض ہادی اس بات کی ہدائت فرماتے ہیں۔ کہ چلتے وقت مٹھی بند کرکے چلنا چاہیئے۔ ہاں قُدرت کے نظاروں کو دیکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ بلکہ وُہ ضرور دیکھنے چاہئیں۔ کیونکہ وُہ اس بجلی میں افزونی کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنی آنکھوں سے بُرے نظارے دیکھتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ وُہ اپنے جسم کی بجلی آنکھوں کے ذریعہ ضائع کرتے ہیں۔ ایسے ہی زیادہ بولنے والے کی بجلی زبان کے ذریعہ خارج ہوتی جاتی ہے۔ آپ نے پڑھا اور سُنا ہے۔ کہ بہت سے بزرگ مثلاً مہاتما گاندھی ہفتے میں کم از کم ایک دن مکمل خاموشی

[۵] مشقیں

اختیار کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک اخبار کے ایڈیٹر کی بابت نکلا ہے۔ کہ وُہ سال میں ایک ماہ خاموشی کا برت لیتا ہے۔ اپنا کام ایڈیٹری کا اور دوسرا بھی کرتا ہے۔ اور اپنی ضروریات کو یا اپنی بات کو لکھکر یا اشاروں سے سمجھا دیتا ہے زبان سے کچھ نہیں کہتا۔ اس نے اپنے اس تجربہ کی بنا پر لکھا ہے۔ کہ ایک ماہ کی خاموشی کے بعد اس کے خیالات میں زیادہ یکسوئی۔ دل میں زیادہ طاقت اور سکون اور حافظہ میں زیادہ قوت آجاتی ہے

خموشی لعل ہے درج دہن میں مت کھونا جو بات چیت ہے چاندی خموشی ہے سونا

اکثر مہاتما اور بزرگ لوگ کم بولتے ہیں۔ وُہ بلاوجہ نہیں۔ اس کے اندر بھی ایک راز ہے۔ کہ زیادہ بولنے سے دل میں بہت ہلچل اُٹھتی ہے۔ تبھی تو کہا ہے

جو ہُوا کامل وُہ کرتا ہے خموشی اختیار
ماہِ تو جب بدر ہوگا بے زباں ہو جائیگا (گویا)

انگلستان کے مشہور مصنّف مسٹر ڈبلیو ہین لکھتے ہیں۔ کہ خاموشی دل کا سکون ہے۔ اور روح کے لئے وُہی درجہ رکھتی ہے۔ جو جسم کے لئے نیند۔ یہ رُوح کی خوراک اور تفریح ہے۔ یہ ایک بہت بڑا وصف ہے۔ اس سے انسان کی جہالت ڈھکی رہتی ہے۔ راز افشا نہیں ہوتے۔ جھگڑے کھڑے نہیں ہوتے اور انسان گناہ سے بچتا ہے۔ تبھی تو کہا ہے

خموشی معنیٔ دارد کہ در گفتن نمی آید بطبعم ہیچ مضمون بہ ز لب بستن نمی آید

ترجمہ۔ خموشی میں ایسے معنی پنہاں ہیں۔ جو احاطۂ بیان میں نہیں سما سکتے میری سمجھ میں چُپ رہنے سے زیادہ اچھا مضمون اور کوئی نہیں۔

رسُولِ کریمؐ سے روایت ہے۔ کہ میں تمہارے لئے بہشت میں مقام دلانے کا ضامن ہوں۔ اگر تم دو باتوں کا عہد کرو۔ اوّل یہ کہ جو عضو تمہاری دو رانوں

کے درمیان ہے۔ اس کو قابو میں رکھو اور دوم یہ کہ جو عضو تمہارے دو ہونٹوں کے درمیان ہے اس پر تسلّط رکھو۔

امریکہ کی مشہور مصنّفہ مسز ایس جے ہیل لکھتی ہیں۔ کہ ہمارے پاکیزہ ترین خیالات کی عبادت گاہ خاموشی ہے ؎

یاد دارم از صدف ایں نکتۂ سربستہ را
سینہ ہا را خامشی گنجینۂ گوہر کند   (عطّار)

ترجمہ سیپی نے جو یہ راز کی بات بتائی وُہ مجھے یاد ہے۔ کہ خاموشی دلوں کو موتیوں کا خزانہ بناتی ہے۔

ایک دانا نے لکھا ہے۔ کہ دل کو دُرست رکھنے کے لئے یہ اُصول بناؤ۔ کہ جہاں نہ جانے سے کام چل سکتا ہے۔ وہاں نہ جاؤ۔ جس بات کے نہ کہنے سے کام چل سکتا ہو۔ وُہ نہ کہو۔ جس چیز کے نہ ہونے سے کام چل سکتا ہے۔ اس کے حاصل کرنے کی کوشش مت کرو۔ جس کام کے نہ کرنے سے دفع الوقتی ہو سکتی ہے۔ وُہ نہ کرو۔

۸۔ ایک اور بات جو دل پر فتح پانے میں ممد ہوتی ہے۔ وُہ اچھی اچھی کتابوں کا پڑھنا ہے۔ مذہبی اور اخلاق آموز کتابوں کا مطالعہ ازبس مفید ہوتا ہے۔ گندے ناول یا عشقیہ قصّے کہانیاں پڑھنا بہت مضر ہے۔ غضب یہ ہے۔ کہ جہاں دیکھو سٹیشنوں پر۔ گاڑیوں میں میلوں پر۔ اور دیگر مجمعوں کے موقعوں پر۔ لوگ اپنے چند پیسوں کی خاطر قوم کے نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے والے ناول اُٹھائے پھرتے ہیں۔ کوئی ایسا انتظام ہونا چاہیئے۔ کہ جو چھاپہ خانہ ایسی بیہودہ اور مخربِ اخلاق کتابیں چھاپے یا جو آدمی بیچے اس کے لئے سزا ہو۔ جس طرح سے سیاسی مضامین کی کتابوں کے متعلق قانون ہے۔ ایسا ہی قانون ان لچر اور بداخلاقی

کے پلندوں کے بارہ میں ہونا چاہیئے۔ جب تک ایسا قانون نہیں بنتا۔ سوسائٹی کو یہ کام اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے۔ پلیٹ فارم پر۔ اور اخبارات میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے۔ اور پبلک کو اس کے مضر اثرات سے آگاہ کیا جائے۔ سوسائٹی ایسی کتابیں چھاپنے والے پریسوں کا اور بیچنے والے دکانداروں کا بائیکاٹ کرے۔ میرا اپنا خیال ہے۔ کہ جس قدر بداخلاقی تھیٹر۔ سینما اور ناولوں نے اس ملک میں پھیلائی ہے۔ شائد ہی کسی اور چیز نے اتنا نقصان کیا ہو۔ اگر میرے بس کی بات ہو۔ تو یکلخت سب سینما تھیئٹر بند کرائے جائیں۔ اور ناول جہاں بھی ہوں۔ جلائے جائیں۔ اور آئندہ کے لئے حکماً بند کرائے جائیں۔

سر ڈوگلڈ زہیرلڈ لکھتے ہیں۔ کہ سب سے قابل قدر ساتھی کتاب ہے لیکن وہ کتاب کہ جو خوب غور سے منتخب کی گئی ہو۔ ایسی کتاب زندگی کی بہترین دوست ہوتی ہے۔

۹۔ اپنے دِل کو عبادت گاہ سمجھ کر اس کے اندر مالک کے جلوے کی پرستش کی جائے۔ تو اس سے بھی دل کے سکون میں بہت امداد ملتی ہے۔ یہ صرف فرض کرنے کی ہی بات نہیں ہے۔ حقیقت میں بھی انسانی دل کے اندر ربّی تجلّی ہے۔ کبیر صاحب نے فرمایا ہے۔

جیوں تل ماہیں تیل ہے جیوں چقمق میں آگ تیرا سائیں تجھ میں ہے جاگ سکے تو جاگ

برچھ جو ڈھونڈے بیج کو بیج برچھ کے ماہینہ
جیو جو ڈھونڈے پیو کو پیو جیو کے ماہینہ (کبیر)

ترجمہ۔ جیسے تلوں میں تیل ہوتا ہے۔ اور چقماق پتھر میں آگ ہوتی ہے۔ اسی طرح سے اے انسان! تیرا مالک تیرے اندر موجود ہے۔ اگر تو اس کو دیکھ سکتا ہے تو دیکھ۔

درخت جو اپنے بیج کو تلاش کرتا ہے۔ بیج تو درخت کے اندر ہی موجود ہے۔
اسی طرح سے انسان جو اپنے مالک کو ڈھونڈتا ہے۔ وہ اُس کے اندر ہی ہے۔

پھر سُندر کوی نے کہا ہے ۵

آپ ہی کے گھٹ میں پرگٹ پرمیشور ہے — تا ہنہ چھاڑ بھول نر دُور دُور جات ہے
کوئی دَورے دوار کا کوئی کانشی جگن ناتھ — کوئی دَورے متھرا کوئی ہر دوار نہات ہے
کوئی دَورے بدری کو وشم پہاڑ چڑھے — کوئی تو کیدار جات من میں سہات ہے

سُندر کہت گورو دیو دئے دبیہ نین
دُور ہی کے دُور بن اندر دکھات ہے

ترجمہ۔ انسان کے اپنے اندر پرمیشور موجود ہے۔ اس کو چھوڑ کر غلطی سے انسان دُور جاتا ہے۔ کوئی دوار کا نگری کو دوڑتا ہے۔ کوئی کانشی اور جگن ناتھ کو۔ کوئی متھرا نگری کو اور کوئی ہر دوار جا کر اشنان کرتا ہے۔ کوئی بدری نارائن کو جانے کے لئے سخت پہاڑوں پر چڑھتا ہے۔ کوئی کیدار ناتھ جا کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن سُندر کوی جی فرماتے ہیں۔ کہ پیر و مُرشد نے ہم کو چشمِ بصیرت دے کر بغیر دُور جانے کے اندر ہی اس کے دیدار کرا دئے ہیں۔

رسُول کریمؐ سے ایک روائت ہے:۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ⁂ (مُسلم)

ترجمہ: جس نے اپنے اندر کو پہچان لیا۔ بیشک اُس نے اپنے مالک کو پہچان لیا۔

گورُو گرنتھ صاحب میں ذیل کا واک[۵] آیا ہے:۔

دھنا سری محلہ ۹

کاہے رے من کھوجن جائی
سرب نواسی سدا الیپا توہی سنگ سمائی

[۵] فرمان

ایک رہاؤ

پُہپ مدھ جیوں باس بست ہے مکر ماہیں جیسے چھائی
تیسے ہی ہر بسے نرنتر گھٹ ہی کھو جو بھائی
باہر بھتیرا ایکو جانو ایہہ گور گیان سنائی
جن نانک بِن آپا چینے مٹے نہ بھرم کی کائی

ترجمہ :۔ اے دِل تُو کیوں باہر تلاش میں سرگرداں ہے۔ وُہ حاضر ناظر اور ہمیشہ بے کوٹ مالکِ کُل تو تیرے اندر ہی سمایا ہُوا ہے۔
جیسے پھُولوں میں خُوشبُو ہوتی ہے۔ اور جیسے شیشے میں عکس ہوتا ہے۔ ایسے ہی وُہ مالکِ ازلی انسان میں ہے۔ اس لئے اندر ہی کھوج کرنی چاہیئے۔ پیر و مُرشد نے یہ رمز بتائی ہے۔ کہ وُہ مالک اندر اور باہر ایک سا ہی ہے گوُرو نانک دیوجی فرماتے ہیں۔ کہ اپنے اندر پہچانے بغیر جو بھرم کی کائی جمی ہوئی ہے۔ وُہ دُور نہیں ہو سکتی ؞

پھر کہا ہے ؎

قفل را بکشا کہ مالِ بیکراں در کفِ خود آر از گنجِ نہاں
کاندراں لعل و گہر بسیار ہست از متاعِ لُولُوئے شہوار ہست
ہر چہ می خواہی ز گنجِ بے شمار
آیدت در دست اے عالی تبار (مولانا روم)

ترجمہ :۔ اپنے اندر کا تالا کھول اور وہاں کے پوشیدہ خزانہ سے بے انداز دولت اپنے قبضہ میں لے۔ تیرے اندر لعل و گوہر کی بڑی بھاری کان ہے۔ بڑے قیمتی موتیوں سے اٹی پڑی ہے۔ اے عالی نثراد اندر سے بے شمار خزانہ تیری حسب خواہش تیرے قبضہ میں آسکتا ہے ؞

اور بھی کہا ہے ؎

حیراں ہُوں نہایت آخر یہ ضبط کیا ہے
کس دوست گم شُدہ کو جنگل میں ڈھونڈتا ہے

تجھ کو طلب ہے جسکی دونوں ہیں اس سے خالی
دروازہ کھول دل کا دیر و حرم میں کیا ہے

کرتا ہے جبہ سائی کیوں مقبروں میں غافل
تو دل کی زندگی کو مُردوں سے مانگتا ہے

دل ہے تو سب کہیں ہے ورنہ کہیں نہیں ہے
کیا خُوب قول تیرا اے جوشِ بے نوا ہے

کس نیند میں ہے بندے اندر تیرے خُدا ہے

اس لئے اپنے دل کو ایک نہایت پاکیزہ معبد سمجھو۔ اس کے اندر نورِ الٰہی کا مقام پہچانو۔ اور جو کام کرو۔ اس کا دھیان کر کے کرو۔ جو کھاؤ اس کی نذر کر کے کھاؤ۔ جو پیئو۔ اس کی بھینٹ کر کے پیئو۔ جُوں جُوں یہ مشق بڑھتی جائے گی۔ دِل کا مقام حقیقتاً پاک و طہُور بن جائے گا۔ اور اس میں کوئی پراگندگی یا آلودگی کے خیالات جگہ نہ پا سکیں گے۔ اور اس طرح سے حقیقی سکون یا طمانیت حاصل ہو جائے گی۔

۱۰۔ ایک اور بات جس سے اس مقصد کو تقویت مل سکتی ہے۔ وُہ صحت اور طاقت کو ٹھیک رکھنا ہے۔ کمزور آدمی کا دل بھی کمزور رہتا ہے اور اس میں بہت گڑبڑ رہتی ہے۔ توانا اور مضبُوط آدمی کا دل کچھ سادھن کرنے سے جلدی قابُو میں آجاتا ہے۔ اس لئے جسمانی طاقت کو حاصل کرنے اور برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ کوشش کرنی چاہیئے۔ انگریزی مثل ہے:۔

A SOUND MIND IN A SOUND BODY

یعنی تندرست جسم کے اندر ہی تندرست دِل رہ سکتا ہے۔ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے روزانہ ورزش، صفائی، کھلی ہوا میں رہنا۔ پُوری نیند لینا۔ خوراک کے متعلق احتیاط رکھنا وغیرہ ضرُوری اُصول ہیں۔ طاقت کو قائم رکھنے کے لئے انسان کو

پرہیز پر یہ کا دھیان رکھنا چاہیئے۔ علمِ طب کے ماہرین بتاتے ہیں۔ کہ جو خوراک کھائی جاتی ہے۔ اس کا پانچ دن میں رس تیار ہوتا ہے۔ پھر پانچ دن میں خون بنتا ہے۔ پھر ہڈی۔ گوشت۔ چربی وغیرہ تیار ہو کر پینتیس دن کے بعد ویریہ یا منی کی شکل میں آتا ہے۔ یعنی اتنے کیمیائی تغیرات کے بعد یہ رسوں کا رس حاصل ہوتا ہے۔ اور اس لئے یہ قابلِ قدر چیز ہوتی ہے۔ بعض کتابوں میں اس کو "جلال" اور "تیج" کے نام سے پکارا گیا ہے۔ کیونکہ واقعی اس کے رہنے سے ہی جسم میں تیج اور جلال قائم رہ سکتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ اس قیمتی چیز کو بڑی بے دردی سے ضائع کرتے ہیں اور بڑی لاپرواہی سے اس خزانے کو لٹاتے ہیں۔ جن جن شرمناک طریقوں سے اس دُرِ بے بہا کو پھینکا جاتا ہے۔ اس کے لکھتے ہوئے شرم ہی نہیں آتی۔ بلکہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بہر حال جہاں تک ہو سکے اس کی حفاظت لازم ہے۔ جو اشخاص اوائل عُمر سے ہی اس کی مکمل حفاظت کر سکیں۔ وُہ مبارک ہیں لیکن ایسے خُوش قسمت لوگ بہت کم ملتے ہیں۔

۱۱۔ ایک اور طریقہ دِل کے ٹھیراؤ کا یہ ہے۔ کہ انسان اپنے ہر ایک کام میں باقاعدگی رکھے۔ اُٹھنا۔ سونا۔ کھانا وغیرہ جو بھی روزانہ زندگی کے کام ہیں اُن کے اندر پُوری پُوری باقاعدگی ہو۔ اپنے اخلاق اور برتاؤ میں بھی باقاعدگی ہو۔ تو دِل بھی باقاعدگی کے اُصول میں بندھ جاتا ہے۔ اور اپنی من مانی کارروائی نہیں کرا سکتا۔ بلکہ باقاعدگی سے بندھا ہُوا تابعِ فرمان ہو کر چلتا ہے۔ باقاعدگی کی نسبت حضرت غالب نے بہت خوب کہا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری عینِ ایماں ہے
مرے گر دیر میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو (غالب)

یعنی باقاعدگی عمل کا وُہ درجہ ہے۔ کہ اس پر عمل پیرا رہنے والا اور بت خانہ

میں مرنے والا برہمن بوجہ اپنی باقاعدگی کے اس بات کا مستحق ہے۔ کہ اُس کو کعبہ میں دفنایا جاوے۔

۱۲۔ ایک آخری لیکن نہایت ضروری طریقہ جو سکونِ دل حاصل کے لئے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ وُہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک انسان کو دوست کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ جو بھی ملے۔ خواہ وُہ کسی ذات کا ہو۔ کسی ملت کا ہو۔ کسی رنگ کا ہو۔ اُس کو اپنا ہم جنس بھائی اور اپنا خیر خواہ سمجھا جائے ؎

رندِ مشرب ہوں میرا مہر و محبّت ہے طریق
نہ مسلماں سے کاوش نہ خلش ہندو سے (رندؔ)

زندگی کے دن کیسے گذارنے چاہئیں۔ اور کن خیالات کو دل میں رکھ کر ہر ایک انسان سے برتاؤ کرنا چاہئے۔ کہا ہے ؎

برہمن برہمن سمجھے مسلماں اہلِ ایماں میں
بسر کر اس طرح سے زندگی گبر و مسلماں میں (رندؔ)

جن لوگوں کا مختلف شریعتوں کی وجہ سے باہمی اختلاف ہے۔ اور اسی لئے وُہ آپس میں بر سرِ پیکار رہتے ہیں۔ یا جھگڑے کرتے ہیں یا ایک دُوسرے کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اُن سے کہہ دینا چاہئے ؎

یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں
اگر مجھ سے کوئی پُوچھے کہوں دونو کا قائل ہوں (اکبرؔ الٰہ آبادی)

مَیں تو اپنے ذاتی تجربہ سے عرض کر سکتا ہوں۔ کہ اس قسم کا نقطۂ نگاہ رکھنا اتنا راحت افزا اور اتنا لطف اندوز ہوتا ہے۔ کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ دُنیا میں انسان کو اپنے اپنے گھر کے جھگڑے کیا کم ہیں۔ کہ وُہ بے وقوفی سے یہ مزید قضیئے پھیر کر اپنی زندگی کو عذاب میں ڈالے۔ مَیں تو اکبرؔ کے قول کا بالکل قائل ہوں ؎

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونو موافق اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونو
ترانے میرے ہم آہنگ دیر و کعبہ ہیں یکساں
زباں پر میری موزوں ہوتی ہے حمد اور بھجن دونو (اکبرؔ)

جو انسان ایسی نگاہ رکھے گا۔ کہ سب کو بھائی اور دوست سمجھے۔ اس زندگی میں تو وُہ اس کا نیک ثمر دِلی طمانیت کی شکل میں پائیگا ہی لیکن موت کے بعد بھی ؎

دوستی تھی مجھے ہر اک سے گئے تا درِ قبر
دوش پہ نعش میری گبرو مسلماں لے کر (مصحفیؔ)

سمجھتے ہو یہ جھگڑے کس بات کے ہیں۔ ان کی تہ میں کیا راز ہے۔ کیا دھرم اور ایمان کا پیار ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا قوم کی خدمت؟ مطلق نہیں۔ کیا شریعت سے پیار؟ بالکل نہیں۔ تو حقیقت کیا ہے۔ خاقانیٔ ہند ذوقؔ نے اس کو یوں بیان کیا ہے ؎

کیسا مومن کیسا کافر، کون ہے صُوفی کیسا رند
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے یہ فنر کے جھگڑے ہیں (ذوقؔ)

اُوپر صرف بارہ طریقے مشق کے عرض ہوئے ہیں۔ اور بھی بہت سے ہیں۔ لیکن ان میں سے چند ایک پر بھی اگر عمل ہو جائے۔ تو دلی مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ انسانی دل فطرتاً نادان بے سمجھ بچے کی طرح ہوتا ہے۔ بات بات پر مچلتا ہے۔ بات بات پر ضد کرتا ہے۔ رُوٹھتا ہے۔ منتا ہے۔ روتا ہے۔ ہنستا ہے۔ اس کی یادداشت بڑی ہے اور بھول کا بھی پتلا ہے۔ کبھی ڈرانے سے ڈر جاتا ہے کبھی محض پیار پچکار سے راہِ راست پر لگ جاتا ہے۔ اس کے حسبِ حال پرورش کا سامان میسر آ جائے۔ تو پھر کیا کہنے ہیں۔ اس کا حال اچھا ہو تو ماضی و استقبال کا آئینہ ہے۔ گردِ کدورت سے دَب جائے۔ تو بے خبری و بے خردی۔ بدباطنی اور بدعملی کا مجسّمہ ہے ؞

اِنسان اَور اُس کے خیالات

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دُنیا کے اندر ہزاروں قسم کی طاقتیں ہیں۔ مثلاً جسمانی طاقت۔ دولت کی طاقت۔ رشتہ داروں کی طاقت۔ قانون کی طاقت۔ بادشاہ کی طاقت۔ فوج کی طاقت یہ ساری طاقتیں اپنے اپنے دائرہ میں اپنا کافی زور دکھاتی ہیں لیکن دُنیا کی سب طاقتوں سے بڑھ کر ایک طاقت ہے جس کو خیال کی طاقت کہتے ہیں۔ خیال کی طاقت سے زیادہ زبردست اور زیادہ تیز کوئی طاقت نہیں ہے۔ ریل گاڑی موٹر جہاز اور طیارے[۱] بڑی رفتار سے دوڑ لگاتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر ہوا کی رفتار ہے۔ اس سے بھی زیادہ روشنی کی رفتار ہے۔ جو کہ ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کی رفتار سے جاتی ہے۔ لیکن آپ سُن کر حیران ہوں گے۔ کہ اگر خیال کی طاقت کو ٹھیک طور پر سدھایا جاوے۔ تو خیال .... ۸ آٹھ پدم میل فی سکنڈ کی رفتار سے جا سکتا ہے۔ یہ سب دنیا خیال کا ہی نتیجہ ہے۔ دُنیا کی پیدائش کے متعلق لکھا ہے۔ کہ خالقِ ازلی نے خیال کیا۔ کہ میں ایک سے زیادہ ہو جاؤں بس اُس خیال کا نتیجہ ہی یہ ساری کائنات ہے۔ دُنیا کے اندر اور بھی جتنی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وُہ سب خیال کے ہی کرشمے ہیں۔ مثلاً جتنے مکانات ہیں۔ وُہ ان کے مالکوں اور تعمیر کنندوں کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ باغ کے اندر پودے پھل۔ میوے اور پھول وغیرہ مالی کے خیال کا نتیجہ ہیں۔ رنگارنگ کے خوبصورت

[۱] ہوائی جہاز

کپڑے بُننے والوں کے خیال کا نتیجہ ہیں - ریل کا انجن - تار - ٹیلیفون - ہوائی جہاز وغیرہ اُن کے مُوجدوں کے خیال کا نتیجہ ہیں - سامانِ حرب بھی خیالات کا ہی کرشمہ ہیں - غرضیکہ دُنیا کے اندر جس چیز کو دیکھئے خواہ قدرت کی پیدا کی ہُوئی ہے خواہ انسان کی - وُہ ایک خیال کا ہی نتیجہ ہے -

خیال کی تیزی اَور طاقت کی نسبت اُوپر عرض ہو چکا ہے - یہ طاقت ہر ایک انسان کے اندر موجُود ہے - اس کو جتنا چاہے وُہ بڑھا سکتا ہے - اَور اُسے جدھر چاہے لگا سکتا ہے - اَور اُسی طاقت کے ذریعہ جو کچھ وہ بننا چاہتا ہے بن سکتا ہے - یہ سب کچھ اس طاقت کے استعمال پر منحصر ہے - دنیا کے اندر بعض انسانوں نے اس خیال کی طاقت کو استعمال کر کے بڑی بڑی ایجادیں کیں - جو دُنیا کو فائدہ پہنچا رہی ہیں - اور بعض نے زہریلی گیسیں اَور کلدار توپیں بھی اُسی خیال کی طاقت سے بنا ڈالیں - جن سے دُنیا کے اندر تباہی مچ سکتی ہے اَور مچ رہی ہے - اسی خیال کی طاقت سے لوگ فرشتے اَور دیوتے بن گئے - اَور اسی خیال کی طاقت سے شیطان کے بڑے بھائی بن گئے - یہ طاقت مسلمہ ہے اس کا جیسا استعمال کیا جائے گا - اس کا ویسا ہی نتیجہ حاصل ہوگا -

ہر ایک کام کرنے سے پہلے اس کا نقشہ خیال کی شکل میں بندھتا ہے - اَور اس نقشے کے بننے کے بعد ہر ایک کام کا آغاز ہوتا ہے - فرض کیجئے ایک لکڑی کا ٹکڑا ہے - ایک بڑھئی اس کو دیکھ کر اپنے خیال میں ایک الماری کا نقشہ باندھتا ہے - جو اس ٹکڑے سے تیار کی جا سکتی ہے - پھر اس نقشے کے مطابق لکڑی کو چیر کاٹ کر اس خیال کو عمل کی شکل میں لے آتا ہے - ایک انسان کے پاس روپیہ ہے - وہ دِل میں خیال کرتا ہے - کہ اس سے ایک خیراتی ہسپتال یا ایک یتیم خانہ تیار کرا دیا جائے - پس اس روپیہ کے ذریعہ وُہ اپنے خیال کے نقشے کو

عملی شکل دے دیتا ہے۔ ایک چور یا ایک قاتل اپنے خیال میں چوری یا قتل کا ارادہ کرتا ہے۔ اور پھر کسی ذریعے استعمال کر کے اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیتا ہے۔ غرضیکہ اچھے یا بُرے کام دنیا میں جو ہو رہے ہیں۔ وُہ خیال کی طاقت کا ہی نتیجہ ہیں۔ ان کا مفید یا نقصان دہ ہونا اچھا یا بُرا ہونا اس نقشے پر منحصر ہے۔ کہ جو اُن کو عملی شکل میں لانے سے پہلے خیال کی شکل میں باندھا گیا۔

حکایت: ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک متمول آدمی لاولد تھا۔ اس کا بھتیجا اپنے چچا کی جائیداد پر آنکھ رکھتا تھا۔ انجام کار بھی شائد وُہ دولت اس کے چچا کے فوت ہونے پر اس کے حصّہ میں آتی۔ لیکن اسکی خواہش انتظار کے راستہ میں حائل تھی۔ اپنی خواہش کو فی الفور پورا کرنے کے لئے اس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا۔ کہ چچا کی زندگی کا فوراً خاتمہ کیا جائے۔ بس وُہ خیال زور پکڑنے لگا۔ دن رات وہ اسی دُھن میں رہتا تھا۔ ایک رات وُہ سویا ہوا خواب کے اندر اُنہی خیالات کے زیر اثر بڑبڑانے لگا۔ اُس کی ایک بہن تھی۔ جو ایک نہائت پاک ضمیر لڑکی تھی۔ وُہ جاگ رہی تھی۔ وُہ اپنے بھائی کی آواز سُن کر چوکنی ہو گئی۔ اور دھیان سے سُننے لگی۔ خواب میں وُہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں ہاں مَیں چچا کو زہر دُوں گا۔ اُس کو راہیٔ ملکِ عدم کر دوں گا۔ جو دولت ہاتھ آئے گی۔ اُس میں سے کچھ حصّہ خرچ کر کے قتل کو چھپا لُوں گا۔"

بہن کی حیرت کی حد نہ رہی۔ وُہ کچھ دنوں سے بھائی کو کچھ غیر معمولی اضطراب کی سی حالت میں دیکھتی تھی۔ آج اس کو پتہ لگ گیا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ بہن کے دل میں ایک خیال اُٹھا۔ کہ "چچا کی زندگی بچانی چاہیئے"۔ بھائی کو وہ کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ وُہ لالچ سے اندھا ہو کر پہلے اسی کو ٹھکانے لگا دے۔ اور پھر اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہو۔ لڑکی ہر وقت اپنے بھائی کی حرکات

کی احتیاط سے نگرانی کرنے لگی ۔ ایک دن اس کا چچا بیمار ہو گیا ۔ لڑکے نے یہ موقعہ غنیمت جانا ۔ اندر جا کر اپنے آپ سے کہنے لگا (پاپ اور گناہ انسان کو پاگل بنا دیتے ہیں) ہاں بس یہ کافی ہوگا ۔ موقعہ بھی اچھا ہاتھ لگا ہے ۔ ہاں اب میں چلتا ہُوں ۔ لڑکا ایک پُڑیا اپنی جیب میں ڈال کر اس اپنے خیال کی تکمیل کے لئے اپنے چچا کی زندگی پر ہاتھ صاف کرنے کو روانہ ہوا ۔ بہن نے بھی یہ الفاظ سُن لئے ۔ وُہ بھی آنکھ بچا کر اس کے پیچھے پیچھے اپنے خیال کی تکمیل کے لئے چل پڑی ۔ لڑکے نے جا کر چچا سے کہا ۔ کہ میں ایک بڑی فوری اثر دکھلانے والی دوائی لایا ہُوں ۔ اور ایک گلاس میں گھول کر اپنے چچا کو پلانے لگا ۔ لڑکی جھٹ سے اندر داخل ہوئی اور گلاس کو ہاتھ مار کر زمین پر گرا دیا ۔ لڑکا کچھ گناہ کی آگ سے جل چکا تھا ۔ کچھ اس واقعہ کے تازیانہ سے اور کچھ آنے والی ندامت کے خیال سے ایسا متاثر ہوا ۔ کہ زمین پر بے ہوش ہو کر گر گیا ۔ اور پھر نہ اُٹھ سکا ۔ اس آدمی کو اپنی بھتیجی سے سارے واقعات سے آگاہی ہوئی اُس نے اپنی حیات میں ہی لڑکی کو وارث قرار دے کر سب جائیداد اُس کے حوالے کر دی ۔

یہ قصہ بڑا سبق آموز ہے ۔ اور خیال کی طاقت کو اور اُس کے نتائج کو اچھی طرح سے واضح کرتا ہے ۔ دیکھئے لڑکے کے خیالِ بد نے کیا صُورت پکڑی ۔ اور اس کو کیا سزا ملی ۔ لڑکی کے نیک خیال نے کیا شکل اختیار کی ۔ اور اُس کو کیا اجر ملا ۔ اسی طرح سے دنیا میں ہر ایک خیال خیال کرنے والے کے لئے نیک اور بد نتائج پیدا کرتا ہے خیالات کی پاکیزگی انسان کی ترقی کا باعث بنتی ہے ۔ اور خیالات کی ناپاکی گراوٹ کا باعث بن جاتی ہے ۔ دل کے اندر ایک نیکی اور بدی کا پیمانہ لگا ہُوا ہے ایک نیک خیال کے دل میں آنے سے ہی اس آلے کا پارہ چڑھ جاتا ہے اور ایک بد خیال کے آنے سے وُہ پارہ نیچے کی طرف گر جاتا ہے ۔

ہمارے بزرگ اس راز سے بخوبی واقف تھے۔ اور ہمارے مذہبی پیشوا بھی خیال کی طاقت کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ اس لئے ہماری مذہبی کتبِ مقدسہ کے اندر جگہ جگہ پر احکام ملتے ہیں۔ کہ انسان ہمیشہ اپنے خیالات پاکیزہ رکھے۔ خیالات کی پاکیزگی صحتِ جسمانی کے لئے بڑی لازمی ہے۔ جسم کے اندر سب سے ضروری اور اہم کام خُون کے دورہ کا ہے۔ دِل پھیپھڑے وغیرہ جتنے اعضائے رئیسہ ہیں۔ وُہ خون کے بنانے اور اس کو صاف کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جہاں خون کے اندر کوئی نقص آیا۔ اُسی وقت کئی قسم کے امراض لاحق ہو جاتے ہیں۔ اگر خون کا دورہ باقاعدہ رہے۔ تو جسم تندرست رہتا ہے۔ خُون کے دورہ میں اندازہ سے زیادہ نہ تو تیزی ہونی چاہیئے نہ سُست رفتاری۔ مقررہ رفتار میں کمی ہونے سے جسم کمزور ہو جاتا ہے اور تیزی ہونے سے خون میں زیادہ گرمی ہو جاتی ہے۔ زیادہ گرمی ہو جانے کی وجہ سے جسم میں جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ علم طب کا ایک مسلمہ اُصول ہے۔ ماہرینِ علم طب نے تجربوں سے ثابت کیا ہے۔ کہ جس وقت انسان کے اندر شہوت، غصہ اور نفرت کے جذبات کام کر رہے ہوں۔ تو اس کا خُون تیزی سے چکر کھانے لگتا ہے جس کی وجہ سے خُون میں اُبال آتا ہے اس کی وجہ سے جسم میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ کئی قسم کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس لئے لازمی ہے۔ کہ خُون کے دورہ کو باقاعدہ رکھا جائے۔ اور کوئی ایسی حالت پیدا نہ ہونے دی جائے کہ جس سے اس میں کمی یا بیشی ہو۔ اچھے یا بُرے خیالات کا اثر دِل پر پڑتا ہے۔ دل زیادہ خوشی کے وقت اچھلتا ہے۔ دِل کی حرکت کا اثر خُون پر پڑتا ہے۔ اور خون بھی اچھلتا ہے۔ اگر خیالات نیک ہوں گے۔ تو دِل سکُون اور شانتی میں رہ کر خُون کے دورہ کو باقاعدہ رکھے گا۔ لیکن ناپاک خیالات کے آتے ہی نفرت، غصہ اور کمینہ پن کے جذبات دل کے اندر عود کریں گے۔ جس کی وجہ سے دِل کی دھڑکن تیز ہو جائیگی

اور اسی تناسب سے خون کے دَورہ میں تیزی آجائے گی جس کے نتائج بد اُوپر عرض ہو چکے ہیں۔ لہذا صحتِ جسمانی کو دُرست رکھنے کے لئے بھی خیالات میں پاکیزگی رکھنا لازمی ہے۔

خیالات کی پاکیزگی درازیٔ عُمر کا بھی ذریعہ ہوتی ہے۔ یہ کسی اور جگہ بھی عرض ہُؤا ہے۔ کہ عُمر کا تعلّق سانسوں سے ہوتا ہے جس قدر آہستہ آہستہ سانس کی رفتار ہوگی۔ اسی قدر عُمر لمبی ہوگی۔ اَور جس قدر سانس میں تیزی ہوگی۔ اتنی ہی عُمر میں کمی ہوگی۔ سانس آہستہ آہستہ تبھی چلتا ہے۔ اگر خون کا دورہ تیز نہ ہو۔ اَور اس کا انحصا خیالات کی پاکیزگی پر ہوتا ہے۔ لہذا درازیٔ عُمر کے لئے بھی خیالات کو پاکیزہ رکھنا نہایت لازمی ہے۔ اس بات کو جتلانے کے لئے کہ سانس کی آہستگیِ رفتار سے عمر کا تعلّق ہے۔ نقشہ ذیل کا ملاحظہ خالی از لطف نہ ہوگا:۔

نمبر شمار	نام جاندار	تعداد سانس فی منٹ	اوسط عمر سال
۱	خرگوش	۳۸	۸
۲	کبُوتر	۳۶	۸
۳	بندر	۳۲	۲۱
۴	کتّا	۲۹	۱۴
۵	بکرا	۲۴	۱۳
۶	گھوڑا	۱۹	۵۰
۷	انسان	۱۳	۱۰۰
۸	ہاتھی	۱۲	۱۰۰
۹	سانپ	۸	۱۲۰
۱۰	کچھوا	۵	۱۵۰

پچھلے دنوں رسالہ "پریت لڑی" میں ایک بزرگ کا حال شائع ہُوا تھا۔ جو ہندوستان کا سب سے لمبی عمر والا انسان سمجھا گیا تھا اس کا نام چوہدری پیرا آندتہ ذات راجپوت ساکن موضع پنڈی خورد تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ تھا۔ اُس کی عُمر ایک سو چالیس ۱۴۰ برس کی تھی۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹا لڑکا چالیس ۴۰ سال کا تھا۔ یعنی وہ چوہدری صاحب کی سَو سال کی عُمر میں پیدا ہُوا تھا۔ چوہدری صاحب کی دُوسری بیوی بھی ضعیفہ ہوکر کام کاج سے عاجز ہوچکی تھی۔ جب اس بُزرگ سے اس کی درازئ عُمر کے اسباب پُوچھے گئے۔ تو اس نے بتایا کہ

۱۔ مَیں نے ہمیشہ صُبح کو چھاچھ اور مکھن کا استعمال کیا۔ اور شام کو عام طور پر ماش کی دال سے روٹی کھائی۔

۲۔ گوشت بہت کم کھایا۔

۳۔ بغیر بھُوک کے کھانا کبھی نہیں کھایا۔

۴۔ اپنے کھیتوں کا چکّر لگانا روزانہ معمول تھا۔ جو کہ قریب چار میل کا سفر ہو جاتا تھا۔

۵۔ نہ میں کبھی بے کار رہا ہُوں۔ نہ جسم کو تھکان اور تکلیف پہنچا کر کام کیا ہے۔

۶۔ سب سے بڑی بات یہ ہے۔ کہ مَیں نے کبھی غصّہ۔ کینہ اور حسد کو دل میں جگہ نہیں دی۔

اس زندہ مثال سے آپ اچھّی طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ کہ درحقیقت خیالات کی پاکیزگی انسان کی صحّت اور لمبی عُمر کا باعث بنتی ہے۔

سب لوگ خوشی کے طالب ہیں۔ وُہ چاہتے ہیں۔ کہ وُہ ہر وقت خوش رہیں۔ اُن کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں ہے۔ کہ وُہ اپنے خیالات کو پاک رکھیں۔

انسان کا چہرہ اس کے دِل کا عکس ہوتا ہے۔ خدا پرست اور خدا کا خوف رکھنے والے نیک انسانوں کے چہرے پر کیوں جلال اور مُسکراہٹ ہوتی ہے؟

اس لئے کہ اُن کے دل میں پوترتا اور شانتی ہوتی ہے۔ اور اسی کا عکس اُن کے چہرے پر نمایاں ہوتا ہے۔ جو لوگ خوشی حاصل کرنے کے لیئے ہزارہا کوششیں کرتے ہیں۔ زر و مال لُٹاتے ہیں۔ کلبوں میں جاتے ہیں۔ سینما تھیٹر اور دیگر کھیل تماشے دیکھتے ہیں۔ وُہ اس سہل اور سستے نسخے کا استعمال فرمائیں۔ اگر دلی مُراد پوری نہ ہو۔ تو میرا ذمّہ۔ مشکل یہ ہے۔ کہ بغض و حسد کے خیالات تو اپنے دل میں جاگزیں رہتے ہیں۔ اور پھر شکائت ہوتی ہے۔ کہ دُنیا دُکھوں کا گھر ہے۔ یہ دُنیا نہ دُکھوں کا گھر ہے۔ نہ سُکھوں کا۔ نہ یہ دوزخ ہے نہ جنّت۔ یہ انسان کے خیالات ہی ہیں۔ جو کہ اس کو دوزخ کی بھٹی بھی بنا لیتے ہیں۔ اور بہشت کی تفریح گاہ بھی ؎

ہندُو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دُنیا
وُہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں (حالیؔ)

حقیقت یہ ہے کہ جس انسان کے اپنے خیالات نیک ہیں۔ اُس کو سب ہی لوگ اچھے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ہر ایک چیز سے وُہ خوشی حاصل کر سکتا ہے جس کے خیالات میں ناپاکی ہے۔ اُسے سب کچھ ہی ویسا دکھائی دیتا ہے ؎

ہے بُرا تو ہی نظر آیا اگر تجھ کو بُرا
تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا (ذوقؔ)

اس دُنیا کے اندر اپنے ہی دِل کے خیالات کا نقشہ کھچ جاتا ہے۔ اپنے وچاروں کا ہی فوٹو اُترتا ہے۔ دُنیا بجائے خود نہ بُری ہے۔ نہ اچھی۔ جو اس کو جس خیال سے دیکھے گا۔ ویسی ہی نظر آئے گی ؎

بُرے کو سب بُرا اچھے کو سب اچھا ہے دنیا میں
اس آئینہ میں جو جیسا ہے ویسا عکس اُترتا ہے (امیرؔ)

ایک اور ذریعہ خوشی حاصل کرنے کا زیادہ دوست بنانا ہے دوستوں سے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جتنے انسان کے زیادہ دوست ہوں گے اتنی ہی زیادہ خوشی ہوگی۔ فردوسی نے تبھی تو لکھا ہے کہ ع

تو تا خاک یابی ہمہ دوست کار

ترجمہ:۔اے انسان۔ جہاں تک دُنیا بستی ہے۔ تو سب کو اپنا دوست بناتا جا۔ دوست کیسے بن سکتے ہیں؟ اپنے خیالات سے ؎

مَیں نے پُوچھا کہ چاہتے ہو مجھے سُن کے وہ بولے یوں ادھر دیکھو
مُجھ کو تم چاہتے ہو کتنا کچھ
اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو (رنگین)

پس یہی کسوٹی ہے۔ اگر دوستوں کی تعداد بڑھا کر اپنی خوشی میں اضافہ کرنا منظور ہو۔ تو اپنے خیالات کی لہر کو نیکی کی طرف لگانا چاہیئے۔ غیریت۔ نفرت دُوئی کے خیالات دوستوں کی تعداد کو کم کرتے ہیں۔ اس لیئے خوشی بھی اسی تناسب سے کم ہوتی ہے۔ ہمارے دل کے خیالات کیسے ہونے چاہئیں ؎

ایک خالق کے بشر سب ایک ہونے چاہئیں ایک والد کے پسر سب ایک ہونے چاہئیں
دو نہیں اہلِ نظر سب ایک ہونے چاہئیں ہند کے نُورِ نظر سب ایک ہونے چاہئیں
ایک، ہو جائیں تو خود ہی ایک اپنا ہو گیا
خیال یہ چھوڑا ہے جب سے بخت اپنا سو گیا (پریم)

ہر لحاظ سے نیک خیالات کا رکھنا بڑا لازمی ہے۔ کسان جو کہ اچھی پیداوار کا خواہش مند ہوتا ہے۔ وُہ دو باتوں کی خاص احتیاط رکھتا ہے۔ ایک تو زمین اچھی طرح سے طیار ہو۔ دوسرے بیج اچھے سے اچھا بویا جائے۔ اگر یہ دونو باتیں ہوں اور پھر پانی بھی وقت پر مل جائے۔ تو پیداوار اعلےٰ درجہ کی اور بہتات سے ہوتی ہے

جو اوّل تو کسان کی خوشی کا باعث بنتی ہے۔ اور پھر اس کی تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ انسانی زندگی بھی ایک کھیتی ہے۔ کسان کی طرح ہر ایک انسان بھی اپنی زندگی کے درخت کے میٹھے پھل اور اچھی پیداوار حاصل کرنے کا طلبگار ہے۔ لیکن اس کے لئے نہ تو اچھی زمین تیار کرتا ہے۔ اور نہ اچھا بیج بوتا ہے۔ اس کھیتی کی زمین ہے انسان کا دل۔ اور اس کے اندر بیج بویا جاتا ہے خیالات کا۔ اگر دل کو اچھی طرح سے طیار کر لیا جائے (جس کے متعلق ایک علیحدہ باب میں عرض کیا گیا ہے) اور اس میں نہایت پاکیزہ خیالات کا بیج بویا جائے۔ اور پھر عبادتِ الٰہی اور محبتِ انسانی کا پانی دیا جاتے تو اس میں نیک اعمال کے ایسے خوبصورت شیریں اور خوش ذائقہ پھل آئیں گے۔ کہ جن کے لطف سے پہلے تو اسی دنیا میں انسان مسرت حاصل کرے گا۔ اور پھر عاقبت میں اس کے نزدیک کوئی دکھ یا رنج نہیں آئیگا۔ بلکہ وہ ان مقامات اور ان درجات کے حاصل کرنیکا مستحق ہوگا۔ کہ جو مالکِ کونین نے اپنے پیارے بندوں کے لئے مخصوص کئے ہوئے ہیں۔

کوئی عمارت مضبوط نہیں کہی جا سکتی۔ کوئی درخت دیر تک کھڑا نہیں رہ سکتا اگر اس کی بنیاد یا جڑ کمزور ہو۔ اگر بنیاد پکی ہو۔ تو عمارت بھی قائم رہ سکتی ہے۔ جڑ مضبوط ہو۔ تو درخت بھی ہوا کے جھونکوں سے زمین پر نہیں آتا۔ اسی طرح سے انسانی زندگی کی بناء اور اس درخت کی جڑ انسان کے خیالات ہیں۔ اگر خیالات نیک ہیں۔ تو زندگی کی عمارت پختہ ہوگی اور زندگی کا درخت اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم ہوگا، دنیاوی جھکولے اس پر کچھ اثر نہیں کریں گے۔ وہ اس زندگی کی کشمکش میں ڈانواں ڈول نہیں ہوگا۔ مخالف واقعات کو دیکھ کر ایک معمولی انسان گھبرا اٹھتا ہے۔ ان کو دکھ اور مصیبت کا نام دیکر واویلا کرنے لگتا ہے۔ مگر ایک نیک خیال انسان کو جب اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ تو وہ انہیں اپنے مالک کا کھیل سمجھ کر اپنے لئے ایک امتحان اور آزمائش خیال کرتا ہے۔ اپنی نیک دلی اور نیک خیالی کے ذریعہ اس آزمائش میں پورا اترتا ہے۔ نہ صرف

ان حادثات کو بغیر تکلیف ماننے کے گذار دیتا ہے۔ بلکہ اُن کے اندر بھی ایک راز دیکھتا ہے اور اُن سے سبق حاصل کرتا ہے۔ کسی ہندی کوی نے کہا ہے ؎

دُکھ کلیش کے سمے کو کاٹ لیت ہیں دوئے
گیانی کاٹے ہنس کر اگیانی کاٹے روئے

یعنی تکلیف کا زمانہ ہر ایک آدمی پر آتا ہے۔ اور گذر بھی جاتا ہے۔ لیکن دانا اُسے ہنس کر گذار لیتا ہے۔ اور نادان رو پیٹ کر نکالتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ تکلیف کے وقت میں خوش رہنے کی کوشش تو کی جاتی ہے لیکن پھر بھی دُکھ دبائے رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ نیک خیالات کی کمی ہے۔ اگر نیک خیالات کے بہتے پانی سے دِل ہمیشہ دھلا ہُوا رہے۔ تو یہ گرد اس پر جم نہیں سکتی۔ جب ایسی صُورت ہو تو نیک خیالات کی رَو کو اور بڑھانا چاہیئے۔ نیک خیالات کے رہنے سے انسان کی عقل ٹھیک ٹھیک رہبری کرتی ہے۔ اور نہ کرنے کے لائق کیا ہے۔ جب اس بات کا پُورا پُورا علم انسان کے دل میں پہلے موجود ہے۔ تو کیسا بھی وقت پڑے اسے اپنے فرض کی آگاہی ہوگی۔ اور اس وقت کو نہایت خوش اسلوبی سے شانتی کے ساتھ سکونِ دل سے نکال لے گا۔ لیکن یہ سب کچھ اُسی صُورت میں ہوسکتا ہے۔ جب انسان کے دل میں ہمیشہ ہی نیک خیالات جاگزیں رہیں۔ ایسی حالت اپنے لئے حاصل کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً اپنی پرتال خود کرنی چاہیئے۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ میرا تعلق نیک خیالی سے کہاں تک قائم ہوچکا ہے۔ کس حد تک کمی ہے۔ کہیں مَیں کسی کے لئے بُرا تو نہیں سوچتا۔ کسی کی بُرائی کے لئے میرا دھیان تو نہیں جاتا۔ کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی بھاونا۱ تو دل سے نہیں اُٹھتی۔ اگر نہیں۔ تو سمجھنا چاہیئے۔ کہ خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں۔ لیکن اگر ابھی بغض و عناد۔ دُشمنی اور نفرت اور غیریت کے خیالات اُٹھتے ہیں۔ تو علی الصُبح اُٹھ کر اپنے مالک سے اس قسم کی دُعا مانگنی چاہیئے یہ دُعا روز جاری رکھی جائے۔ جب تک مطلب حاصل نہ ہو:-

---

۱؎ خیال بد

"اے میرے مولیٰ! تیری قدرت کے اندر ہر ایک چیز خوش ہے۔ ہر ایک چیز دُوسرے کا بھلا کرنے کے لئے بنی ہے۔ تیری قدرت کی ایک بھی چیز نہیں۔ جو صرف اپنی ہی غرض پُوری کرنے کے لئے بنی ہو۔ مَیں بھی تیری کائنات کی ایک حقیر و ناچیز ہستی ہُوں مجھے بھی اپنی قُدرت کی دیگر چیزوں سا بنا دے۔ مَیں بھی سدا خوشی سے مسُرور رہوں۔ ہمیشہ دوسروں کی بہتری کے دوسروں کی بھلائی کے خیالات اپنے دل میں رکھُوں۔ جو خیالات کبھی کبھی ایسے آتے ہیں۔ کہ جن کا مقصد خُود غرضی۔ انتقام۔ ضرر رسانی۔ دل آزاری ہوتا ہے اُن کو میرے دل سے نکال دے۔ مَیں پاکیزگی کا پُتلا بننا چاہتا ہوں۔ میں ایک بھی ناپاک خیال دل میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں چاہتا ہُوں کہ میرا جسم۔ میرا مال۔ میرا دل تیرے احکام کے مطابق تیرے بندوں کی خدمت کے لئے وقف ہو جائیں۔ میرے دِل میں ہمیشہ ہی نیک خیالات جاگزیں رہیں۔ مَیں کوشش کرتا ہُوں۔ کہ ناپاک خیالات میرے نزدیک نہ آئیں۔ لیکن پھر بھی وُہ کبھی کبھی اپنا حملہ کر ہی دیتے ہیں۔ صرف تیری رحمت سے تیری عنائت سے مَیں اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو سکتا ہُوں۔ پاکیزگی کا چشمہ۔ پوترتا کا ماخذ طہارت کا منبع تُو ہی تو ہے۔ تجھی سے یہ چیزیں مِل سکتی ہیں۔ اس لئے مَیں تیرا ہی سہارا ڈھونڈتا ہُوں۔ میری مدد فرما۔ اور مَیں سچّے دل سے تیرے قدموں پر گر کر گڑگڑا کر یہ التماس کرتا ہُوں۔ کہ میری اس مؤدّبانہ التجا کو میری اس عاجزانہ گذارش کو شرفِ قبولیت عطا فرما اور ساری ناپاکی۔ گندگی اور آلائش دُور کر کے مجھے پاکیزگی کا مجسمہ بنا دے۔"

اس طرح سے باقاعدہ مالکِ حقیقی کی جناب میں التجا کرنے سے دِلی مدعا حاصل ہوگا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی روزانہ زندگی میں قدم قدم پر نگاہ ڈالتے رہنا واجب ہے کہ کہیں سے بدخیالات کا حملہ نہ ہو جائے صُحبت کا خاص طور پر خیال رکھنا لازم ہے ؎

صُحبتِ صالح ترا صالح کند
صُحبتِ طالح ترا طالح کند
(مولانا رُومؒ)

ترجمہ:۔ اے بھائی نیک صُحبت تم کو نیک بناتی ہے۔ اور بد صُحبت بد بناتی ہے:
انسان کے خیالات صُحبت سے اچھے یا بُرے ہو جاتے ہیں صحبت سے ہی وہ نیک اور بد بن جاتا ہے ؎

انسان یہ بھلا ہے جو صُحبت بھلی ملے لیکن یہی بُرا ہے جو صحبت بُری ملے

کبیر صاحب نے بد صُحبت سے بچنے کے لئے ایک معرکہ کی بات کہی ہے ؎

گریئے پربت سکھر تے مریئے دھرنی منجھار سنگ برانہ کیجئے بُوڑو کالی دھار

ترجمہ:۔ پہاڑ سے گر کر مرنا اچھا۔ زمین میں دھس کر مرنا اچھا۔ سمندر کی کالی دھار میں ڈوب کر مرنا اچھا بمقابلہ اس کے کہ انسان صُحبتِ بد اختیار کرے:
بُری صُحبت کا اثر لازمی طور پر پڑتا ہے۔ زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ تو ضروری اپنا رنگ دکھاتا ہے ؎

ہر کہ با دوناں نشیند ہم چوں دوناں دوں شود ہر کہ با اہلاں نشیند عقل او افزوں شود
اسپ را با خر ببندی مدتے یک جا بہم رنگِ شاں ہم گوں نگردد خوئے شاں ہم گوں شود

ترجمہ:۔ جو کمینے آدمیوں کی صُحبت میں بیٹھتا ہے۔ وُہ خود بھی کمینہ ہو جاتا ہے جو نیک انسانوں کی صُحبت اختیار کرتا ہے۔ اُس کی عقل تیز ہو جاتی ہے۔ اگر ایک گھوڑے کو گدھے کے پاس کافی عرصہ تک باندھا جائے۔ تو وہ اگرچہ ہم رنگ نہ ہوں گے لیکن ہم خُو ضرور ہو جائیں گے:
ایک اور چیز جس کا خیالات پر براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ خُوراک ہے۔ خُوراک کے متعلق دو باتوں کا مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ اوّل یہ کہ دھرم کی کمائی ہو۔ حلال کی روزی ہو ؎

پیدا جو مشقت سے کریں کھائیں کھلائیں
لیں اپنی کمائی کے عوض نیک دُعائیں (احمدی)

حلال کا لُقمہ خیالات کی پاکیزگی میں کافی مدد دیتا ہے۔ کہا ہے کہ "جیسا اَن

وَیسا من"۔ یعنی دِل کے خیالات وَیسے ہی ہوں گے جیسی کہ خُوراک ہوگی۔ دُوسری بات خُوراک کے متعلق قابلِ توجہ یہ ہے۔ کہ ایسی چیزیں کھائی جائیں۔ کہ جو جسم کے اندر زیادہ گرمی اَور جوش وغیرہ پیدا کرنے والی نہ ہوں۔ زیادہ گرم مسالے یا چٹپٹی چیزیں کھانا نقصان دِہ ہے۔ گوشت کھانا بھی مفید نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے گوشت کھانا ضروری ہی خیال کیا جائے۔ تو اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے بہت زیادہ عبادت و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنگال میں ایک سوہنگ سوامی ہُوئے ہیں۔ وُہ خُدا رسیدہ بزرگ تھے۔ لیکن گوشت کا استعمال بھی کرتے تھے۔ وُہ یہی کہا کرتے تھے۔ کہ اس کے اثر کو بڑی زبردست عبادت سے ہٹانا چاہیئے چونکہ ہر ایک آدمی اتنی زبردست ریاضت نہیں کر سکتا۔ اس لئے گوشت خوری بھی جسم کے اندر گرمی پیدا کر کے سکونِ دِل میں ہلچل مچا کر نیک خیالات کے رستہ میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

لاہور کے بہت سے ماہر ڈاکٹر صاحبان نے ایک مشترکہ بیان اخبار ٹربیون لاہور مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۳۵ء میں نکالا تھا۔ کہ ہماری متفقہ رائے ہے کہ:۔

(الف) خُوراک میں گوشت انڈے اَور مچھلی جس قدر ممکن ہو سکے۔ کم کئے جائیں۔

(ب) صُبح کے وقت ایک گلاس دُودھ یا لسّی کا پیا جائے۔

(د) حتی المقدور چائے سے پرہیز کیا جائے

(ہ) ایریٹڈ واٹر یعنی لیمن سوڈا کا استعمال جہاں تک ممکن ہو سکے کم کیا جائے۔

(و) بازار کے دُودھ اور بازار کی مٹھائیوں سے پرہیز کیا جائے۔ سکولوں اور کالجوں کے منتظمان کو اس بارہ میں خاص احتیاط کرنی چاہیئے۔

(ز) بسیار خوری ہر حالت میں ممنوع ہے۔ ایک وقت میں بہت سی چیزیں کھانے میں شامل نہ کی جائیں۔ کیونکہ اس سے خواہ مخواہ زیادہ خوری ہو جاتی ہے۔ آج کل

جس قسم کے دعوتی کھانے دیئے جاتے ہیں۔ وُہ صحت کے لئے نہائت مُضر ہیں۔

زیادہ کھانے سے ہر حالت میں پرہیز لازمی ہے۔ اس سے صحت پر اور خیالات پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ہمارا تو یہ حال ہے کہ ؎

جان بھی جائے گو خرابی سے ہاتھ اُٹھے گا نہ اس رکابی سے

کرنا کیا چاہیئے۔ اس کے متعلق حالی صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

کھانے تو بہت مُیسّر آتے ہیں ہمیں جو دیکھ کے چکھ کے بھاتے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تجھ سے وہ کھانے اے بُھوک جو تُو نے کبھی کبھی کھلاتے ہیں ہمیں

بھگوت گیتا کے چھٹے ادھیائے میں آتا ہے۔ کہ نہ تو زیادہ کھانے سے ہی بہتری ہوتی ہے۔ اور نہ ہی بہت کم کھانے سے۔ اندازہ سے کھانا پینا ہی بہبودی کا باعث ہوتا ہے ؎

باندازہ خور زاد اگر آدمی چنیں پُر شکم آدمی یا خمی
ندارند تن پرور ال آگہی کہ پُر معدہ باشد ز حکمت تہی
دو چشم و شکم پُر نہ گردند ہیچ تہی بہتر ایں رودہ پیچ پیچ

ترجمہ:۔ انسان اگر کھانے کے اندازے پر جئے۔ تو ایسا آدمی آدمی ہے۔ جو پیٹ بھرنے میں لگا رہتا ہے وہ آدمی ہے یا مٹکا۔ محض جسم کا خیال رکھنے والوں کو اس بات کی خبر نہیں۔ کہ معدہ ٹھونس لینے سے عقل باقی نہیں رہتی۔ آنکھ اور پیٹ کبھی بھرتے نہیں۔ یہ پیچیدہ انتڑیاں خالی رکھنی ہی اچھی ہیں۔

جو انسان خود اپنی بہتری کے لئے کمر بستہ ہو جاتا ہے۔ خود نیک خیال بننے کا ارادہ باندھ لیتا ہے۔ اُس کی مدد قدرت بھی کرتی ہے۔ قدرت کے اندر کرہ ہوائی میں جو بھی لفظ بولا گیا ہے۔ یا جو بھی خیال کسی انسان کے دل میں آیا ہے۔ موجود ہے۔ یعنی ہمارے اِرد گرد ہر طرف ہر قسم کے خیالات موجود ہیں۔ دُنیا میں ہر قسم کے خیالات

کے آدمی ہیں جنہوں نے نیک خیالات اپنے دل میں رکھے ہیں، اُن کے وُہ نیک خیالات بھی اور جنہوں نے بدخیالات رکھے ہیں۔ اُن کے بدخیالات بھی کرّہ ہوائی میں موجود ہیں۔ انسان کا دل ان خیالات کو حاصل کرنے کے لئے ریڈیو (ریسیونگ سٹ) کا کام دیتا ہے۔ جیسے ریڈیو کے ڈائل پر مختلف جگہ سُوئی گھمانے سے وُہ مختلف مقامات سے بولے ہُوئے الفاظ کی گرفت کر لیتا ہے۔ اسی طرح انسان کا دل بھی خیال کی سُوئی کو مختلف جگہ پر رکھنے سے مختلف قسم کے خیالات کی گرفت کرتا ہے۔ خیالات کا ذخیرہ تو جیسے اُوپر عرض ہوا ہمارے گردوپیش بے اندازہ مقدار میں موجود ہے۔ جس وقت انسان اپنے خیال کی سُوئی نیک خیالی کے مقام پر کر لیتا ہے۔ تو اس وقت نیک خیالات کی لہر اس کے اندر کرّہ ہوائی سے آنی شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح سے اُس کی نیک خیالی کو ترقی دینے کے لئے مددگار رہتی ہے۔ برخلاف اس کے جس وقت انسان اس سُوئی کو بدخیالی کے مقام پر گھما دیتا ہے۔ تو بدخیالات کی رَو آنی شرُوع ہو جاتی ہے۔ موجُودہ زمانہ میں کُرّہ ہوائی کے اندر بدخیالات پیش پیش ہیں۔ اس لئے اُن کی رَو بڑے شدّومد سے آتی ہے۔ اندریں حالات لازم یہ ہے۔ کہ انسان اپنے دل کی سُوئی کو بدخیالی کے مقام پر ہرگز نہ جانے دے۔ وُہ سُوئی بڑی تیز اور لرزاں ہے۔ جیسے قطب نما کی سوئی کا رُخ شمال کی طرف رہتا ہے۔ اسی طرح فطرتی طور پر دل کی سُوئی کا میلان بدخیالی کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ انسان کوشش کرے۔ کہ یہ اُدھر سے باز رہے۔ تاکہ اس کا رُخ ہمیشہ نیک خیالی کے مقام کی طرف رہے۔ ایسا کرنے سے قدرت بھی مدد کرتی ہے۔ اور آخر کار اس سُوئی کا لرزنا اور اُس کی تیزی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وُہ بالکل ساکن ہو کر نیک خیالی کے مقام پر ٹھہر جاتی ہے۔ پھر انسان اپنی زندگی کے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ کرّہ ہوائی سے نیک خیالات ہی اُسے ملتے ہیں

خیالات کے اثرات کے متعلق ہمارے بزرگوں نے بڑی چھان بین کر کے اپنے تجربات کو قلم بند کیا ہے۔ ہر ایک خیال خواہ چھوٹا ہے۔ خواہ بڑا اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف اثر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ مختلف قسم کی چیزوں کا مختلف قسم کے رنگوں کا خیال کرنے سے مختلف قسم کا اثر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً۔

(الف) پیلے یا زرد رنگ کا دھیان کرتے رہنے سے انسان کی عقل میں ترقی ہوتی ہے۔

(ب) نیلے رنگ کا دھیان کرنے سے طمانیت اور صحت بڑھتی ہے۔

(ج) ہرے یا سبز رنگ کا دھیان کرنے سے زر و مال کی ترقی کے سامان پیدا کرنے کے لئے اچھے اچھے ذرائع سوجھتے ہیں۔

اس بات کا تجربہ کہ مختلف چیزوں کا خیال کرنے سے مختلف قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات سے کر لینا چاہیئے۔ کہ آپ نے کسی آج کل کے اپ ٹو ڈیٹ فیشنیبل جنٹلمین کے کمرہ میں صنفِ نازک کی تصویروں کو دیکھا ہے۔ اور ایک پرانی قسم کے سادھارن آدمی کے گھر میں نیک انسانوں کی تصویروں کا ملاحظہ کیا ہے اب ایک وقت میں آپ کو ایک کمرہ کی یاد آتی ہے۔ اور دوسرے وقت میں دوسرے کی۔ تو غور کیجئے کہ ہر دو حالتوں میں خیالات میں کتنا فرق ہے۔ اسلئے حتی الوسع برے نظارے۔ بری تصویریں۔ برے کھیل تماشے دیکھنے سے باز رہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ سب نیک خیالی کے مخالف اور دشمن ہیں۔ گھر کے اندر کہیں فحش تصویریں نہ لگانی چاہئیں۔ برخلاف اس کے نیک آدمیوں کی نیک بزرگوں کی تصویریں ضرور لگانی چاہئیں۔ خاصکر وہاں کہ جس جگہ انسان بیٹھ کر عبادت یا پوجا کرتا ہو یا سوتا ہو۔ گھر میں اچھی اچھی تصویروں کی کتابیں رکھنی چاہئیں۔ جن کو بچے دیکھیں اور شروع سے ہی ان کے اندر نیک خیالی کے جذبات پیدا ہوں۔

تھیٹر اور سینما کے کھیل بلا شبہ بدخیالی کے چشمے ہیں۔ اور نیک خیالی کے سخت

دُشمن ۔انگلستان کے مشہور مصنّف مسٹر ایچ مور لکھتے ہیں ۔کہ مجھے اس بات کے کہنے میں شمہ بھر بھی دریغ نہیں ہے ۔کہ تھیٹر وغیرہ انسانی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں ۔گو وُہ دِل کو لُبھانے والے ہوتے ہیں ۔لیکن جتنا زیادہ دل کو لُبھاتے ہیں اتنے ہی زیادہ خطرناک ہیں ۔بدی دُنیا کے اندر ہر جگہ موجود ہے ۔لیکن تھیٹروں کے اندر تو اس کا مسکن ہے ۔ایک تھیٹر کے ناٹک کی کتاب کا اور انجیلِ مقدّس کا اتنا ہی فرق ہے ۔کہ جتنا اندھیرے اور روشنی کا ۔اگر کوئی آدمی کسی طرح سے ناٹک کی کتاب کو اچھا کہنے کی کوشش کرتا ہے ۔تو اُسے یک دم انجیلِ مقدّس کو رَدّ کر دینا چاہیئے ۔کیونکہ یہ دونو متضاد چیزیں ہیں ''۔

کیسے صریح اور زور دار الفاظ میں ان بدخیالی کے اڈوں کی مذمت کی گئی ہے ۔ کاش کہ میرے تھیٹر اور سینما کے شوقین بھائی ان الفاظ کو پڑھ کر ان پر پُورا پُورا دھیان دیں ۔

مغربی فلاسفروں اور مصنّفوں نے ''خیالات'' کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے :۔

۱۔ سکاٹ لینڈ کے بیسویں صدی کے مصنّف جی میکڈانلڈ لکھتے ہیں ۔کہ تمہاری زندگی کا لُطف تمہارے خیالات کی نوعیت پر منحصر ہے ۔اس لئے خبردار رہو ۔اور دھیان رکھو کہ وُہ خیالات جو نیکی اور معقولیت کے منافی ہوں ۔تمہارے دل میں جگہ نہ پائیں ۔

۲ ۔انگلستان کا مشہور پادری سیلی پورٹس لکھتا ہے ۔کہ بدخیالات شیروں اور بھیڑیوں سے بھی بڑھکر خونخوار ہوتے ہیں ۔انسان ان درندوں سے تو بچ کر بھی نکل سکتا ہے ۔لیکن خیالاتِ بد سے پہلو نہیں بچا سکتا ۔البتہ بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے ۔کہ جیسے پیالے کے لبریز ہونے پر اس میں اور گنجائش نہیں رہتی ۔اسی طرح

اپنے دل کے جام کو نیک خیالات سے بھر لو۔ تاکہ اس میں بدخیالات کو داخل ہونے کی گنجائش ہی نہ رہے۔ لوگ بداعمالی کی زیادہ مذمت کرتے ہیں۔ لیکن اُس کی اصلی علت اور اُس کے خاص سبب کے خلاف جو طبیعت میں اس کا بیج بوتے ہیں کوئی زوردار آواز نہیں اُٹھاتے۔ یعنی بدخیالات کے خلاف۔

۳۔ انگلستان کے ایک اور اُنیسویں صدی کے پادری لکھتے ہیں۔ کہ نیک خیالات تمہارے بڑے معزز اور قابلِ قدر مہمان ہیں۔ اُن کا دل سے خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ اُن کی خوب آؤ بھگت اور تواضع کرنی چاہیئے۔ اور ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لانا چاہیئے کیونکہ یہ گلاب کے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح اگر اپنے دماغ کے کوزے میں رکھ لئے جائیں۔ تو بڑی بھینی بھینی خوشبو دیتے رہتے ہیں۔

۴۔ اُنیسویں صدی کا سکاٹ لینڈ کا شاعر چارکس میکے لکھتا ہے۔ کہ تیر ہوا میں سے گذرتا ہوا شائد اپنا نشان نہ چھوڑ جاتا ہو۔ لیکن ایک بدخیال اپنا نشان اسی طرح سے چھوڑتا ہے۔ جیسا کہ سانپ اپنی لکیر۔

گیتا کے دوسرے ادھیائے میں بھگوان کرشن نے اس سلسلہ کو جس سے کہ ایک بدخیال انسانی تباہی کا باعث بنتا ہے۔ اِس طرح سے بیان فرمایا ہے۔ ”انسان بدخیالات کو اپنے اندر پیدا کر کے دُنیا کی لذات میں پھنس جاتا ہے۔ لذات خواہشات کو بڑھاتی ہیں۔ خواہشات کے پُورا نہ ہونے پر غصہ پیدا ہو جاتا ہے۔ غصہ کی حالت میں انسان بھلے اور بُرے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور اس صُورت میں انسان کو سب پڑھے اور سُنے ہوئے نیک احکام بھُول جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی عقل ماری جاتی ہے۔ اور عقل کے مارے جانے سے انسان تباہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے۔“

بدخیالی کے بداثرات اس سے واضح ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ہے۔ کہ انسان کی

گمراہی، ذلت، خواری، گراوٹ اور تباہی کی بنیاد بد خیالات کے ذریعہ ہی پڑتی ہے۔ کبیر صاحب نے ایک موقعہ پر کیا اچھا کہا ہے۔ کہ میں بد انسان کے ساتھ تو جو سلوک کروں گا۔ وہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ لیکن اس کی ماں کو فوراً ہلاک کر دونگا تاکہ وہ کوئی اور اس قسم کے ظالم اور بد آدمی دُنیا میں پیدا نہ کرے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بدی کی جڑ کو اُکھاڑ پھینکنا چاہیئے۔ بدی کی ماں کی طرح بدی کی جڑ بد خیالات ہوتے ہیں۔ اُن کو کلیتہً نکال دینے سے ساری خرابی خود بخود رک جاتی ہے۔ پانی کے بہاؤ کو درمیان میں بند کرنے کی بجائے اُس کے نکاس پر اس کے منبع پر روکنا چاہیئے انگریزی زبان میں ایک کتاب ہے رائٹ تھنکنگ (RIGHT THINKING) اس کے اندر خیالات کی فلاسفی کو نہایت خوبصورت اور دلپذیر طریق سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سے چند ایک اقتباسات یہاں عرض کئے جاتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ :۔

”ہر ایک انسان کی بیرونی زندگی یا دُنیاوی زندگی اس کی اندر کی حالت کا ایک عکس ہے۔ مثلاً اگر ایک انسان ہر وقت بیماری۔ ناکامیابی اور مفلسی کا خیال کرتا ہے۔ تو لازمی ہے۔ کہ یہ کمزوریاں اس کے اندر ظاہر ہوں گی۔ لیکن برخلاف اس کے اگر وہ صحت۔ کامیابی۔ خوشی۔ کثرت اور ترقی کے خیالات دل میں رکھتا ہے۔ تو انہی اوصافِ حسنہ کا وُرود اُس کے اندر ہو گا۔“

”انسان کے زیادہ تر رنج و غم۔ دُکھ اور آلام اُس کے خیالات کا اور اپنے اندر کی سچائی کے ساتھ یکسانیت نہ پیدا کرنے کا نتیجہ ہیں۔ جس کی وجہ سے وُہ اپنے لئے بہبُودی کی راہ نہیں نکال سکتا۔ جب تک اندر گڑبڑ رہے گی۔ تب تک بیرونی زندگی میں گڑبڑ لازمی طور پر واقع ہوتی رہے گی۔ لیکن جونہی اندرُونی خیالات اور خواہشات میں تبدیلی کر لی جائے گی۔ یعنی اُن کی حقیقی جذبات کے ساتھ ہم آہنگی پیدا

کر لی جائے گی۔ وہیں بیرونی زندگی میں نمایاں تغیر آجائے گا۔ اور انتشارِ طبع کی بجائے ایک پاکیزہ یک رنگی پیدا ہو جائے گی"۔

"بدخیالات کے اُٹھنے سے انسان کے اوصافِ نیک۔ مرض۔ رنج۔ آزردگی۔ کنگالی اور مصیبت کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر وُہ اپنے مولے کریم اپنے دیالو پتا پروردگار کی طرح سب کی بھلائی کے خیالات کو دل میں جگہ دیتا ہے۔ تو اس کی ساری کمزوریاں اور سارے نقائص خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی جگہ مسرت، صحت، خوشحالی اور طمانیت کے جذبات آبستے ہیں۔ اور اتنی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جو احاطۂ بیان سے باہر ہے"۔

زندگی کے مصائب عام طور پر یہ ہیں۔ غریبی۔ تفکرات۔ ناداری۔ بیماری۔ اُداسی۔ رنج۔ غم۔ دل میں طمانیت کا نہ ہونا۔ کھوکھلی زندگی۔ دلی خواہشات اور اُمیدوں کا پورا نہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام مصائب کا باعث صرف ایک ہی ہے یعنی "حقیقتِ اصلی" سے ناموافقت۔ اُصول قدرت سے مخالفت۔ کیونکہ حق اور اس کی قدرت یہ دونو خدا اور نیز جو کچھ اُن کی اُپج ہے۔ وُہ دُوسروں کے لئے ہے۔ وُہ نہ تو خود ہی اپنے لئے ہیں۔ نہ اُن سے پیدا شدہ چیزیں۔ پس جو انسان اس اصول کے برخلاف سوچتا ہے۔ یا عمل کرتا ہے۔ وُہ قُدرت کے ساتھ ٹکر کھاتا ہے۔ اور اس وجہ سے خود ہی اپنے لئے مصائب و آلام کی پیشوائی کرتا ہے۔ لیکن جس وقت وُہ اس اُصولِ ازلی سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ تو اس ہم آہنگی کی وجہ سے اُس کی ساری صعوبتیں، تکلیفیں، کلفتیں اور رنج و غم ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے"۔

"خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اوّل خیالاتِ مثبت۔ دوم خیالاتِ منفی۔ مثلاً کامیابی، ترقی اور بھلائی کے خیالات مثبت خیالات ہیں۔ لیکن ناکامی۔ نامرادی اور بدی کے خیالات منفی خیالات ہیں۔ خیالاتِ مثبت زندگی کی عمارت کو اُونچا کرتے

ہیں۔ اُور خیالاتِ منفی اس کی جڑ کو کھوکھلا کرتے ہیں۔ اور گراتے ہیں۔ جن خیالات سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ وُہ ذیل کے نقشہ سے واضح ہوگا:۔

مثبت خیالات	نتیجہ	منفی خیالات	نتیجہ
اُلفت	خوشی	نفرت	رنج
ہمدردی	سرور	تنگ نظری	غم
فراخدلی	فارغ البالی	غیریت	سوزشِ دل
بھلائی	صحّت	تعصّب	دلی خلش اُور دُکھ
خوداعتمادی	ترقّی	کم حوصلگی	خوف
حوصلہ	بے خوفی	نکمّاپن	ناکامیابی
ہمّت	کامیابی	نامرادی	تباہی

جو انسان جس جس چیز کو حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ اسی قسم کے خیالات اس پر غلبہ حاصل کرتے ہیں۔ اگر سچّے دل سے ان خیالات کو پیدا کرنے کے لئے قدرت کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرے گا۔ تو نیک نتائج کا حاصل ہونا لازمی ہے۔ اِس لئے نہائت ضروری ہے۔ کہ ہم مضر نتائج پیدا کرنے والے ہر قسم کے بدخیالات کو تلانجلی دیں۔ ان کو خیرباد کہیں۔ ان کو بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکیں اور نیک خیالات کو ہمیشہ اپنے دل میں جگہ دیں۔ تاکہ ہر قسم کی راحت، فارغ البالی، خوشی اُور کامیابی کی مُسرتوں سے بہرہ ور ہو سکیں ؎

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است تو بدیں آرزو مرا برساں

ترجمہ:۔ اے میرے مالک یہ میری خُواہش کیسی نیک ہے۔ تُو اس میری مراد کو پُوری کر:

(آمین ثُم آمین)

انسان اَور اُس کی خواہشات

دُنیا کا تردّد تب تک تھا جب تک کہ ہم اُسکے طالب تھے
پھیری جو نظر غم ہو گئے کم رغبت نہ رہی دُنیا نہ رہی

دُنیا کے اندر انسان پر بہت سی چیزیں مصیبت لانے والی ہیں لیکن وُہ خود بخود محرک نہیں ہوتیں۔ انسان اپنے آپ اُن کو اپنی تکلیف کا باعث بناتا ہے۔ اُن اسباب میں سے ایک بڑا سبب انسان کی خواہشات ہیں۔ بھرتری ہری نے خواہشات کو آگ سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی جس طرح آگ ایندھن کے ڈالنے سے کبھی فرو نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سے انسان کی خواہشات دنیاوی چیزوں کے مہیّا کرنے سے کبھی پُوری نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ وُہ آگ کی طرح زیادہ بڑھتی ہیں۔ اور انسان کی تکلیف کا باعث بنتی ہیں ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

واقعی یہ خواہشات انسان کے لئے کبھی چین میسّر نہیں ہونے دیتیں۔ چین یا آرام من کے سکون کی حالت ہوتی ہے۔ لیکن جہاں من کے اندر خواہشات کی لہریں اُٹھتی ہوں۔ وہاں طمانیت کیسے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک ہندی کوی نے کہا ہے ؎

ترشنا اگنی پرئے کی ترپت نہ کب ہوں ہوئے
سُر۔ نر۔ مُنی اور رنک سب بھسم کرت ہے سوئے

یعنی خواہشات کی آگ دوزخ کی آگ کی مانند ہوتی ہے۔ اور کبھی سیر نہیں ہوتی جو کوئی بھی اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ خواہ فرشتہ ہو۔ خواہ انسان چھوٹا ہو یا بڑا یہ سب کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔

دُنیاوی خواہشات نہ صرف اس دُنیا میں ہی انسان کے لئے بے چینی کے اسباب پیدا کرتی ہیں۔ بلکہ آنے والی زندگی کی راہ بھی مار دیتی ہیں مشکل تو یہ ہے۔ کہ انسان اپنے سامنے دیکھتا ہے۔ کہ ہزاروں اُس کے بھائی اسی تگ و دو میں لگے ہوئے اس دُنیا سے چل دیئے۔ اور آخر دم تک اُن کی ساری خواہشات کبھی پوری نہ ہوئیں لیکن پھر بھی وہ اس سے عبرت حاصل نہیں کرتا ؎

خواہشیں دُنیا کی بارِ دوش و گردن ہوگئیں رفتہ رفتہ منزلِ عقبیٰ کی رہزن ہوگئیں

چل سُوئے گورِ غریباں اے حریصِ مال و زر
دیکھ کتنی آرزوئیں نظرِ مدفن ہوگئیں (داوج)

قرآن شریف کے اندر آتا ہے۔ کہ آخرت کے دن مالکِ عزّ و جلّ جہنّم کی آگ سے پُوچھے گا۔ کہ کیا تو سیر ہو چکی ہے۔ تو وہ جواب دے گی: "نہیں! اَور لاؤ۔ اَور لاؤ" یہی حال خواہشات کی آگ کا ہے۔ جو انسان اس آگ کو روشن کر لیتا ہے۔ وُہ کبھی بھی اس کی سیری نہیں کر سکتا۔ ایک ہندی کوی نے لکھا ہے ؎

کے ترشنا ہے ڈاکنی کے جیون کا کال
اور اور نسدن چہے جیون کرے بیحال

یعنی یہ خواہشات یا تو ڈائن کے نام سے پکاری جا سکتی ہیں۔ یا زندگی کو ختم کرنے والی موت۔ کیونکہ یہ رات دن "اَور لاؤ"۔ "اَور لاؤ" ایسا ہی چاہتی ہیں۔ اور زندگی کو بڑی بدمزہ کر دیتی ہیں۔

انسان کو اگر نیچا دکھاتی ہیں۔ اور بڑے بڑے شہزوروں کو زیر کرتی ہیں۔

تو وُہ یہی خواہشات ہیں۔ سچ کہا ہے ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

ترجمہ ”جو شیر مردوں کو روباہ خصلت یعنی مکّار بنا دیتی ہے وہ ضرورت ہے۔ حاجتمندی ہے۔ خواہش ہے“

بھرتری ہری ایک ایسے انسان کی نسبت لکھتے ہیں۔ کہ جو ساری عُمر اپنی خواہشات کی آگ کی تسلی کرنے میں کوشاں رہا۔ اور آخر ناکامی کی حالت میں چلّا اُٹھا ”میں نے مال و زر کی ہوس میں زمین کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہنچا۔ سُمندر سے پار گیا۔ بڑی سعی اور کوشش سے راجاؤں اور بادشاہوں کو خوش کیا۔ اور متواتر کئی راتوں تک جاگ کر شمشانوں میں بیٹھ کر منتر سِدھ کئے۔ لیکن آخر کوڑی بھی ہاتھ نہ لگی اَے خواہش! خُدارا اب تو میرا پیچھا چھوڑ دے“

واقعی خواہشات کے پیچھے دوڑنے والے انسان کی یہی حالت ہوتی ہے ؎

کہا سکندر نے یوں بحسرت، جب آگیا اس کا وقتِ رحلت
کہ سہل ہوتی نزع تب ہم پر جو محوِ جاہ و حشم نہ ہوتے
بلندیاں ہوتی ہیں مخالف جو پستیوں پہ ہو میل دل کا
زمیں کے فتنوں میں گر نہ پھنستے فلک کے جور و ستم نہ ہوتے (اکبر)

انسان آرام کا متلاشی ہوتا ہے۔ خوشی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لئے جو ذرائع وُہ استعمال کرتا ہے۔ وُہ غلط ہوتے ہیں۔ انسان یہ سمجھتا ہے۔ کہ فلاں چیز میسّر ہوجائے گی۔ تو پھر خوشی کا حصول یقینی ہے۔ لیکن اس خواہش کے پُورا ہوجانے پر بھی وُہ اپنے اندر کوئی دیر پا خوشی محسوس نہیں کرتا۔ اُس کی حالت اس ہرن کی سی ہوتی ہے۔ کہ جو گرمی کے موسم میں پیاس لگنے پر دُور سے چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر

دوڑتا ہُوا وہاں پہنچتا ہے۔ اور اس کو سوائے گرم ریت کے اور کچھ ہاتھ نہیں لگتا۔ پھر آگے دُوسری جگہ ریت کو چمکتا ہُوا دیکھ کر دوبارہ اس کو پانی کا دھوکا ہوتا ہے چنانچہ وُہ بھاگ کر وہاں بھی پہنچتا ہے۔ لیکن سوائے مایوسی کے کچھ نصیب نہیں ہوتا آخر اسی طرح گرتا پڑتا جان دے دیتا ہے۔ یہی حالت اُن انسانوں کی ہے۔ کہ جو خوشی اور آرام کی اُمید اپنی خواہشات کی تکمیل میں باندھے ہُوتے ہیں خوشی کا سرچشمہ تو انسان کے اندر ہی موجُود ہے۔ لیکن وُہ اس کی تلاش کرتا ہے باہر ؎

اَے قیس عبث ہے تجھے ناقہ کا تجسّس
لیلےٰ تو ترے دل ہیں ہے محمل میں نہیں ہے (شاکر)

بُدھ بھگوان اپنے مشہور گرنتھ دھم پد کے اندر لکھتے ہیں۔ کہ وُہی انسان خوشی حاصل کرسکتا ہے۔ کہ جو کسی چیز سے لگاؤ نہیں رکھتا۔ اور اپنی خواہشات کو اپنے قابُو میں رکھتا ہے۔

سچ تو یہ ہے۔ کہ مالکِ کُل ہماری حاجتوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ ہر طرح کے آرام و آسائش کے سامان مہیّا کرتا ہے۔ وُہ اچھی طرح سے جانتا ہے۔ کہ ہمیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور بخوبی ہماری حاجت روائی کرتا ہے ؎

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر (غالب)

لیکن باوجُود اس کے انسانوں کی تشفّی نہیں ہوتی۔ اور وُہ کچھ نہ کچھ مزید خواہش کرتے ہی رہتے ہیں۔ اپنی ضرُوریات کو بلاوجہ بڑھا کر اپنے لئے مصیبت کھڑی کرتے ہیں۔ حقیقت میں انسان کی ضروریات بہت کم چیزوں سے پوری ہوسکتی ہیں۔ لیکن انسان کا خاصہ ہوگیا ہے۔ کہ وُہ اپنی ضرورت سے زیادہ ہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی بات اس کی تکلیف کا باعث بنتی ہے ؎

اپنے بندوں کو دیا ہے جس قدر اللہ نے
کچھ نہ کچھ اس کے سوا ہے ہر بشر کی احتیاج (حبیب)

انسان اتنا بے صبرا ہے۔ کہ اپنی روزانہ ضروریات حاصل ہونے پر بھی اور ہی اور کی رٹ لگاتا ہے ؎

ملتا ہے روز اس پہ بھی کہتا ہے آدمی
کل کا بھی رزق دے مجھے پروردگار آج (حزیں)

انسان کے لئے جو زیادہ تر تکلیف کا موجب بنتی ہے۔ اس کی شہرت اور نام کی خواہش ہے۔ باوجود اس بات کے کہ انسان دیکھتے ہیں۔ کہ بڑے بڑے ناميوں کے نام مٹ چکے ہیں۔ ہزارہا مال و زر اور جاہ و حشم والے شہزور اور شہنشاہ اس دُنیا میں ہو گذرے ہیں۔ اور آج اُن کا کوئی نام تک نہیں جانتا۔ تو پھر یہ نام اور شہرت کی خواہش اس کے دل کے سمندر میں بے اطمینانی کی لہریں پیدا کرنے کے سوا اور کچھ حقیقت نہیں رکھتی ؎

شوقِ شہرت بھی بُرا، زر کی بُری چاہ بھی ہے
نفرت انگیز نظر میں ہوسِ جاہ بھی ہے (اکبر)

انسان شہرت حاصل کرنے کے لئے بڑا بننا چاہتا ہے۔ لیکن وہ بڑائی اس کو حاصل نہیں ہوتی۔ اور اگر دو روز کے لئے حاصل ہوتی بھی ہے۔ تو اُس کی قیمت بہت زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اگر بجائے دنیاوی بڑائی کے لئے کوشاں ہونے کے وُہ بڑائی کے ماخذ، بزرگی کے منبع، عزت و آبرو کے سرچشمے یعنی اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرے۔ تو وُہ بڑائی بھی حاصل ہو جائے۔ اور اپنی قلبی طمانیت کا خزانہ بھی نہ لُٹانا پڑے۔ پریشانی اور سرگردانی سے بھی بچاؤ ہو جائے۔ کبیر صاحب نے لکھا ہے ؎

پربھوتا کو سب کوئی بھجے، پربھو کو بھجے نہ کوئے
کہہ کبیر پربھو کو بھجے، پربھوتا چیری ہوئے

یعنی "سارے انسان بڑائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس بڑائی کے مالک کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ کبیر جی کہتے ہیں۔ کہ اگر اُس بڑی شان والے کی طرف مائل ہو جائیں۔ تو بڑائی بھی خود بخود پاؤں میں آن پڑے"۔

بڑا بننے کی اور نام پیدا کرنے کی خواہش باقی خواہشات سے بہت زبردست ہوتی ہے۔ تارک الدنیا لوگوں کو بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ وہ گھر بار چھوڑ آتے ہیں۔ لیکن اُن کے دل میں بھی یہ اُمنگ لگی رہتی ہے۔ کہ اُن کے ترک کی، اُن کی عبادت کی۔ اُن کے زُہد کی۔ اُن کے علم کی۔ اُن کی تحریر اور تقریر کی لوگ بڑائی کریں۔ کہا ہے

کنچن تجنا سہج ہے سہج تریا کا سنیہ
مان بڑائی ایرشا دُربھ تجنے ایہ

یعنی "انسان مال و دولت کی خواہش اور نفسِ امّارہ پر تو شاید قابو پا سکتا ہے۔ لیکن بڑپن اور عزّت کی خواہش اور حسد کو چھوڑنا بہت مشکل ہے"۔

انسان کی ہوس ضرب المثل ہے۔ پتنگا صرف رُوپ کی خواہش میں شمع پر جل مرتا ہے۔ ہاتھی نفسِ امّارہ سے اندھا ہو کر بناوٹی ہتھنی کو دیکھ کر گڑھے میں گر جاتا ہے۔ ہرن کو سُریلی آواز کی خواہش جال میں پھنساتی ہے۔ مچھلی کو زبان کا چسکہ کنڈی کا شکار کرتا ہے۔ اس طرح سے ایک ایک خواہش اُن کی موت اور قید کا باعث ہوتی ہے۔ تو پھر انسان کا کیا ٹھکانہ کہ جو سرتاپا ساری قسم کی خواہشات کا پُتلا بنا ہوا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ کہ انسان کس قدر خواہش کا بندہ ہے کہ مر کر بھی اس سے الگ ہونا نہیں چاہتا

فنا کے بعد بھی ہے احتیاجِ خلعتِ تو
تجھے کفن کی ضرورت ابھی ہے تن پرور؟
(عزیز)

یعنی انسان کا مُردہ جسم بھی نئے کپڑے میں لپٹنے کی خواہش کرتا ہے۔ انسان کی کبھی نہ ختم ہونے والی ہوس کو اس شعر میں بہت خوبی سے نبھایا گیا ہے۔
ایک ہندی کوی نے کہا ہے ؎

آل، پتنگ، مرگ، مین، گج، جرت ایک ہی آنچ
تُلسی وُہ کیسے جیئے جس کو لاگیں پانچ

یعنی بھونرا خُوشبو کے شوق میں پروانہ روشنی کے عشق میں۔ ہرن راگ کی دھن میں مچھلی کھانے کی چاٹ میں اور ہاتھی حظِ نفسانی کی دھت میں ہلاک ہوجاتا ہے پھر انسان بیچارے کا کیا ٹھکانہ ہے۔ کہ جس پر پانچوں ہی حسیں غالب رہتی ہیں۔
اب سوال ہو سکتا ہے۔ کہ اگر خواہشات کی تکمیل سے بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ تو کس طرح ہوتی ہے؟ اگر انسان حقیقتاً خوشی کا طالب ہے۔ تو اُسے خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کو ترک کر کے خواہشات سے دل ہٹانا ہوتا ہے ؎

ترکِ لذّت بھی نہیں لذّت سے کم
کچھ مزا اس کا بھی چکھا چاہیئے (امیر مینائی)

جس مقصد کے حصول کے لئے متواتر تگ و دَو کی جاتی ہے۔ دن رات ہاتھ پاؤں مارے جاتے ہیں۔ بھاگ دَوڑ میں وقت خرچ کیا جاتا ہے۔ آج لیا۔ کل پایا۔ اسی امید میں اس بے بہا عُمر کے لمحوں کو لٹایا جاتا ہے۔ وُہ مقصد فی الفور ہاتھ آجاتا ہے۔ کہ جب انسان اپنی خواہشات پر قابُو پالیتا ہے ؎

گھر بیٹھے ہمیں ہاتھ لگی منزلِ مقصُود
جب توڑ کے ہم بیٹھ رہے پاؤں طلب کے (امیر مینائی)

سچ جانو۔ اُس شخص سے زیادہ کنگال، اُس شخص سے زیادہ مُحتاج۔ اُس شخص سے زیادہ بھک منگا کوئی نہیں ہے۔ کہ جو ہوس کا بندہ ہے لیکن جس

شیر مرد نے اپنی خواہشات کو، اپنی ہوس کو دبا لیا ہے۔ اُس کا درجہ اور رُتبہ شہنشاہوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ کہا ہے ؎

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہے یہ — سامان کی حرص، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے تو بادشاہی ہے یہ
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ (حالی)

کیسی خوبصورتی سے کُوزے میں دریا کو بند کیا ہے۔ حاجت کا نہ رہنا۔ خواہشات کو مٹا دینا نہ صرف بادشاہی کے بلکہ خُدائی کے مترادف ہے۔ کبیرؔ صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی فرمایا ہے ؎

چاہ گئی، چنتا مٹی، منوا بے پرواہ
جن کو کچھ نہ چاہیئے سوئی شاہنشاہ

ایک فارسی کا شاعر لکھتا ہے ؎

سر ز ہوا تافتن از سروری ہست
ترکِ ہوا قوتِ پیغمبری ہست

ترجمہ:۔ ہوس سے ہاتھ کھینچنا ہی سرداری ہے۔ اور ہوس کو اصلاً چھوڑ دینا پیغمبری طاقت ہے۔

عبادتِ الٰہی کے شائقوں کو تو یہ بات خاص طور پر مدِ نظر رکھنی چاہیئے۔ کہ سچی عبادت حاجات اور خواہشات سے لاپروائی ہے۔ اُس شخص کا عابد اور زاہد ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ یا اُس کی پُوجا اور نماز کیسے سُود مند ہو سکتی ہے۔ جس کے دل سے ہوس ہی دُور نہیں ہُوئی ؎

آسن مارے کیا بھیا، موئی نہ من کی آس
جیوں تیلی کے بیل کو گھر ہی کوس پچاس

یعنی "بگلے کی طرح آنکھ میچ کر بیٹھنے سے کیا حاصل، اگر دل کی ہوس رفع نہیں ہوئی۔ ایسے انسان کی حالت وُہی ہے کہ جو کولھو کے بیل کی۔ جو آنکھوں پر ٹی لگے ہوئے سارا دن چلتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ وُہ بہت دُور نکل گیا ہوگا۔ لیکن آنکھیں کھلنے پر اُسے پتہ لگتا ہے۔ کہ وہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے"۔ اسی طرح سے ہوس اور خواہش کو لئے ہُوئے عبادت کرنا منزلِ عرفان میں ترقی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ایسے انسانوں کی نسبت کرشن بھگوان نے بھگوت گیتا کے تیسرے ادھیائے میں کہا ہے۔ کہ اگر ایک انسان دل کے اندر خواہشات رکھتا ہُوا ہاتھ پیر سُکیڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور دھیان اس کا دُنیاوی چیزوں کی طرف دوڑتا ہے۔ تو وہ شخص مکار ہے اور ریاکار ہے۔ مولانا رُوم نے بھی فرمایا ہے ؎

زہد و تقوےٰ چیست اے مردِ فقیر
لا طمع بُودن ز سلطان و امیر

ترجمہ:۔ اے خدا کے بندے زہد و تقویٰ یعنی عبادت اور معرفت کس چیز کا نام ہے۔ وُہ صرف یہ ہے۔ کہ انسان کسی بھی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔

جو انسان اپنے مالک سے واصل ہونا چاہتے ہیں۔ دیدارِ الٰہی کے خواستگار ہیں۔ پربھو درشن کے خواہشمند ہیں۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اُن کی یہ اُمید تب تک بار آور نہیں ہو سکتی۔ جب تک وُہ خواہشات کو اپنے دل میں جگہ دیتے رہیں گے ؎

صد تمنا در دل است اے بوالفضول
کے کُند نُورِ خدا در دل نزول　　(مولانا روم)

شیر مرد نے اپنی خواہشات کو، اپنی ہوس کو دبا لیا ہے۔ اُس کا درجہ اور رُتبہ شہنشاہوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ کہا ہے ؎

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہے یہ سامان کی حرص، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے تو بادشاہی ہے یہ
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ (حالی)

کیسی خوبصورتی سے کُوزے میں دریا کو بند کیا ہے۔ حاجت کا نہ رہنا۔ خواہشات کو مٹا دینا نہ صرف بادشاہی کے بلکہ خُدائی کے مترادف ہے۔ کبیر صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی فرمایا ہے ؎

چاہ گئی، چنتا مٹی، منوا بے پرواہ
جن کو کچھ نہ چاہیئے سوئی شاہنشاہ

ایک فارسی کا شاعر لکھتا ہے ؎

سرز ہوا تافتن از سروری ہست
ترکِ ہوا قوتِ پیغمبری ہست

ترجمہ:- ہوس سے ہاتھ کھینچنا ہی سرداری ہے۔ اور ہوس کو اصلاً چھوڑ دینا پیغمبری طاقت ہے۔

عبادتِ الٰہی کے شائقوں کو تو یہ بات خاص طور پر مدِ نظر رکھنی چاہیئے۔ کہ سچّی عبادت حاجات اور خواہشات سے لاپرواہی ہے۔ اُس شخص کا عابد اور زاہد ہونا کیا معنی رکھ سکتا ہے۔ یا اُس کی پُوجا اور نماز کیسے سُود مند ہو سکتی ہے۔ جس کے دل سے ہوس ہی دُور نہیں ہُوئی ؎

آسن مارے کیا بھیا، موئی نہ من کی آس
جیوں تیلی کے بیل کو گھر ہی کوس پچاس

یعنی "بگلے کی طرح آنکھ میچ کر بیٹھنے سے کیا حاصل، اگر دل کی ہوس رفع نہیں ہوتی۔ ایسے انسان کی حالت وُہی ہے کہ جو کولھو کے بیل کی۔ جو آنکھوں پر پٹی لگے ہوئے سارا دن چلتا ہے۔ اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ وُہ بہت دُور نکل گیا ہوگا۔ لیکن آنکھیں کھلنے پر اُسے پتہ لگتا ہے۔ کہ وہ وہیں کا وہیں کھڑا ہے۔" اسی طرح سے ہوس اور خواہش کو لئے ہوئے عبادت کرنا منزلِ عرفان میں ترقی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ ایسے انسانوں کی نسبت کرشن بھگوان نے بھگوت گیتا کے تیسرے ادھیائے میں کہا ہے۔ کہ اگر ایک انسان دل کے اندر خواہشات رکھتا ہوا ہاتھ پیر سکیڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور دھیان اس کا دُنیاوی چیزوں کی طرف دوڑتا ہے۔ تو وہ شخص مکّار ہے اور ریاکار ہے۔ مولانا رُوم نے بھی فرمایا ہے ؎

زہد و تقوے چیست اے مردِ فقیر
لا طمع بودن ز سلطان و امیر

ترجمہ:۔ اے خدا کے بندے زہد و تقویٰ یعنی عبادت اور معرفت کس چیز کا نام ہے۔ وُہ صرف یہ ہے۔ کہ انسان کسی بھی بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔

جو انسان اپنے مالک سے واصل ہونا چاہتے ہیں۔ ویدارالٰہی کے خواستگار ہیں۔ پربھو درشن کے خواہشمند ہیں۔ اُن کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اُن کی یہ اُمید تب تک بار آور نہیں ہو سکتی۔ جب تک وُہ خواہشات کو اپنے دل میں جگہ دیتے رہیں گے ؎

صد تمنّا در دل است اے بوالفضول
کے کند نورِ خدا در دل نزول
(مولانا روم)

ترجمہ: "اے ہوس کے بندے! تیرے دِل کے اندر سیکڑوں خواہشیں چکر لگا رہی ہیں۔ ایسی حالت میں اس دل کے اندر اس پروردگار کا نُور کیسے اُتر سکتا ہے؟"

سوال ہو سکتا ہے۔ کہ دُنیاوی چیزوں کے بغیر دُنیا کے کام کاج کس طرح چل سکتے ہیں۔ اَور خواہشات کو چھوڑنا نکمّا بننے کی تعلیم ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا ایک مذموم عادت ہے۔ پہلے ہی ان گنت سادھو اَور فقیر اس دنیا کے اندر کاہلی اَور سُستی کے پُتلے پھر رہے ہیں۔ پھر یہ نکمّے پن کی تعلیم دینا کہاں تک واجب ہے۔ اعتراض تو معقول ہے لیکن خواہشات کو ترک کرنے کی تعلیم ہرگز نکمّے پن کی تعلیم نہیں ہے۔ اس جگہ پر غلطی لگتی ہے۔ اس بات کا جواب ایک ہندی کوی کے دوہے میں موجود ہے ؎

جا تن بار دھی ہیں سدا کھیلت اتنو ترنگ
اُگے گی کیوں کر کہو تا مدھی بدھ اُمنگ
(دیوگی)

ترجمہ: جس انسان کے اندر ہمیشہ ناپاک خواہشات اُٹھتی ہیں۔ اس کے اندر کبھی زندگی کے میدان میں سینہ سپر ہونے کی خواہش بھلا پیدا ہو سکتی ہے؟

اس بات کو مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہُوں۔ ایک کتا ہے۔ کہ جو ہر وقت ٹکڑے کی خواہش سے در بدر پھرتا ہے۔ اس کو ٹکڑا بھی نہیں ملتا۔ اَور جگہ جگہ ڈنڈے پڑتے ہیں۔ اَور جہاں کہیں دوسرا کتا مِل گیا۔ تو وُہ دانت دکھا کر ہی رہ جاتا ہے۔ یا دُم دبا کر ایک طرف کو دوڑنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک دُوسرا کتا ہے۔ جو اپنے مالک کے دروازے پر آرام سے سویا رہتا ہے۔ کہیں نہیں جاتا۔ رات ہونے پر اگر موقعہ پڑے گا۔ تو اپنی جان لڑا دیگا۔ مجال نہیں۔ کہ کوئی چرند پرند یا انسان وہاں پھٹک سکے۔ بس اس طرح سے خواہشات کو رفع کرنے سے مُراد

ہے۔ کنگال اور نکما بننے سے مطلب نہیں۔ جو انسان اپنی خواہشات کو سُکیڑ لیتا ہے۔ اس کو حاصل بھی سب شئے ہو جاتی ہے۔ حالانکہ در بدر جانے والے کو کتّے کی طرح سے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ہاتھ نہیں لگتا ؎

بھاگتی پھرتی تھی دُنیا جب طلب کرتے تھے ہم
اب کہ جب نفرت ہوئی، وہ بے قرار آنے کو ہے

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

ترکِ دنیا ہر کہ کرد از زہدِ خویش
پیش آمد، پیشِ او دنیا و بیش

ترجمہ:- جس کسی نے دُنیا کی ہوس کو اپنی دل کی پاکیزگی سے چھوڑ دیا۔ اُس کے سامنے وُہی دُنیا بہت زیادہ مقدار میں حاضر ہو گئی۔

کمینہ خواہشات یعنی دُوسرے کا نقصان کر کے دُوسرے سے بڑا بننے کے لئے جائز و ناجائز وسائل کا استعمال، رنج و مصیبت کا باعث ہوتے ہیں ؎

لذّت کو ترک کر تو ہو دنیا کا رنج دُور
پرہیز بھی دوا ہے جو بیمار نے کیا (آتش)

دُنیا کی چمکدار چیزیں دھوکے میں ڈالنے والی ہیں۔ یہ گورکھ دھندا ہیں۔ یہ ایک جال ہیں جس میں پھنس کر نکلنا محال ہوتا ہے۔ اگر اس پھندہ سے بچنا منظور ہو۔ تو اُن چمکیلی اور بھڑکیلی چیزوں پر مفتوں نہ ہونا چاہیئے ؎

خواہی کہ رسی بکام برادر دو گام
یک گام ز دُنیا ویکے گام ز کام

ترجمہ:- اے پیارے! اگر تو منزلِ مقصود پر پہنچنے کا خواہش مند ہے۔ تو دو قدم اُٹھا۔ ایک قدم سے تو دُنیا کے لالچوں سے پرے ہٹ جا۔ اور دوسرے قدم سے

خواہشات سے پرے ہو جا۔

جو شیر مرد ہوتے ہیں۔ جنہوں نے دُنیا کی عارضی چمک کے راز کو سمجھ لیا ہوتا ہے۔ وُہ ہمیشہ کہتے ہیں۔ کہ ؎

نہ ہوئے طالبِ دُنیا کبھی مردانِ خُدا
سگِ مُردار تو یہ زاغ و زغن کا حق ہے
(خلیلؔ)

ان کے سامنے لالچ آتے ہیں۔ یہ مایا کی کنجنی دیوی اُن کے سامنے کئی طرح سے آراستہ و پیراستہ ہو کر آتی ہے۔ لیکن وُہ کیا کہتے ہیں ؎

زمانے نے مرے آگے بھی دُنیا پیش کر دی تھی
مگر میں نے تو اپنا فائدہ انکار میں دیکھا

وُہ دنیاوی خواہشات کو شیر مردوں کے لائق ہی نہیں سمجھتے۔ شیر مردوں کی خواہشات اَور ہوتی ہیں۔ دُنیاوی خواہشات کے متعلق وُہ کہتے ہیں ؎

نہیں اک مرد کو دُنیا سے مطلب
مریں نامرد اس زن پر ہزاروں
(آتشؔ)

ان شیر مردوں کا کیا اُصول ہے۔ ان کا کیا شعار ہوتا ہے۔ کیا وُہ انگور دُور ہونے کی وجہ سے ان کو ترش کہہ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نہیں ایسا نہیں۔ وُہ تو کہتے ہیں ؎

دولت کا خیال ہمیں آتا ہی نہیں
یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں ہم دولت استغنا سے
آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں
(رنجیںؔ)

وُہ لوگ ان دُنیاوی چیزوں کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ یہ دُنیا اُن کی نظر میں کچھ قدر نہیں رکھتی۔ جو لوگ ان دنیاوی چیزوں کے پیچھے اپنی دلی راحت

کو کھوتے ہیں۔ اپنے انسانی فرائض سے گمراہ ہوتے ہیں۔ انسان اور انسان کے تعلقات کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اُن کو وہ لوگ نادان سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

بازیچہ است طفل فریب ایں متاعِ دہر
بے عقل مرد ماں کہ بدیں مبتلا شوند

ترجمہ:۔ یہ دنیا کے سامان بچوں کو دھوکہ دینے والا کھیل ہیں۔ جو آدمی ان میں پھنستے ہیں۔ وُہ خارج از عقل ہیں ؛

افراد کا ہی کیا کہنا ہے۔ جو قومیں بھی دُنیا کے لالچ میں زیادہ پڑ گئیں۔ وُہ بھی بربادی کی راہ پر جا پڑیں۔ ہندو قوم نے لالچ میں پڑ کر اپنا ستیا ناس کر لیا۔ اب دوسرے بھائی اُن کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ لازمی طور پر اُن کا بھی وہی حال ہوگا۔ مولانا روم نے سچ کہا ہے ؎

از ہوائے خویش در ہر ملتے
گشتہ ہر قومے اسیر ذلتے (مولانا روم)

ترجمہ:۔ جو بھی قوم لالچ میں پڑ گئی۔ وُہی ذلت و خواری کے چاہ میں جا گری ؛

جاپان کو بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ خوب ترقی کر رہا ہے۔ اپنے ملک کو بڑھا رہا ہے۔ اپنی سلطنت کو وسیع کر رہا ہے۔ خُوب بڑھ چڑھ کر قدم مار رہا ہے لیکن درحقیقت یہ ترقی کی شاہراہ پر نہیں۔ بلکہ بربادی کی سڑک پر دوڑ رہا ہے جلدی ناک کے بل گر کر ذلیل و خوار ہوگا۔ کیا اس طرح سے بستیاں اُجاڑنا، بنی نوعِ انسان کے چھوٹے بڑے افراد، بغیر تمیز کے زن و مرد۔ پیر و جوان کے خون سے ہاتھ رنگنا ترقی کہی جا سکتی ہے۔ ایسا ظلم کبھی رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مظلوم کا بھی کوئی ساتھی ہے ؎

کیا کرتا ہے گردوں بے نشاں بنیادِ ظالم کو
کہیں ہوتا نہیں شدّاد کا باغِ ارم پیدا

اب تو یورپ کے ممالک بھی اسی طرح سے بربادی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں۔ اس طرح سے ترقی یا بزرگی حاصل کرنے کی نسبت تو یہ اچھا ہے کہ ؎

اندر دہنِ مار شود مال مجوئے
در چاہ نشیں و طلبِ جاہ مکن

ترجمہ:۔ اس طرح سے لوٹ کھسوٹ کرنے کی بجائے بہتر ہے۔ کہ انسان خود سانپ کے مُنہ میں جا کر اپنی زندگی ختم کر دے۔ اس طرح سے بزرگی حاصل کرنے کے مقابلہ میں بہتر ہے۔ کہ انسان کوئیں میں گر کر اپنی رسنِ حیات کو کاٹ دے۔

کبھی مت سمجھو۔ کہ ہم دُوسرے کو دبا کر خود اُٹھ سکتے ہیں۔ دُوسرے کو نقصان پہنچا کر آپ فیضیاب ہو سکتے ہیں۔ یا دُوسرے کو دُنیا سے مٹا کر خود زندہ رہ سکتے ہیں۔ یا دوسرے کو محروم کر کے خود لذّت اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی خواہشات رنج کے سمندر میں جا گرائیں گی۔ دُکھوں کے گھنے جنگل میں پریشان کریں گی۔ خوشی کے چشمہ سے بہت دُور جا پھینکیں گی۔ ایسی خواہشات کی پیروی کہیں کا نہیں رکھتی دین و دُنیا دونو جاتی ہیں۔ اگر سچی راحت مقصود ہو۔ تو وہ سبق یاد رکھنا چاہیئے کہ جو ایک مردِ خدا نے ایک سالک کو سنایا تھا ؎

کون کہتا ہے کہ تو دیندار ہے؟ بیچتا ہے دین کو مکّار ہے!
دین کا طالب اور اتنا خود غرض شوخ سمجھا ہی نہیں اپنا فرض
خود غرض کیوں بن رہا ہے یار تُو؟ کِس لیئے ہے چاہتا آزار تُو؟
رزق کی ہے فکر ناحق تجھ کو ہاں رزق سے پُر ہیں زمین و آسماں
زندگی کی گر ہوس ہے اَے عزیز! موت میں اور زندگی میں کر تمیز

سروری کا ہے اگر تجھ کو خیال سوچ لے آخر کو ہوگا جو مآل
تو ستا کش اس کی مت کر زینہار اس سے کب راضی ہؤا پروردگار
خودغرض ہے چاہتا ہے بہتری مانگتا ہے حق سے ناحق سروری
جا اس کے بندوں کی خدمت میں لگ رہ بندوں کی خدمت سے تو عظمت میں رہ
لُطفِ طاعت ہے یہی ذوقِ عبادت ہے یہی رنگِ تقویٰ ہے یہی شوقِ ریاضت ہے یہی

اس سے خوش ہوگا تر پروردگار
گمرہی سے دُور رہ اے ہوشیار!

جن صاحبان کی رغبت یادِ الٰہی کی طرف ہو۔ اور وُہ دیدارِ حق سے فیضیاب ہونا چاہتے ہوں۔ اُن کے لئے تو نہائت ضروری ہے۔ کہ سب قسم کی خواہشات کو ترک کریں۔ ایسے صاحبان کے لئے ترک کے چار درجے رکھے ہیں۔ یعنی

(۱) ترکِ دُنیا (۲) ترکِ عقبےٰ (۳) ترکِ مولےٰ (۴) ترکِ ترک۔

سب سے پہلے دُنیاوی چیزوں کو اور دنیاوی جاہ وحشم کو خیرباد کہنا چاہئے۔ یہ توسب سے نکمّی خواہش ہے۔ جب یہ منزل طے ہو چکے تو اس کے بعد عاقبت کی خواہش یعنی جنّت یا سورگ حاصل کرنے کا خیال بھی چھوڑنا ہوگا۔ بہشت کے اندر حُور وغلمان اور شرابِ طہور یا سورگ میں اندر کے اکھاڑے کی اپچھراؤں اور دیگر بھوگوں کے حاصل ہونے کی خواہش بھی حقیقی راحت کے چشمے تک پہنچنے کے لئے چھوڑنی ہوگی۔ اس کے بعد اس اُمید کے خیال کو بھی ترک کرنا ہوگا۔ کہ اپنے مالک سے وصل حاصل کرنا ہے۔ یعنی جو عبادت یا سادھن کئے جائیں۔ اُن کے عوض میں یہ اُمید بھی نہیں رکھنی ہوگی۔ کہ اپنے مولےٰ سے وصال حاصل کرنا ہے مطلب یہ ہے کہ ساری ریاضت اور تپسیا یا سب کے سب نیک کام بالکل خواہش سے بالاتر ہوکر اُن کو اپنی زندگی کا ایک فرض سمجھ کر کرنا ہوگا۔ اُس کے اجر کا کچھ بھی خیال نہ

رکھنا ہوگا جیسا کہ شریمد بھگوت گیتا کے دوسرے ادھیائے میں لکھا ہے۔ کہ انسان کے لئے ادائیگی فرض لازمی ہے۔ لیکن اس کے اجر کی خواہش لازمی نہیں۔ یعنی کسی اجر کی خواہش کے بغیر اپنے فرائض کو ادا کرنا چاہیئے۔ ؎

امید و بیم کے جھگڑوں سے آگاہی نہیں رکھتے
سبب یہ ہے کہ ہم کوئی تمنا ہی نہیں رکھتے

جب اس قسم کی لاغرضی کی منزل پر رسائی ہو جائے۔ تو پھر اس خیال کو بھی چھوڑنا ہوگا۔ کہ میں اجر نہیں چاہتا۔ یا میں بلاغرض اپنے فرائض کو سرانجام دیتا ہوں اُس صورت میں ترک کے خیال کو بھی ترک کر دینا ہوگا۔ اور یہی آخری منزل ہے اُس وقت انسان مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ یا دیگر قدرتی اشیاء مثلاً سورج اور چاند کی طرح اپنے فرائض کو سرانجام دیتا ہے۔ جیسے اُوپر عرض ہوا طالبانِ دیدارِ حق کو تو خواہشات اسی طرح سے بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکنی ہوں گی۔ اُن کا یہ طرزِ عمل ہونا چاہئے ؎

آرزو بس یہ رہے ہرگز نہ کچھ ہو آرزو
گر دُعا مانگے تو ترکِ مدعا کے واسطے

انہیں تو وُہ دل ہی نہ رکھنا ہوگا۔ جس کے اندر خواہشات کی ذرا بھی لہر اُٹھے یا جس میں کسی اُمید کا کچھ بھی خیال رہے ؎

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

اس سلسلہ سے خواہشات کی منزل کو طے کرنا ہوگا۔ کہا ہے:-

طالبِ دُنیا = سگ۔
طالبِ عقبیٰ = زن۔

طالب مولیٰ = مرد

طالبِ رضا = سچا انسان

کم از کم انسان کو پہلی دو منزلوں سے تو ضرور آگے نکلنا چاہیئے لیکن حقیقی راحت کی طلب ہو یا اگر لافانیت تک رسائی کی آرزو ہو۔ تو یہ چاروں منزلیں ہی طے کرنی ہوں گی۔ اس لافانیت کی منزلوں اور دنیاوی ترقی کے مدارج میں بڑا فرق ہے۔ اوّل الذکر کے لئے ہدائت ہے۔ کہ دُنیا میں جاگتا ہوا بھی سوتے ہوئے کی طرح رہے یعنی دُنیا کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو۔ کسی طرف نگاہ بھی نہ کرے۔ بلکہ آنکھیں باہر کی طرف سے ہٹا کر اندر کی طرف کرلے۔ اور دُنیاوی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ انسان خُوب آنکھیں کھول کر دُنیا میں رہے۔ بلکہ سوتے ہوئے بھی خبردار رہے اور کسی وقت بھی لاپروائی سے کام نہ لے۔ اس لئے ان ہر دو قسم کی منزلوں کے لئے وسائل میں فرق ہے۔ لافانیت حاصل کرنے والوں کو تو رشی یتنی میتریئی کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔

حکایت۔ یاگیہ دلکیہ رشی کی دو پتنیاں تھیں۔ جب رشی گھر چھوڑ کر باہر جانے لگے تو انھوں نے دونو کو کہا۔ کہ وہ گھر کی چیزوں کو اُن میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ تو اُن میں سے ایک نے جس کا نام میتریئی تھا۔ پوچھا کہ جس مدعا کے لئے آپ گھر چھوڑ رہے ہیں۔ کیا وُہ غرض ان گھر کی چیزوں سے یا دُنیا کی باقی چیزوں سے پُوری ہوسکتی ہے۔ رشی نے کہا۔ کہ وُہ مطلب تو ساری دنیا حاصل کر کے بھی حاصل نہیں ہوسکتا تب میتریئی نے بڑے ادب سے عرض کیا۔ کہ اگر ایسی صورت ہے تو وہ کوئی تقسیم نہیں کرانا چاہتی۔ بلکہ اُسی چیز کی خواہشمند ہے۔ کہ جس کو حاصل کرنے لئے رشی خود گھر چھوڑ رہے ہیں۔

اس لئے طالبانِ حقانیت کو تو منبعِ خواہشات کو ہی بند کر دینا ہوگا ع

پہلو میں دل نہ ہو تو کوئی آرزو نہ ہو شاخیں اسی کی ہیں یہی جڑ ہے فساد کی
ان کی قناعت کا یہ حال ہونا چاہیئے کہ

بھوک سے زائد ہو جس کے پاس کھانا اُسکے پاس
اتنی دولت ہے کہ رکھنے کو جگہ ملتی نہیں (اکبر)

البتہ جو صاحبان دُنیاوی کامیابی کے خواہش مند ہیں۔ اُن کے لئے بھی نہایت لازمی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے اندر اس پاک اُصول کو ہمیشہ مدِنظر رکھیں کہ خواہشات ہمیشہ پاکیزہ ہوں۔ اُن کے اندر ناپاکیزگی کا نام ونشان بھی نہ ہو۔ وہ اپنی ترقی کی خواہش کریں۔ لیکن کسی دُوسرے کا نقصان کرکے نہیں۔ دُوسرے کا حق چھین کر نہیں۔ دوسرے کی ترقی میں رُکاوٹ ڈال کر نہیں۔ جائز اور پاک خواہشات کرنے سے نہ ہی دُنیا رُکتی ہے۔ نہ دُنیا کا مالک۔ گڑبڑ وہاں پیدا ہوتی ہے۔ اور خلل وہاں واقع ہوتا ہے کہ جہاں :-

(۱) جس چیز کا انسان حقدار نہیں اُس کی خواہش کرے (۲) جس چیز کا انسان اہل نہیں اُس کی خواہش کرے (۳) جس چیز پر دوسرے کا حق ہے اس کی خواہش کرے (۴) جو چیز حرام ہے اُس کی خواہش کرے (۵) جو چیز کسی کو تکلیف دیکر ملتی ہو اُس کی خواہش کرے (۶) جس چیز کا حصول کسی کی نفرت کا باعث بنے اُس کی خواہش کرے (۷) اپنی ضرورت سے زیادہ خواہش کرے (۸) دُوسروں کی ضرورت کا کبھی خیال نہ کرے۔

اگر ان اُصولوں کا دھیان رکھکر نیک اور جائز خواہشات کیجائیں۔ اور اُن خواہشات کے ذریعے دُنیا میں ترقی کی جائے تو نہ اس میں اعتراض ہے نہ گناہ۔ ایسی پاک خواہشات کے ذریعے انسان جائز ترقی بھی کرسکتا ہے۔ خود خوش رہتا ہے۔ اوروں کے امن میں خلل نہیں ڈالتا بلکہ اوروں کی خوشی کا سبب بنتا ہے۔ اور اس سے اپنے مالک کی بھی خوشنودی حاصل کرتا ہے :-

اِنسان اور اُس کی خوشی

تیرے سینے میں تو ناداں بحرِ بے پایاں رہے
اور تُو قطرے کے پیچھے شاکی و نالاں رہے

دُنیا میں کوئی ایسا انسان نہیں جو خوشی کا متلاشی نہ ہو۔ کیا چھوٹا کیا بڑا۔ کیا مرد کیا عورت۔ کیا مشرقی کیا مغربی۔ ہر کہہ ومہ اس گوہر کی تلاش میں ہے۔ اس دُرِ نایاب کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔ جو کچھ بھی محنت یا تکلیف اس دُنیا میں برداشت کی جاتی ہے۔ وُہ اسی غرض کے لئے کی جاتی ہے۔ کہ خوشی حاصل ہو۔ لڑکا اگر پڑھنے کی تکلیف اُٹھا رہا ہے۔ اور راتوں کو جاگتا ہے۔ تو خوشی کی تلاش میں۔ بڑے لوگ اگر کام کاج میں لگے ہُوئے ہیں۔ تو خوشی کی اُمید میں۔ سائینس داں جو نت نئی ایجادیں کرتا ہے اور رات دن سرگرداں رہتا اور اپنی دماغ سوزی کرتا ہے۔ تو محض خوشی حاصل کرنے کے خیال سے۔ روپیہ کمایا جاتا ہے۔ شادی کی جاتی ہے۔ اولاد کی خواہش کی جاتی ہے جاہ و مرتبہ کی طلب ہوتی ہے۔ کیوں؟ بس خوشی حاصل کرنے کی خاطر۔ غرضیکہ جس قدر تگ و دو اور دوڑ دھوپ دُنیا کے لوگ کر رہے ہیں۔ سب کا مدعا یہی ہے۔ کہ خوشی دیوی کے درشن نصیب ہو جائیں لیکن مشاہدہ اور دریافت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجُود سر توڑ کوشش کے بہت کم ایسے خوش نصیب انسان ہیں کہ جن کو حقیقی خوشی نصیب ہوتی ہے۔ بلکہ اہلِ نظر کا اندازہ ہے۔ کہ نوسو ننانوے فی ہزار انسان بلکہ اس سے بھی زیادہ اصلی خوشی سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ بعض

شاخیں اسی کی ہیں یہی جڑ ہے فساد کی   پہلو میں دل نہ ہو تو کوئی آرزو نہ ہو

ان کی قناعت کا یہ حال ہونا چاہیئے کہ ؎

بھوک سے زائد ہو جس کے پاس کھانا اسکے پاس
اتنی دولت ہے کہ رکھنے کو جگہ ملتی نہیں (اکبر)

البتہ جو صاحبان دُنیاوی کامیابی کے خواہش مند ہیں۔ اُن کے لئے بھی نہایت لازمی ہے کہ وہ اپنی خواہشات کے اندر اس پاک اُصول کو ہمیشہ مدّنظر رکھیں کہ خواہشات ہمیشہ پاکیزہ ہوں۔ اُن کے اندر ناپاکیزگی کا نام ونشان بھی نہ ہو۔ وہ اپنی ترقی کی خواہش کریں۔ لیکن کسی دُوسرے کا نقصان کر کے نہیں۔ دُوسرے کا حق چھین کر نہیں۔ دوسرے کی ترقی میں رُکاوٹ ڈال کر نہیں۔ جائز اور پاک خواہشات کرنے سے نہ ہی دُنیا رُوکتی ہے۔ نہ دُنیا کا مالک۔ گڑبڑ وہاں پیدا ہوتی ہے۔ اور خلل وہاں واقع ہوتا ہے کہ جہاں :-

(۱) جس چیز کا انسان حقدار نہیں اُس کی خواہش کرے (۲) جس چیز کا انسان اہل نہیں اُس کی خواہش کرے (۳) جس چیز پر دوسرے کا حق ہے اس کی خواہش کرے (۴) جو چیز حرام ہے اُس کی خواہش کرے (۵) جو چیز کسی کو تکلیف دیکر ملتی ملتی ہو اُس کی خواہش کرے (۶) جس چیز کا حصُول کسی کی نفرت کا باعث بنے اُس کی خواہش کرے (۷) اپنی ضرورت سے زیادہ خواہش کرے (۸) دُوسروں کی ضرورت کا کبھی خیال نہ کرے۔

اگر ان اُصولوں کا دھیان رکھکر نیک اور جائز خواہشات کیجائیں۔ اور اُن خواہشات کے ذریعے دُنیا میں ترقی کی جائے تو نہ اس میں اعتراض ہے نہ گُناہ۔ ایسی پاک خواہشات کے ذریعے انسان جائز ترقی بھی کر سکتا ہے۔ خود خوش رہتا ہے۔ اوروں کے امن میں خلل نہیں ڈالتا بلکہ اوروں کی خوشی کا سبب بنتا ہے۔ اور اس سے اپنے مالک کی بھی خوشنودی حاصل کرتا ہے ؛

اِنسان اَور اُس کی خُوشی

تیرے سینے میں تو ناداں بحرِ بے پایاں رہے
اَور تُو قطرے کے پیچھے شاکی و نالاں رہے

دُنیا میں کوئی اَیسا انسان نہیں جو خوشی کا متلاشی نہ ہو۔ کیا چھوٹا کیا بڑا۔ کیا مرد کیا عورت۔ کیا مشرقی کیا مغربی۔ ہر کہہ ومہ اس گوہر کی تلاش میں ہے۔ اس دُرِ نایاب کی جستجو میں لگا ہوا ہے۔ جو کچھ بھی محنت یا تکلیف اس دُنیا میں برداشت کی جاتی ہے۔ وُہ اسی غرض کے لئے کی جاتی ہے۔ کہ خوشی حاصل ہو۔ لڑکا اگر پڑھنے کی تکلیف اُٹھا رہا ہے۔ اَور راتوں کو جاگتا ہے۔ تو خوشی کی تلاش میں۔ بڑے لوگ اگر کام کاج میں لگے ہُوئے ہیں۔ تو خوشی کی اُمید میں۔ سائینس داں جو نت نئی ایجادیں کرتا ہے اور رات دن سرگرداں رہتا اَور اپنی دماغ سوزی کرتا ہے۔ تو محض خوشی حاصل کرنے کے خیال سے۔ روپیہ کمایا جاتا ہے۔ شادی کی جاتی ہے۔ اولاد کی خواہش کی جاتی ہے جاہ و مرتبہ کی طلب ہوتی ہے۔ کیوں؟ بس خوشی حاصل کرنے کی خاطر۔ غرضیکہ جس قدر تگ و دَو اَور دوڑ دھوپ دُنیا کے لوگ کر رہے ہیں۔ سب کا مدّعا یہی ہے۔ کہ خوشی دیوی کے درشن نصیب ہو جائیں لیکن مشاہدہ اور دریافت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ باوجود سر توڑ کوشش کے بہت کم ایسے خوش نصیب انسان ہیں کہ جن کو حقیقی خوشی نصیب ہوتی ہے۔ بلکہ اہلِ نظر کا اندازہ ہے۔ کہ نوسو ننانوے فی ہزار انسان بلکہ اس سے بھی زیادہ اصلی خوشی سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ بعض

احباب خیال کریں گے۔ کہ اس امر کا اندازہ لگانے میں اہلِ نظر نے غلطی کھائی ہے کیونکہ بہت سے آدمی دُنیا کے اندر خوشی سے سرشار ہیں لیکن یہ ایک بھُول ہے۔ یہ اندازہ بالکل دُرست ہے۔ بلکہ اگر پُوری پُوری جانچ کی جائے۔ تو دس ہزار میں سے مشکل سے ایک انسان صحیح معنوں میں خوش ملے گا۔ دُنیا کے اندر ایک انسان کو دوسرا انسان خوش دکھائی دیتا ہے۔ وُہ اپنی حالت کا اور دُوسرے کی ظاہرہ حالت کا چند باتوں سے موازنہ کر کے نتیجہ نکال لیتا ہے۔ کہ دوسرا آدمی خوش ہے مثلاً ایک شخص لاولد ہے۔ اور دوسرا صاحب اولاد ہے۔ تو وُہ صاحبِ اولاد کو خوشی سے بھرپُور خیال کرتا ہے۔ یا بعض آدمیوں کے پاس دولت نہیں ہے۔ گھر کا مکان نہیں ہے اچھے کپڑے نہیں ہیں یا دیگر ٹھاٹھ باٹھ۔ سازوسامان نہیں ہیں۔ دُنیاداروں میں عزّت نہیں ہے۔ اور دُوسرے آدمیوں کو یہ چیزیں مہیّا ہیں۔ تو جو لوگ ان مقبوضات سے محرُوم ہیں۔ وُہ ان چیزوں کے مالکوں کو خوشی کے چشمے کا مالک سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ اُن آدمیوں سے اگر پوچھو۔ تو بعض تو مقبوضات کو ہی رنج اور مصیبت کا باعث بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک انسان کے ہاں اولاد ہے۔ لیکن وُہ بہت زیادہ ہے۔ اور انتظام معاش کافی نہیں ہے۔ تو وُہ اس وجہ سے رنجیدہ خاطر رہتا ہے۔ یا اولاد نافرمانبردار اور بدچلن ہے۔ تو اس سبب سے آزُردہ خاطر رہتا ہے۔ یا اُس کے بچّے اکثر کسی نہ کسی مرض کا شکار رہتے ہیں۔ تو اس وجہ سے کبیدہ خاطر رہتا ہے جن کے پاس دولت ہے۔ اُن کے لئے یا تو وُہ دولت ہی باعث خوف وخطر بنی رہتی ہے یا کسی اور دنیاوی کمی یا صحت کی خرابی کی وجہ سے وہ دولت خوشی کا موجب نہیں بنتی۔ غرضیکہ بعض انسانوں کو دنیاوی چیزوں کا مالک دیکھ کر یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہیئے۔ کہ وُہ حقیقتاً ان اشیا سے خوشی حاصل کر رہے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں دو ایسے انسانوں کی مثالیں رکھتا ہُوں۔ کہ جن کا مقابلہ دُنیاوی مقبوضات کے

لحاظ سے شائد ہی کوئی اور کر سکتا ہو۔ اور ظاہر بین انسان یہ سمجھتے ہونگے۔ کہ رنج و غم اُن کے نزدیک تک نہیں پھٹک سکتے۔ لیکن اصل حالت آپ کو اُن کی کہانی سُن کر پتہ لگے گی۔ اور اِن سچی کہانیوں کے سُننے کے بعد آپ کو یقین ہو جائے گا۔ کہ محض دُنیاوی مقبوضات ہی خُوشی کا باعث نہیں بن سکتے۔ اور خوشی اُس شخص کا ہی ورثہ نہیں ہوتی جو صاحبِ زر ہو۔ عُہدہ دار ہو یا صاحبِ اقتدار۔ ان دو کہانیوں میں سے ایک تو اِسی مُلک کے باشندے کی ہے۔

کچھ عرصہ ہُوا۔ مجھے میرے ایک دوست نے قصہ سُنایا۔ کہ چند سال ہوئے کہ ایک مشہور شہر میں وہ تعینات تھے۔ وہاں پر ایک سیٹھ صاحب رہتے تھے۔ اُن کی دولت کا یہ عالم تھا۔ کہ اکثر ریاستیں اُن کی مقروض تھیں۔ شان و شوکت کا یہ حال تھا کہ اُن کے ہاں طرح طرح کے گھوڑے گاڑیاں اور موٹریں درجنوں کی تعداد میں موجود رہتی تھیں۔ عزت کی یہ صُورت تھی۔ کہ شہنشاہِ معظم جب اس ملک میں آئے تھے۔ تو حضور شہنشاہ ملکہ صاحبہ باالقابہ چند یوم کے لئے ان کے ایک مکان میں جا کر ٹھہری تھیں۔ اور بڑے سے بڑے خطابات اور اعزاز اُن کو ملے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اولاد بھی تھی۔ بلکہ لڑکا ایسا نیک اور ہوشیار تھا۔ کہ اُس نے اپنے والد کی حینِ حیات میں ہی سارے کاروبار کو سنبھال لیا تھا۔ میرے دوست کہنے لگے کہ مجھے ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں رہنے کا اتفاق ہوتا رہا تھا۔ لیکن اس طرح سے سب قسم کی نعمتوں سے ممتاز کوئی شخص نہ دیکھا تھا۔ اس سیٹھ صاحب کو دیکھ کر یقین ہُوا۔ کہ اس کی خوشی کا پیمانہ پُورے طور پر لبریز ہے۔ اس بات کو جانچنے کے لئے میرے دوست نے سیٹھ صاحب کے ساتھ سلسلۂ راہ و ربط پیدا کیا۔ جب تعلقات ذرا بڑھ گئے۔ تو میرے دوست نے سیٹھ صاحب سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ سیٹھ صاحب مَیں نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں

اگر کسی کا خوشی کا ستارہ پُورے جوبن سے چمکتا ہُوا دیکھا ہے۔ تو آپ کا ہے۔ پھر پُوچھا کیا میرا یہ خیال دُرست ہے۔ سیٹھ صاحب جو اس وقت تک خُوب خُوش گپیاں لگا رہے تھے۔ اور ہنس کھیل رہے تھے۔ چُپ ہو گئے۔ چہرہ پر اُداسی چھا گئی۔ بے چینی سے جسم کے اعضاء کو اِدھر اُدھر حرکت دینے لگے۔ میرے دوست کو حیرانی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ افسوس اس لئے کہ کیوں اس قسم کا سوال کیا گیا جس سے اُن کی خوشی کا عالم بدل گیا۔ اور حیرانی اس لئے کہ اس شخص کو کس چیز کی کمی ہے۔ کہ جس کے خیال سے اُس کی حالت میں یہ تغیر آ گیا۔ آخر سیٹھ صاحب کی آنکھوں میں آنسُو ڈبڈبا آئے۔ اور ٹھنڈی سانس بھر کر اُنہوں نے کہا۔ کہ بھائی صاحب آپ نے شاید اس ساز و سامان اور ٹھاٹھ باٹھ سے یہ اندازہ لگایا ہے۔ کہ مَیں مکمّل خُوش انسان ہُوں لیکن حقیقت اس سے کوسوں دُور ہے۔ میرے دل میں اپنے ایک گھریلُو واقعہ کی وجہ سے ایک ایسی خلش اور جلن ہے۔ کہ مجھ کو ہر وقت بے آرام رکھتی ہے۔ وُہ خلش میرے جسم کو گھُن کی طرح اندر ہی اندر کھا رہی ہے۔ اور یہ یقین ہے۔ کہ اگلے سال تک وُہ میرے جسم کا خاتمہ کر دے گی۔ میرے دوست نے بتایا۔ کہ وُہ واقعہ بھی سیٹھ صاحب نے مختصر الفاظ میں بتایا۔ اور درحقیقت سیٹھ صاحب کا وجُود کسی مرض میں مبتلا نہ ہونے کے باوجُود اگلے سال نابُود ہو گیا۔ دُوسری کہانی ملک غیر کے ایک مغربی دولت مند کی ہے۔ وہاں یہی حالت سینکڑوں زر داروں کی ہے۔ مسٹر راک فیلر کے نام سے آپ پُورے طور پر واقف ہیں۔ وُہ دُنیا کا سب سے بڑا مالدار یا کم از کم چند سب سے بڑے مالداروں میں سے ایک آدمی گنا گیا ہے۔ اس کی کمائی کا تو کہنا ہی کیا۔ اس کے خیرات میں دیئے ہُوئے روپے کا ہی کوئی شمار نہیں تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک ریسرچ (RESEARCH) کے کام کے لئے ڈیڑھ کروڑ روپیہ دیا۔ لیکن جب اس عطیہ کا اعلان ایک جلسے میں کیا گیا۔ جس میں کہ وُہ

خود بھی موجود تھے۔ تو کہا گیا۔ کہ مسٹر راک فیلر بڑے ہی شکریہ کے مستحق ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جس کام کے لئے یہ روپیہ درکار ہے۔ اس کے لئے یہ رقم شاید کافی نہ ہو گی۔ مسٹر راک فیلر نے یہ سُن کر اس رقم میں بغیر کسی پس وپیش کے ایک کروڑ روپیہ کا اضافہ کر دیا یعنی بجائے ڈیڑھ کروڑ کے اڑھائی کروڑ کر دیا۔ اب اُس شخص کی دولت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ لیکن یہ شخص بارہا کہتا ہوا سُنا گیا۔ کہ اس قدر مال و دولت کے باوجود دِلی راحت اور دلی خوشی اُس کو نصیب نہیں۔ اور وُہ سچی خوشی کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتا ہے۔

ان دو مثالوں سے آپ پر واضح ہو گیا ہو گا۔ کہ دُنیا کی آسائشیں سچی خوشی بہم پہنچانے کا موجب نہیں ہو سکتی۔ تو اب سوال ہو سکتا ہے۔ کہ خوشی حاصل کرنے کا پھر کیا ذریعہ ہے؟ کس چشمے سے یہ آبِ حیات مل سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر مَیں آپ سے عرض کروں گا۔ کہ آپ پہلے خوشی کے معیار کو سمجھ لیں۔ کہ کس حالت کو خوشی کی حالت کہہ سکتے ہیں۔ مختصراً خوشی کی حالت وُہ ہے۔ کہ جب وُہ کسی چیز یا انسان پر طاری ہو۔ تو اُس کے دیکھنے والے بھی خوشی محسوس کریں۔ مثلاً پہلے آپ انسانوں کو چھوڑ کر قدرت کی دیگر اشیاء کی طرف غور کریں۔ ایک پھُول جب کھلا ہُوا ہو۔ تو وُہ اس کی خوشی کی حالت ہوتی ہے۔ اور دیگر لوگ بھی اس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ وُہ اپنی خوشرنگی سے آنکھوں کو طراوت اور اپنی خوشبو سے دماغ کو معطر کرتا ہے۔ مُرجھایا ہُوا پھُول نہ خود خوش ہوتا ہے۔ نہ دیکھنے والوں کو ہی خوشی مہیا کرتا ہے۔ ایک پھلوں سے لدا ہُوا درخت اور ایک ہرے ہرے پتّوں سے بھرا ہُوا پودا خود مُسرّت و انبساط کے عالم میں ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کے اندر بھی وُہی نقشہ پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگ ان سے پھلوں کا لُطف اور سایہ کا آرام حاصل کرتے ہیں۔ جب موسم خزاں میں وہ پودا اور درخت بے برو برگ ہو جائیں۔ تو ان پر

خود بھی اُداسی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور کوئی آدمی ان کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا ایک کوئل اپنی سُریلی آواز سے گاتی ہوئی اپنے ترنم سے خود بھی سرشار ہوتی ہے۔ اور سُننے والوں کے دِل میں بھی اُمنگیں پیدا کرتی ہے۔

اُس صانعِ مطلق کی کائنات میں سے بہت سی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے اسی مختصر ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ان مثالوں سے شاید آپ یہ نتیجہ نکال لیں۔ کہ پھول اور پودوں کی خوبصورتی اور کوئل کی آواز خوشی کے دینے والی چیزیں ہیں۔ لیکن یہ نتیجہ درست نہیں کیونکہ خوبصورت تو سانپ اور شیر بھی ہوتے ہیں۔ اور بعض بعض سانپ تو بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیکن کیا لوگ ان کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ آوازیں تو گیدڑ اور کتے بھی شب و روز لگاتے ہیں۔ تو کیا اِن کی آوازوں کو سُن کر لوگوں کو مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ بالکل نہیں۔ سانپ کو تو دیکھتے ہی لوگ بغیر اس خیال کے کہ وُہ کتنا خوبصورت ہے۔ مارنے کو دوڑتے ہیں۔ اور کتّے کو بھونکنے سے بند کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اُس کی آواز کرخت ہوتی ہے۔

بعض لوگ خوشی کی تعریف یہ کرتے ہیں۔ اور اکثر اہلِ لغت نے بھی یہی معنے لکھے ہیں۔ کہ خوشی اپنے دِل کی تسلی کا نام ہے۔ لیکن یہ معنی درست نہیں مثلاً۔ ایک چور کو اپنی چوری کے مشن میں کامیابی حاصل کرکے اپنے دل میں تسلی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے ایک انتقام کا جذبہ رکھنے والے کو اپنے مخالف کو قتل کرکے یا کوئی دوسرا نقصان پہنچا کر یا اس کو دُنیا میں مصیبت زدہ دیکھ کر دل میں تسلی ہوتی ہے۔ تو کیا اس دل کی تسلی کو خوشی کا نام دیا جاسکتا ہے کبھی نہیں۔ ایسے ہی ایک مسلمان دیگر ملّت والوں کو اپنے ملّت میں شامل کرکے یا ایک ہندو یا عیسائی یا سکھ دیگر شریعت والوں کو اپنے دائرۂ طریقت میں لاکر دل میں تسلی محسوس کرتا ہے۔ تو کیا یہ حالت خوشی کے

نام سے منسوب کی جاسکتی ہے کسی صُورت میں نہیں۔ ان سب حالتوں میں دل کی جھوٹی تسلّی کو انسان خوشی کا نام اُسی طرح سے دے سکتا ہے۔ کہ جیسے ایک یرقان کی بیماری میں مبتلا شخص سمجھتا ہے۔ کہ ہر ایک چیز زرد رنگ کی ہے۔ یا ایک خاص رنگ کی عینک پہن کر ایک انسان دُنیا کی ہر ایک شئے کو اُسی رنگ کی دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن اگر اُس کی عینک کو اُتار دیا جائے۔ یا یرقان کی مرض سے شفا ہو جائے۔ تو اس کو اپنی غلط فہمی کا پتہ لگ جائے گا۔

یہ عرض ہو چکا ہے۔ کہ دُنیا میں سارے کے سارے لوگ اس گوہر بے بہا کی طلب و تلاش میں مصروف ہیں۔ لیکن کامیابی خال خال کسی خوش قسمت کو نصیب ہوتی ہے۔ تو کیا دُنیا میں خوشی ہے ہی نہیں۔ یا کیا وُہ بہت کم مقدار میں موجُود ہے جو اکثر لوگوں کو باوجُود اتنی تجسس اور سعی کے دستیاب نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی نہیں بلکہ کائنات کا کونہ کونہ اس بجلی سے اَٹا پڑا ہے۔ قدم قدم پہ خوشی کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ پر اُس کی دکان کھلی ہوئی ہے۔ قُدرت ہزاروں ہاتھوں میں خوشی کے جام لئے دُنیا میں گردش کر رہی ہے۔ لیکن بدقسمت لوگ پھر بھی باوجُود اس کثرت کے اس کو حاصل نہیں کر سکتے۔ تو آخر اس ساری بحث سے نتیجہ کیا نکلا۔ ایک طرف کہا جاتا ہے کہ یہ ایک گوہرِ نایاب ہے اور باوجُود انتہائی کوشش و سعی کے اس کا حاصل کرنا کارے دارد۔ دُوسری طرف بیان کیا جاتا ہے۔ کہ دُنیا بھر میں کوئی قطعہ خُشک و تر جنگل و ویرانہ۔ پہاڑ یا ریگستان ایسا پایا نہیں جاتا۔ کہ جہاں اُس کی کثرت نہ ہو۔ یہ دو متضاد صُورتیں کیسے ہو سکتی ہیں۔ اس بات کی سمجھ مندرجہ ذیل حکائت سے آجائے گی۔

ایک دیہاتی جس کو مٹھائی اور شیرینی کھانے کو بہت کم نصیب ہوئی تھی شہر میں گیا۔ وہاں جا بجا پھرتا ہُوا حلوائیوں کے بازار میں پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا۔ کہ

انواع واقسام کی لذیذ مٹھائیوں کے تھال بھرے رکھے ہیں۔ اور اُن کے پاس ایک ایک دو دو آدمی بالکل خاموش بیٹھے ہیں۔ مٹھائی کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ وُہ دیہاتی ایک حلوائی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے ہاتھ کی دونو اُنگلیاں اُس کی آنکھوں میں داخل کرنے لگا۔ حلوائی نے للکارا کہ ارے ناداں کیا کرتا ہے۔ کیا مجھے اندھا کرنا چاہتا ہے۔ دیہاتی بولا۔ اوہو گیا تم کو دکھائی دیتا ہے۔ میں نے تو سمجھا تھا۔ کہ تم دونو آنکھوں سے اندھے ہو۔ اور مَیں اپنے خیال کی تصدیق اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں تمہاری آنکھوں کے پاس لے جا کر کرنی چاہتا تھا۔ حلوائی بولا۔ کہ تم نے یہ نتیجہ کہاں سے نکالا۔ کہ مَیں اندھا ہُوں۔ وُہ بولا۔ کہ تیرے پاس اتنے رنگارنگ کی مٹھائیوں کے تھال بھرے پڑے ہیں۔ اور تو اُن کے پاس چُپ چاپ بیٹھا ہے۔ اُن کا لُطف نہیں اُٹھاتا۔ کیا تیرے اندھا ہونے میں کوئی شک ہے؟ وہ حلوائی اور سب تماشائی لوگ ہنس پڑے۔ اور دیہاتی کو بے وقُوف سمجھا بیشک لوگوں نے دیہاتی کو نادان اور عقل سے بے بہرہ خیال کیا۔ لیکن اُس نے بات پتہ کی کہی تھی۔ دُنیا کے اندر خوشی کے ڈھیر اسی طرح سے لگے ہوئے ہیں لیکن اہلِ دُنیا اس کے پاس چُپ چاپ بیٹھے ہوتے اس سے محظوظ نہیں ہوتے۔

ایک اَور مثال لیجئے۔ دُنیا کے اندر کھُلی اور تازہ ہوا کی کمی نہیں ہے۔ جتنی مقدار میں وُہ موجود ہے۔ شائد ہی اَور کوئی چیز ہو۔ پھر کیا وُہ مول بکتی ہے۔ یہ بھی نہیں۔ تاہم لوگ کمروں کے اندر خود بخود بند رہ کر اس نعمتِ غیر مترقبہ سے محرُوم رہتے ہیں۔ اَور قسم قسم کے امراض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایسے ہی خوشی کا حال ہے۔

ایک اَور مثال بھی عرض کرتا ہُوں۔ دُنیا کے اندر طاقت بے انداز موجود ہے۔ جو بھی انسان دُنیا کے ذخیرہ سے طاقت لے کر اپنے جسم کو توانا و مضبُوط بنانا چاہیں۔ اُنہیں نہ کچھ دام دینے پڑتے ہیں۔ نہ کسی کا احسان اُٹھانا پڑتا ہے۔ محض

محنت اُٹھانی ہوگی۔ ڈنڈ پیلنے پڑینگے۔ کشتی کرنی ہوگی۔ ہاتھ پاؤں کو حرکت دینی ہوگی۔ اور طاقت حاصل ہو جائے گی۔ اسی طرح سے دُنیا کے اندر خوشی کی انتہا نہیں۔ لیکن لوگ ذرا بھی تردد نہیں کرتے۔

امریکہ کا مشہور مصنف ولیم گلمور سمز لکھتا ہے۔ کہ "خوشی وہ سودا ہے جو کہ ہزاروں دکانوں پر بکتا ہے۔ اور ہزاروں ہی اس کے گاہک ہیں۔ لیکن ملتا وہ کبھی کبھی کسی کسی کو ہی ہے۔ یا تو لوگوں کو اس کی اہمیت ہی معلوم نہیں ہوتی۔ اور یا وہ (خوشی) خود نہیں ٹھہرتی۔ کیونکہ کوئی اس سودے کی خرید سے مطمئن معلوم نہیں ہوتا۔ یہ چیز بکتی تو ضرور ہے۔ لیکن اس کا اٹھا کر دینا مشکل ہے"۔

۱۔ اس کے نہ ملنے کی وجوہات یہی ہیں۔ کہ اول تو لوگ حلوائی کی طرح اسے دیکھتے ہوئے بھی اندھے ہو رہے ہیں۔ غیریت اور نفرت کی پٹی باندھ رکھتے ہیں اور اُسے دیکھ نہیں سکتے۔

۲۔ کھلی ہوا کی طرح اُس کی خبر رکھتے ہوئے بھی اسے لینے کے لئے باہر نہیں نکلتے۔ تنگ دلی اور تنگ ظرفی کے کمروں کے اندر بند رہتے ہیں۔ اور اُسے حاصل کرنے کے لئے باہر نہیں نکلتے۔ تعصب اور تنگ نظری کے دائروں میں گھرے رہتے ہیں۔ اور اس طرح سے خود بخود اس سے محروم رہتے ہیں۔

۳۔ طاقت کی طرح سے سارا کرہ ہوائی خوشی سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن جیسے اس کے حاصل کرنے کے لئے لوگ محنت نہیں اُٹھاتے۔ ایسے ہی حصولِ خوشی کے لئے دوسروں کی خدمت اور بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے تکلیف نہیں اُٹھاتے۔ اور اس چشمۂ شیریں سے دُور ہی دُور رہ جاتے ہیں۔

خوشی کی ٹھیک تعریف اور خوشی کے ٹھیک معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں دل، زبان، ہاتھ سے دوسروں کی بھلائی کرنا۔ یہی وہ تِل ہیں۔ جن سے خوشی

کا تیل نکل سکتا ہے۔ یہی وُہ دُودھ ہے۔ جس میں سے خوشی کا مکھن حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ منتر ہے۔ جس کے ذریعہ خوشی کو قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ یہی وُہ تعویذ ہے۔ جس کے باندھ لینے سے خوشی بس میں آسکتی ہے۔ ایک فرانسیسی مضمون نویس جین ڈے لابرومیر کا قول ہے۔ کہ سب خوشیوں سے لطیف تریں اَور نازک تریں خوشی کے حاصل کرنے کا گُریہ ہے۔ کہ انسان دُوسروں کی خوشی میں ایزادی کرے۔

لوگ خوشی کو ڈھونڈتے ہیں۔ تلاش کرتے ہیں لیکن یہ تلاش سے ملنے کی چیز نہیں ہے۔ امریکن پادری جے۔ ایم لڈو لکھتا ہے۔ کہ "اس شخص سے بڑھکر دُنیا میں کوئی احمق نہیں ہے۔ کہ جو خوشی کی تلاش کہیں باہر کرتا ہے۔ کیونکہ جو خوشی وُہ فرائضِ مخصُوصہ کی ادائیگی کے پرے تلاش کریگا۔ اُسکی یہ کوشش ایسی ہی ہوگی جیسے اپنے دل کے اندر ایک اَور شعلہ بھڑکانا جو کہ اس کی ہڈیوں تک کو چٹ کر جا ئیگا"۔

جو خوشی تلاش کی جاتی ہے۔ جو دُنیاوی چیزوں کے حصُول میں خوشی سمجھی جاتی ہے۔ وُہ حقیقی خوشی نہیں ہوتی۔ وہ جھوٹی خوشی ہوتی ہے۔ ایک امریکن مشہور قانون دان اَور مصنف لکھتا ہے۔ کہ "ساری خوشی حاصل کرنے کے لئے محنت اُٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن خوشی دو قسم کی ہوتی ہے حقیقی اَور باطل۔ ان میں فرق یہ ہوتا ہے۔ کہ سچی خوشی کے لئے قیمت پہلے ادا کرنی پڑتی ہے۔ اَور جھوٹی خوشی کی قیمت بعد میں ادا کرنی پڑتی ہے"۔

چیز کی قیمت پہلے ادا کرنے کے بعد وُہ چیز اپنی ہو جاتی ہے۔ سدا اُنے پاس رہتی ہے۔ اَور کوئی تشویش یا کھٹکا نہیں ہوتا۔ لیکن جس چیز کی قیمت بعد میں ادا کرنی پڑے۔ اس کے متعلق اوّل تو علم نہیں ہوتا۔ کہ کتنی قیمت کس شکل میں کب تک ادا کرنی پڑے۔ پھر وہ چھِن بھی سکتی ہے۔ اس لئے دیر پا نہیں کہی جا سکتی۔

جو لوگ دُنیاوی چیزوں کے اندر عیش و آرام اور خوشی کے متلاشی ہیں۔ اُنہیں فرانسیسی خاتون میڈم ڈے لمبرٹ کا قول یاد رکھنا چاہیئے۔ وُہ لکھتی ہیں۔ کہ دُنیاوی خوشیاں بڑے دھوکہ کی چیز ہیں۔ ظاہرا بڑی آرام دِہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی تلاش میں بھی کافی زحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن جب حاصل ہو جائیں تو اطمینان میسر نہیں ہوتا اور چونکہ جلدی ختم ہوجاتی ہیں۔ اس لئے بڑی مایوسی کی حالت میں چھوڑ جاتی ہیں۔"

دُنیاوی چیزیں جو خوشی کے دینے والی خیال کی جاتی ہیں۔ وُہ حسب ذیل ہیں:-

۱) زرومال دُنیاوی جاہ وحشمت۔ نہ تو یہ بزرگی کا باعث ہیں۔ اور نہ سچی خوشی کا۔ سوچیئے کہ حقیقت میں بڑا آدمی کون ہے؟ کوئی آدمی زرومال سے بڑا نہیں بن سکتا۔ بلکہ مشہور مصنف ایل۔ اے سینیکا کے قول کے مطابق بڑا آدمی وُہ ہے۔ کہ جو اپنے مٹی کے پیالہ کو جامِ بلوری سمجھتا ہے۔ اور جامِ بلوری کو کوزۂ گل سے زیادہ وقعت نہیں دیتا۔

کٹھ اُپنشد کے اندر آتا ہے۔ کہ جب رشی پتر نچکیتا سے یم راج نے خوش ہو کر ور مانگنے کو کہا۔ تو نچکیتا نے کہا۔ کہ مجھے زندگی اور موت کی حقیقت سمجھاؤ۔ یم نے کہا یہ سوال نہ پوچھو۔ اور دُنیا کا جتنا زرومال مانگنا چاہتے ہو۔ مانگ لو۔ تو نچکیتا نے جواب دیا۔ کہ انسان زرودولت سے کبھی سیر اور خوش نہیں ہوسکتا۔ پھر برہدارنیک اُپنشد میں ذکر آتا ہے۔ کہ جب یاگیہ ولکیہ رشی گھر چھوڑ کر جانے لگے۔ تو اُنہوں نے اپنی ہر دو بیویوں کے درمیان گھر کی چیزوں کی تقسیم کرنی چاہی۔ تو ایک رشی پتنی جس کا نام میتریئی تھا۔ نے کہا کہ پیشتر اسکے کہ میں تقسیم شدہ زرومال کا حصّہ قبول کروں۔ میں آپ سے ایک سوال

پوچھنے کا حوصلہ کرتی ہوں۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ کیا ساری دُنیا کا زرومال بھی انسان کو دلی راحت دے سکتا ہے۔ تو رشی نے جواب دیا کہ نہیں۔ تب میتریئی نے کہا۔ کہ ایسی صورت میں میں بھی ان مقبوضات سے ہاتھ کھینچتی ہوں۔ اور آپ کے ساتھ رہ کر میں بھی اپنے مالک کو پلنے کے لئے ریاضت کرونگی۔

سکھ شاستر میں آیا ہے :۔

جیسے مدھوماکھی سینچ سینچ کے اِکتر کرے — ہرے مدھوہارتاں کے مکھ چھار ڈار کے

تیسے کوٹ پاپ کر مایا جور جور موڑھ — انت کال چھاڈ چلے دونو کر جھار کے

یعنی جیسے شہد کی مکھی کہیں کہیں سے پھولوں میں سے شہد اکٹھا کرتی ہے لیکن چھتہ اُتارنے والا مکھیوں کے منہ میں مٹی ڈال کر شہد لے جاتا ہے۔ ایسے ہی خوشی کے لیے کئی قسم کے گناہ کر کے زرومال اکٹھا کرنے والے آخر کار ہائے ہائے کرتے اس دُنیا سے دونو ہاتھ جھاڑ کر چل دیتے ہیں۔

قرآن شریف کی سورت ۹ رکوع ۵ میں آیا ہے۔ کہ جو لوگ خود غرضی کے لئے روپیہ جمع کرتے ہیں۔ آخرت کے روز جمع کردہ سکے تپا تپا کر اُن لوگوں کی پیشانی اور پیٹھ پر دگائے جائیں گے۔ اور کہا جائیگا۔ کہ یہ وہی چیز ہے کہ جس کو تم اکٹھا کرتے رہے ہو۔

اس لئے جو لوگ جائز اور ناجائز طریق پر زر و دولت فراہم کر کے خوشی کے خواہاں رہتے ہیں۔ ان کو احکامِ الٰہی دھیان سے پڑھ کر بخوبی نگاہ میں رکھنے چاہئیں۔ اور یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ خوشی دینے والی چیز کوئی اور ہے۔ وہ کیا ہے ؎

ہزاروں مر گئے قاروں سے بڑھکر — خدا زر دے تو دِل نے آدمی ہیں

خدا بخشے تو بخشے دولتِ عشق

مجھے لاکھوں کروڑوں ہیں اسی ہیں

(بیدار)

ہم اگر حقیقتاً خوش رہنے کی دولت چاہتے ہیں۔ تو اُلفت و مُحبّت کی، نیکی کی، بھلائی کی دولت اکھٹی کرنی چاہیئے۔ دُنیاوی زر و مال راحت رساں نہیں ہیں ؎

عبث ہر طالبِ دولت پہ تجھ کو رشک و حسرت ہے
نہ ہر طاقت میں نیکی ہے نہ ہر دولت میں راحت ہے (اکبرؔ)

دوم۔ عیش و عشرت۔ یہ بھی حقیقی راحت رساں نہیں ہوتے۔ ان سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ جھوٹی اور نقلی ہوتی ہے۔ اور بعد میں اس کی بہت زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ؎

خاتمہ عیش کا حسرت پہ ہی ہوتے دیکھا
رو کے ہی اُٹھے ہیں اس بزم سے گانے والے

اس لئے عیش و عشرت سے بھی پرہیز لازم ہے۔ امریکن پادری رچرڈ نُرہ صاحب لکھتے ہیں۔ کہ دنیاوی عیش و عشرت کی خوشیاں اکثر عارضی، نقلی اور دھوکہ دہ ہوتی ہیں۔ شراب کے نشے کی طرح عیش و عشرت اگر ایک گھڑی کے لئے محظوظ کرتا ہے۔ تو سینکڑوں گھڑیوں کے لئے مغموم کرتا ہے۔ دُنیاوی عیش و عشرت دُنیا کے بندے کو تو چاہے طفل تسلّی دے۔ لیکن اہلِ نظر اس کی حقیقت کو بخوبی سمجھتا ہے۔ وُہ اس کی ظاہرہ چمک کے دھوکہ میں نہیں آتا۔ وُہ اس کے نتائج سے بخُوبی آگاہ ہوتا ہے ؎

جہاں کی زینتیں راحت رساں ہیں چشمِ غافل میں
مگر حق جو کے مضطر دل کو ساکن کر نہیں سکتیں

سوم۔ بزرگی و بڑائی۔ دُنیا کے اندر بڑائی کا طالب بھی حقیقی مسرت سے بہت دُور رہتا ہے۔ عزّت کا طلبگار بھی اصلی راحت سے مہجور رہتا ہے۔ دُنیاوی عزّت و آبرُو خوشی کا باعث نہیں بن سکتیں۔ حقیقی بزرگی کیا ہے۔ سر ولیم جونز لکھتے ہیں

کہ اگر مجھ سے سوال کیا جائے۔ کہ سب سے بڑا انسان کون ہے۔ تو میں جواب دُوں گا۔ کہ وہ جو کہ سب سے اچھا ہے۔ پھر اگر سوال ہو۔ کہ سب سے اچھا کون ہے تو میرا جواب ہوگا۔ کہ وُہ جس نے بنی نوع انسان کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ ہر زمانے میں سب سے بڑے آدمی وُہ ہوتے ہیں۔ جو اپنے ہم جنسوں سے مُحبّت کرنے والے تھے۔ یہ وصف انسانوں کے جملہ حقیقی پیشواؤں میں پائے جاتے ہیں۔ انسانوں کے اندر اعتماد اور انسانوں کے ساتھ اُلفت ہی حقیقی بڑائی کی علامات ہیں ؎ بزرگی بجز خدمتِ خلق نیست

بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

امریکن پادری فلپس بُرکس لکھتے ہیں۔ کہ کسی آدمی کو بڑائی حاصل نہیں ہوتی اگر اُس نے یہ محسوس نہیں کیا۔ کہ اس کی زندگی کی مالک نسل انسانی ہے۔ اور جو کچھ ربّ کریم نے اسکو عطا کیا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کیلئے خرچ کرنیکو ملا ہے۔

پس اگر ہم بڑائی کے ذریعہ خوشی کے طالب ہیں۔ تو ہمیں اس قسم کی بڑائی کے خواستگار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہی بڑائی اصلی راحت و مسرّت مہیا کر سکتی ہے ؎

بڑائی سے بھی ملسکتی ہے دُنیا میں خوشی بیشک بڑائی وُہ ولے حاصل ہوئی ہو جبکہ خدمت سے

چہارم۔ عبادت۔ پربھُو بھگتی یا عبادتِ الٰہی بلا شبہ باعثِ مسرّت ہوتی ہے لیکن اُس کے ساتھ ایک شرط ہے۔ وُہ کیا ؎

عشق ہی جسکو نہیں ہے اُسے ایمان نہیں اپنے مذہب میں وُہ کافر ہے مسلمان نہیں

کوئی عبادت۔ کوئی ریاضت۔ کوئی تپسیا۔ کوئی بھگتی سچی خوشی نہیں دیسکتی۔ اگر اُسکے ساتھ ساتھ انسانی محبت اور خدمت کا جذبہ کام نہیں کرتا۔ ٹھیک تو کہا ہے ؎

یہی ہے عبادت۔ یہی دین و ایماں کہ کام آئے دُنیا میں انساں کے انساں

یُونانی فلاسفر مسٹر فلر لکھتے ہیں۔ کہ انسانوں کا اندازہ ان کے اتوار کے دن

گرجاگھر جانے سے نہ لگاؤ۔ بلکہ دیکھو کہ وہ باقی ایام میں اپنے بھائیوں سے کیسا برتاؤ کرتے ہیں"۔

سر ولیم پن مشہور انگریز مصنف لکھتے ہیں۔ کہ سارے منکسرالمزاج۔ ہمدرد انصاف پسند اور حقیقی انسانوں کا مذہب ایک ہی ہوتا ہے۔ اور ان اوصاف میں سے انسانی ہمدردی خاص درجہ رکھتی ہے۔ خوفِ خُدا انسان کے لئے بڑا ضروری ہے۔ اور سارے عابد انسان جو کہ ریا سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے مالک سے ڈرتے رہتے ہیں۔ لیکن سچے خُدا دوست انسانوں کے اندر ایک اور تڑپ بھی ہونی چاہیئے۔ وُہ کیا ؎

یا خوفِ خُدا یا خوفِ سقر ہیں دو ہی بیاں یہ ترے واعظ
اللہ کے بندے دِل میں ترے ہے سوز و گدازِ محبت بھی؟

اس سوز و گداز کی قدر، اس تڑپ کی منزلت، اس چبھن کی عظمت بیان کرتے ہوتے حضرتِ اقبالؔ نے تو حد کر دی ہے۔ وُہ فرماتے ہیں ؎

خُدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
مَیں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خُدا کے بندوں سے پیار ہوگا

ایک اور بات اس بارہ میں رُوحانی پہلو کی نگاہ سے عرض کرنی ضروری ہے۔ پرشن اُپنشد کے اندر آتا ہے۔ کہ پرماتمانے ہمارے حواسِ خمسہ باہر کی طرف مُنہ والے بنائے ہیں۔ اور یہ اپنا زور باہر کی طرف ہی لگاتے ہیں۔ یعنی باہر کی دُنیاوی چیزوں کی طرف دَوڑتے ہیں۔ آنکھ خوبصُورت نظاروں کے دیکھنے کی مشتاق ہے۔ زبان لذیذ کھانوں کی خواہشمند ہے۔ کان سُریلی آوازوں کے طلبگار ہیں۔ ناک اچھی خوشبُو کی خواستگار ہے۔ ان سب سے بڑھکر دل کی باہر کی طرف دوڑ کا تو کوئی پتہ ہی نہیں لگا سکتا۔ باہر کی طرف دوڑنے سے ان کو سیری نہیں ہوتی

وُہ آگے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ جا بجا بھاگتے ہیں۔ اور اس طرح سے انسان کو بھٹکاتے ہیں۔ اس لئے اُپنشد میں لکھا ہے۔ کہ جو انسان حقیقی راحت کا متلاشی ہے۔ اسے ان حواس کا مُنہ باہر سے موڑ کر اندر کی طرف کر دینا چاہیئے۔ بس پھر وُہ راحت کے چشمہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ آنکھ کو وُہ نظارہ حاصل ہوگا۔ کہ جس سے وُہ ہٹنا نہ چاہیگی۔ کانوں کو وُہ راگ سُنائی دینگے۔ جن کی دُنیا میں مثال نہیں۔ دل کو ایسی ٹھنڈک۔ طمانیت اور شانتی حاصل ہوگی۔ کہ وُہ اپنی ضد اور خوئے بد کو چھوڑ کر سدھے ہُوئے گھوڑے کی طرح چابک کا مُحتاج نہ رہیگا۔ جدھر باگ موڑی جائیگی چُپ چاپ اس طرف ہولیگا۔ بیرُونی آنکھوں کو بند کر کے اندر کی دید میں جو جو لُطف حاصل ہوتا ہے۔ اُس کا اندازہ تحریر و تقریر سے باہر ہے۔ اُس کو وُہی لوگ جانتے ہیں۔ کہ جنھوں نے اس کا احساس کیا ہے۔ گُونگے کے گُڑ کی مثال ہے۔ گُونگا گُڑ کھا کر جو لُطف اُٹھاتا ہے۔ اُسے بیان نہیں کر سکتا ؎

جب تلک آنکھیں کھُلی ہیں دُکھ پہ دُکھ دیکھیں گے یار
مند گئیں جب انکھڑیاں تب سوزؔ سب آنند ہیں (سوزؔ)

آنکھوں کو موند کر باطنی نظارہ کا جو لطف ہے۔ وُہ آنکھیں کھلی رکھنے سے یعنی لذّات کے پیچھے بھاگنے سے حاصل نہیں ہو سکتا ؎

موند رکھنا چشم کا ہستی میں عینِ دید ہے
کچھ نظر آتا نہیں جب آنکھ کھولے ہے حباب

قرآن شریف کے اندر تین نفسوں کا ذکر آتا ہے۔ اوّل نفسِ امارہ۔ یعنی دُنیاوی خواہشات کے پیچھے دوڑنا۔ سُورۂ نازعات میں لکھا ہے۔ کہ وُہی شخص دائمی خوشی کا حصّہ دار ہو سکتا ہے۔ کہ جس نے اپنے نفس امارہ کا کہا نہ مانا۔ یہ نفس انسان کو گُناہ کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ بعد میں دُوسرا نفس

یعنی نفسِ لوّامہ ملامت کرتا ہے۔ کہ اے نادان تُو نے ایسا کیوں کیا۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد پھر اسی شاہراہ پر گامزن ہوتا ہے۔ اسی طرح پر خواہشات کا غلبہ بڑھتے بڑھتے ملامت کا مادہ نفس سے مفقود ہو جاتا ہے۔ اور یہ نفسِ لوّامہ نفسِ امارہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ تیسرا نفسِ مطمئنّہ ہے۔ اس کو خواہشاتِ دُنیاوی سے مطلق سروکار نہیں ہے۔ اس وقت انسان کے اندر خوشی کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کو خود سمجھ نہیں آتی کہ یہ خوشی کی نسیم کہاں سے آ رہی ہے۔

کیا وُہ حالت وُہ درجہ وُہ مقام کوئی معمولی چیز ہے؟ نہیں وہ کسی کسی خوش قسمت انسان کے حِصّے میں آتی ہے۔ اُس کے لئے صاحبِ زر و مال اور صاحبِ جاہ و جلال ترستے ہیں۔ وُہ مقام کیا ہے ؎

یہ اوج یہ مرتبے ہُما کو نہ ملے یہ دلقِ مرقع اُمرا کو نہ مِلے
بخشی ہے خُدا نے ہم کو دولتِ فقر
برسوں ڈھونڈے تو بادشاہ کو نہ مِلے (اُنیس)

اگر ہم لوگ بھی اس مقام پر پہنچنے کے شائق ہیں۔ اگر ہم کو بھی سُرورِ سرمدی اور راحتِ جاودانی کی طلب ہے۔ تو لذاتِ دُنیا سے ہاتھ اُٹھانا ہوگا۔ حرص و لالچ سے پیچھا چھڑانا ہوگا۔ کذب و فریب سے مُنہ موڑنا ہوگا۔ عیش و عشرت کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اور باطنی آنکھوں کو وا کرنا ہوگا ؎

ظاہرہ آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

کُھلی آنکھوں سے تو ایک خاص حد تک ہی دُنیا کی چیزوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ کچھ فاصلے سے آگے یہ آنکھیں دیکھنے سے معذور ہوتی ہیں۔ لیکن اگر باطن کی طرف ان کا رُخ کر دیا جائے تو۔ ع

بند کیں آنکھیں تو دیکھے سینکڑوں عالم نئے

خُوشی کے متعلق چند مغربی فلاسفروں اور مصنفوں نے نہایت قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ جو کہ ناظرین کے مطالعہ کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ امریکن مصنف مسٹر این ہاتھورن لکھتے ہیں۔ خوشی وُہ پرندہ ہے۔ کہ اگر اس کا تعاقب کرو۔ تو ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن اگر چُپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ تو شائد خود بخود اُتر کر تمہارے پاس آجائے۔

۲۔ فرانسیسی فلاسفر چارلس ڈے سکنڈٹ فوٹیکو لکھتے ہیں۔ کہ اگر تو انسان کی صرف اس قدر ہی خواہش ہو۔ کہ مَیں خوش رہوں۔ تب تو شائد پوری ہو بھی جائے لیکن اکثر آدمی دُوسرے لوگوں سے خوش تر ہونا چاہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی خوشی کا اندازہ غلط لگاتے ہیں۔

۳۔ فرانسیسی مصنف ڈکرڈے لا اوچے فو کالڈ لکھتے ہیں۔ کہ اہلِ دانش کی خوشی کے لئے تو معمولی چیزیں کافی ہوتی ہیں۔ لیکن خارج از عقل انسانوں کو کسی بھی چیز سے طمانیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ دُنیا کے زیادہ لوگ دُکھی رہتے ہیں۔ اور سُکھ یا خوشی کی تلاش میں ہی عمر گذار دیتے ہیں۔

۴۔ انگلستان کے پادری جان ٹلوٹ سن لکھتے ہیں۔ کہ انسان حصُولِ خوشی کے لئے ہزاروں تدبیریں کرتا ہے۔ لیکن جتنی تیزی سے وُہ تعاقب کرتا ہے اس سے زیادہ تیزی سے وُہ اُڑ کر آگے نکل جاتی ہے۔ دُور سے ہم کو ہر ایک چیز خوشی دینے والی محسُوس ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم اس کے نزدیک جانا چاہتے ہیں۔ تو یا تو ہم اُس تک پہنچ نہیں سکتے۔ یا اس کا اندازہ ہماری توقع کے خلاف نکلتا ہے۔ ہاں اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کہ ان دونو باتوں میں سے کون سی زیادہ مایُوس کُن ہے۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ ہم اُمیدیں بہت بڑی باندھتے ہیں۔ اور ایک مصیبت جس کا کہ خوف مُدتوں سے لگا رہے۔ زیادہ کلفت دیتی ہے۔ بمقابلہ اس کے جس میں ہم مبتلا ہوتے ہیں۔

۵۔ امریکہ کے مشہور متمول اور سخی مسٹر اینڈریو کارنیگی لکھتے ہیں۔ کہ خوشی کا راز تیاگ یعنی ترکِ خواہشات ہے۔ انگلستان کے ناولسٹ مسٹر ای۔ جی بلٹور لکھتے ہیں۔ کہ خوشی اور نیکی ایک دُوسرے پر انحصار رکھتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو دُنیاوی لحاظ سے بزرگترین آدمی ہوں۔ وُہ خوش ترین بھی ہوں۔ البتہ خوش ترین انسان ضرور اعلیٰ ترین ہوتے ہیں۔

۶۔ انگلستان کے شاعر مسٹر ایل۔ ای۔ لینڈن لکھتے ہیں۔ کہ عام طور پر جو انسان ہمیشہ کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے ہیں۔ اُنکو بہت کم کبیدہ خاطر پایا جاتا ہے۔

۷۔ انگلستان کے ناولسٹ جیمز پورٹر لکھتے ہیں۔ کہ خوشی ایک ایسی شعاع ہے کہ جو ہزاروں ہی دلوں میں گذرتی ہوئی بغیر کمی آنے کے ویسی کی ویسی رہتی ہے بلکہ وُہ شعاع جب ایک شیشے جیسے شفاف دل پر پڑتی ہے۔ تو اُس کی چمک دوبالا ہو جاتی ہے۔ لیکن وُہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک ہم کسی اور کو شریک خود نہ کر لیں۔ یعنی جب تک اَوروں کو بھی خوش نہ کریں۔

۸۔ خلیفہ عبدالرحیم نے لکھا ہے۔ کہ مَیں نے اپنے پچاس سالہ عہدِ سلطنت میں فتوحات بھی حاصل کی ہیں۔ رعایا بھی مجھ سے خوش رہی ہے۔ اور محبت کرتی رہی ہے۔ میرے دُشمن بھی مجھ سے خائف رہے ہیں۔ میرے دوستوں کو بھی میرا پاسِ ادب رہا ہے۔ زر و مال۔ جاہ و حشمت شان و شوکت میرے دروازے کے دربان رہے ہیں۔ غرضیکہ دُنیاوی کسی نعمت سے مَیں محرُوم نہیں رہا۔ لیکن باوجود اس کے جب مَیں نے ٹھنڈے دل سے اُن ایام کا شمار کیا ہے۔ کہ جس دن مجھے پاکیزہ

اور حقیقی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ تو اُن کی تعداد چودہ سے زیادہ نہیں نکلتی۔ اس لئے اے انسان تو موجودہ دُنیا پر اعتماد مت رکھ۔

ایک مہاتما نے لکھا ہے۔ کہ جو انسان خوش رہنا چاہتے ہیں۔ اُن کو زندگی کا مُفصلہ ذیل دستورالعمل بنانا چاہیئے۔ اُن کا فرمان ہے کہ وُہی انسان ہی حقیقی طور پر خوش رہ سکتا ہے۔ کہ جو ذیل کے اُصولوں پر کاربند ہو۔ یعنی

۱- سچائی سے محبت ہو۔

۲- سب سے پہلے شیطان اور اُس کے چیلوں کو منتشر کرے۔

۳- گُناہ کے خیال کو بھی دل میں جگہ نہ دے۔

۴- اپنی آتما یا رُوح کو باوجُود عیش و عشرت کے سامان مہیا ہونے کے پاکیزہ رکھے۔

۵- تنگدستی اور فراخ دستی ہر دو حالتوں میں راستی پر قائم رہے۔

۶- حرص و آز کے مادہ کو بڑھنے سے روکتا رہے۔

۷- اگر گُناہ کے لئے پھُولوں کی سیج پر بُلایا جائے تو اپنی ہمت سے بچے۔

۸- خواہ سر پر ننگی تلوار دھری ہو۔ اور سر قلم ہونے کا اندیشہ ہو۔ تاہم ایسی حالت میں بھی سچائی کو فروخت کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔

۹- سوائے بداعمالی کے کسی سے نہ شرمائے۔

۱۰- سوائے پرماتما کے کسی سے نہ ڈرے۔

۱۱- اپنی تعریف سے غرور میں نہ آئے۔ اور مذمت سے رنجیدہ خاطر نہ ہو۔

۱۲- ہر وقت دل آزاری اور ضرر رسانی کے خیالات کو چھوڑ کر ہر بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے تیار رہے۔

بس آپ پر واضح ہو گیا ہوگا۔ کہ

۱- خوشی قدرت کے اندر بھری پڑی ہے۔ لوگ اس کی تلاش بھی کرتے ہیں۔ لیکن بہت کم آدمیوں کو وُہ نصیب ہوتی ہے۔ کیونکہ وُہ درُست طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ غلط جگہ تلاش کرتے ہیں۔ خوشی کا چشمہ انسان کے اندر ہے۔ باہر نہیں۔ تلاش عام طور پر باہر کی جاتی ہے۔

۲- دُنیا کے زر و مال جاہ و حشمت اور عزت و بزُرگی کی خواہش میں خوشی نہیں ہے۔ خوشی چیزوں کے حاصل کرنے سے کبھی نہیں ملتی۔ ہاں اُن چیزوں کے چھوڑنے میں یا اپنے بھائیوں کو دے دینے میں ضرُور ہوتی ہے۔

۳- خوشی حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ انسان اپنے آپ کو دُوسروں کی خدمت میں دُوسروں کی بھلائی میں لگا دے۔ عبادتِ الٰہی سے بھی تبھی فیضیابی ہوتی ہے۔ کہ جب ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی۔ خدمت اور اُلفت کا جذبہ بھی کام کرے۔

۴- جو لوگ شریعتوں کے اختلاف کی وجہ سے یا ملکی تقسیم کی وجہ سے یا دیگر اسباب کے باعث انسانوں کے کسی بھی گروہ سے بُغض۔ کینہ۔ حسد یا تعصب رکھتے ہوئے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ یا اُنکی دِل آزاری کے درپے رہتے ہیں۔ یا ان پر جفا روا رکھتے ہیں۔ اُن سے خوشی کوسوں دُور رہتی ہے۔

خوشی حاصل کرنے کا یقینی۔ آزمُودہ۔ مجرّب اور فوری کارگر ہونیوالا نُسخہ عرض کیا جاتا ہے۔ جو صاحب اس کا استعمال فرمائینگے۔ بلا شُبہ اُن کے رنج و غم۔ افسُردگی و ملال کے امراض رفع ہو کر راحت و خوشی۔ مسرت و شادابی حاصل ہوں گی۔

انسانیت	اُلفت	ہمدردی	نیکی	خوش اخلاقی	
۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	

روا داری۔	خوش کلامی	خدمت	قناعت
۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ	۵ تولہ

ان سب چیزوں کو ہموزن لے کر خدا ترسی کے اُوکھل میں باریک کریں۔ پھر میل ملاپ کے پانی میں حل کریں۔ ایثار اور نفس کشی کے چوٗلھے پر چڑھا کر دردِ دل کی آگ سے جوش دیویں۔ پھر اُتار کر صادق دلی کے کپڑے میں چھان لیں۔ اور نیک دلی کی مصری ملا کر حقوق ہمسائیگی کے پیالہ میں ڈال کر پی لیں۔ پھر مصالحت کے بستر پر ذرا آرام کریں۔

خوراک۔ نکوکاری۔ بھلائی۔ پاکیزگی۔ انصاف۔ راستی۔

پرہیز۔ بدخیالی۔ نفرت۔ غیریت۔ بُغض۔ حسد۔ حقارت۔ کینہ۔ تعصب۔ تنگ نظری۔ دِل آزاری۔ دھوکہ۔ ریا۔ فریب۔ جھوٹ۔ شر۔ فساد۔ ظلم۔

آزمائش شرط ہے۔ بفضلہ فائدہ یقینی ہوگا۔

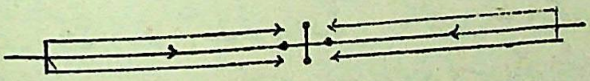

اِنسان اَور اُس کی تقدیر

مُختار بھی مجبُور بھی کاموں میں بشر ہے
اس سے یہ سزا وارِ جزا ہے بھی نہیں بھی

یہ ایک بڑا نازک اور اہم مسئلہ ہے۔ اور اس پر میرے جیسے معمولی لیاقت کے آدمی کے لئے بحث کرنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن چُونکہ یہ مسئلہ انسان کی زندگی پر ایک بڑا بھاری اثر رکھتا ہے۔ اس لئے چندے اس موضوع پر لکھنے کا حوصلہ کرتا ہُوں۔ اور مالکِ کُل سے دست بدعا ہُوں۔ کہ وہ مجھے اس میں کامیابی بخشیں۔

یہ مسئلہ ہمیشہ سے ہی زیرِ بحث رہا ہے۔ مذہبی کتب میں بھی اور اخلاقی کتب میں بھی اس کے متعلق متضاد خیالات پائے جاتے ہیں۔ اور انسان بڑی پریشانی میں پڑ جاتا ہے۔ کہ وہ کونسے خیالات کی پیروی کرے۔ اور کن خیالات کے متعلق اپنا طرزِ عمل بنائے۔ کیونکہ ایک طرف تو اس کو لکھا ہُوا ملتا ہے۔ کہ مالکِ کُل کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اور جو کچھ تقدیر میں بدا ہے وُہی ہو کر رہیگا۔ اور دُوسری طرف یہ ہدایت ملتی ہے۔ کہ انسان اپنی ہمت اور تدبیر سے جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے مثلاً:۔

۱۔ ایک طرف تو اتھرو وید میں (۷۔۵۰۔۸) یہ لکھا ہے۔ کہ اگر ہمت میرے داہنے ہاتھ میں ہو۔ تو کامیابی میرے بائیں ہاتھ میں حاضر ہو جائیگی۔ دُوسری طرف اُسی وید (۹۔۱۰۔۱۵) میں لکھا ہے۔ کہ اے میرے مالک! میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں اپنے

متعلق بھی کچھ نہیں جانتا - آپ کی کرپا سے ہی میں کچھ حاصل کر سکتا ہوں۔

۲- بالمیک رامائن کے ایودھیا کانڈ میں لکھا ملتا ہے۔ کہ جب رام کو جنگل میں جانے کا حکم ہوا - تو وہ بخوشی اس کو قبول کر کے اپنے چھوٹے بھائی لچھمن سے یوں کہنے لگے :-

" اے لچھمن سلطنت کے نہ ملنے اور جلاوطنی کے لئے قسمت ہی ذمہ دار ہے اگر میری قسمت ایسی نہ ہوتی - تو کس طرح سے کیکئی ماتا کو یہ خیال آسکتا تھا کیا کوئی انسان اپنی قسمت سے لڑ سکتا ہے؟ رنج و خوشی - نفع و نقصان خوف و غضب - پیدائش اور موت وغیرہ جو کچھ ہوتا ہے - وہ قسمت سے ہی ہوتا ہے جو کچھ انسان کو اتفاق سے یا بغیر کوشش کئے ملتا ہے - یا بغیر ارادے کے ملتا ہے - وہ بھی قسمت سے ہی ملتا ہے "

یہ الفاظ سُن کر لچھمن جواب دیتا ہے :-

" اے بہادر رام قسمت کے متعلق ایسے الفاظ جو آپ نے کہے ہیں - سوائے اس آدمی کے اور کون کہہ سکتا ہے - کہ جس کا دماغ چکرا گیا ہو - تم قسمت کی کیوں اتنی بڑائی کر رہے ہو - کہ جو ایک نکمی بے طاقت اور ہیجڑوں کی سی چیز ہے - قسمت قسمت وہی لوگ پکارتے ہیں کہ جو نامرد، نکمے اور بزدل ہوتے ہیں "-

۳- پھر گیتا میں ایک جگہ تو اٹھارویں ادھیائے میں لکھا ہے - کہ سارے ارض و سما کا مالک قلب کے اندر بیٹھا ہوا سارے انسانوں کو اپنی مایا سے ایسا گھماتا ہے - جیسے کوئی آدمی کسی کلدار چیز پر بیٹھا ہو - اور دوسری جگہ دوسرے ادھیائے میں کہا ہے کہ جب ارجن نے یہ دیکھ کر کہ لڑائی میں اسکے سب نزدیکی رشتہ دار ہی طرفین میں موجود ہیں - لڑائی کرنے سے انکار کر دیا -

تو بھگوان کرشن نے اس کو کہا کہ تو ہیجڑا پن کے خیالات کو چھوڑ کر اُٹھ۔ اور جنگ کر۔ اور تیسرے ادھیائے میں لکھا ہے۔ کہ اپنا کام ضرور کرنا چاہیئے۔ ورنہ تو اپنا جسم بھی قائم نہیں رہ سکتا۔

۴۔ پھر قرآن شریف میں ایک جگہ تو سورتِ توبہ کے رکوع ۷ میں آتا ہے۔ کہ ہم کو سوائے اس کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے۔ سورتِ آل عمران کے رکوع ۳ میں لکھا ہے۔ کہ وہ مالک جس کو چاہے دے جس سے چاہے لے لے۔ جس کو چاہے عزت دے۔ اور جس کو چاہے ذلت دے۔ سورۂ یونس کے رکوع ۵ میں لکھا ہے۔ کہ میرا نفع یا نقصان میرے ہاتھ میں نہیں ہے مالک کے ہاتھ میں ہے۔ دوسری طرف سورتِ نجم کے رکوع ۳ میں لکھا ہے۔ کہ انسان کو اپنی کوشش کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سورتِ نساء کے رکوع ۱۳ میں لکھا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ گھر میں بیٹھنے والوں کے مقابلہ میں محنت کرنے والوں کو اجرِ عظیم بخشتا ہے۔

۵۔ اسی طرح سے احادیث میں ایک موقعہ پر تو یہ لکھا ہے۔ کہ ایسا مت کہو۔ کہ اگر میں یہ کر لیتا تو ایسا ہو جاتا۔ اگر مگر کہنا خیالِ شیطانی ہے۔ اور دوسری جگہ لکھا ہے۔ کہ جو انسان اپنے ہاتھ سے کام نہیں کرتا۔ وہ گویا شیطان کو اپنے پاس بلاتا ہے۔

۶۔ گرنتھ صاحب میں محلہ ۳ وار سری راگ میں لکھا ہے۔ کہ جو قسمت میں لکھا ہوا ہے۔ اُس کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ رام کلی اونکار میں لکھا ہے۔ کہ جو مالکِ ازلی نے قسمت میں لکھ دیا ہے۔ اس کو کوئی ردّ نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلہ میں آسا چھنت محلہ ۵ میں لکھا ہے۔ کہ کوشش کرو۔ کوشش سے ہی سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

۷- ایک طرف کبیر صاحب لکھتے ہیں ؎

کرم کریما لکھ رہا اب کچھ لکھا نہ ہوئے
ماسا گھٹے نہ تِل بڑھے جو سر پھوڑے کوئے

دُوسری طرف پنچ تنتر میں لکھا ملتا ہے۔ کہ اپنی کوشش سے ہی انسان کو زرومال حاصل ہو سکتا ہے۔ قسمت قسمت کی رٹ ڈرپوک انسان ہی لگاتے ہیں۔

۸- انجیلِ مقدس کی کتابِ متی کے باب ۶ آئت نمبر ۲۵-۲۶-۳۴ میں لکھا ہے۔ کہ میں تم کو کہتا ہوں۔ کہ اپنی زندگی کا کچھ خیال نہ رکھو۔ کہ تم کیا کھاؤ گے کیا پیو گے اور نہ ہی اپنے جسم کا خیال رکھو۔ کہ تم کیا پہنو گے۔ دیکھو ہوا میں اُڑنے والے پرندے نہ کچھ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں۔ نہ فصل برداشت کرتے ہیں۔ تاہم تمہارا آسمانی باپ اُن کے لئے کھانا مہیا کرتا ہے۔ اس لئے کل کا خیال مت کرو۔ کیونکہ کل اپنا خیال آپ ہی کریگا۔ دُوسری طرف اُسی انجیلِ مقدس کی کتابِ امثال کے باب ۱۳ آئت ۴ میں مرقوم ہے۔ کہ کاہل آدمیوں کے دل میں خواہشات ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن ہمت والوں کی خواہشات پوری کی جاتی ہیں۔ پھر کتابِ متی کے باب ۷ آئت ۷-۸ میں لکھا ہے۔ کہ مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم کو مِل جائیگا کھٹکھٹاؤ تو دروازہ کھُل جائیگا۔ کیونکہ جو کوئی بھی مانگتا ہے۔ وُہ پا لیتا ہے۔ اور جو کوئی ڈھونڈھتا ہے اُسے ملتا ہے۔ اور جو کھٹکھٹاتا ہے اُس کے لئے ہی کھول دیا جاتا ہے۔

۹- ایک طرف شیکسپیئر نے لکھا ہے۔ کہ ایک طاقت ہے۔ جو ہمارے انجام بناتی ہے۔ اسکے برخلاف دُوسری طرف جرمن فلاسفر ایپی کورس لکھتا ہے کہ قسمت میں

یقین رکھنے سے بڑھکر کوئی غلامی نہیں ہے۔ امریکن پادری ٹی ٹی مونگر کہتا ہے کہ بدقسمتی کا لفظ انہی لوگوں کے مُنہ سے سُنا جاتا ہے۔ کہ جو نکمّے رہکر کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں انگلستان کا مشہور مضمون نویس جے ایڈیسن لکھتا ہے۔ کہ بدقسمتی جاہل انسانوں کے حِصّے میں آتی ہے۔

۱۔ مشہور شعرا نے ایک طرف تو قسمت کے متعلق خیالاتِ ذیل کا اظہار کیا ہے ؎

کبھی ہوتا نہیں کوشش سے خلافِ تقدیر
ساری تدبیروں کو کرتی ہے یہ قسمت برباد (انجم)

بگڑی ہوئی قسمت کو بنایا نہیں جاتا
ہاتھوں کی لکیروں کو مٹایا نہیں جاتا (برزم)

مُقدّر جب بُرا ہو کچھ کسی سے ہو نہیں سکتا
مثل سچ ہے کہ "کچھ بھی آدمی سے ہو نہیں سکتا" (حسرت)

کچھ بنائے نہیں بنتی جو بگڑتا ہے نصیب
چارہ گر ہو جو مسیحا بھی تو کیا ہوتا ہے (حفیظ)

کیا فائدہ سر لاکھ زمین پر رگڑے کوئی
پیشانی کا لکھا کبھی زائل نہیں ہوتا (تاثب)

رزقِ مقسوم ہی ملے گا اُسے
کوئی دُنیا میں دوڑے یا رینگے (اکبر)

نہیں جاتا کسی سے وُہ مرض ہے جو نصیبوں کا
نہ قائل ہُوں دوا کا میں نہ قائل ہُوں طبیبوں کا (ظفر)

نے مال سے نہ زر سے نہ تدبیر سے چمکے
چمکے اگر اقبال تو تقدیر سے چمکے (ظفر)

نہ مٹے گا وُہ سمجھ لے اُسے پتھر کی لکیر
جو لکھا کاتبِ تقدیر نے پیشانی پر (رند)

دخل کب تدبیر کو تقدیرِ انسانی میں ہے
پیش آتی ہے وہی جو کچھ کہ پیشانی میں ہے (امیر)

جو لکھا تھا مری تقدیر میں رزق اُس سے زیادہ
گردش و کوشش و تدبیر سے حاصل نہ ہوا (فصاحت)

اور دوسری طرف تدبیر کے متعلق خیالاتِ ذیل کا اظہار فرمایا ہے ۔

محنت ہی کے پھل ہیں یہاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں

مُوسےٰ کو ملی نہ قوم کی چوپائی
جبتک نہ چرائیں بکریاں مَدین میں (حالی)

خُدا ملتا نہیں یا وُہ بُت اپنا ہو نہیں سکتا
جو انسان کرنے پہ آئے تو پھر کیا ہو نہیں سکتا (اختر)

وُہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا
ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا

دولت کی جو خواہش ہے تمہیں ہشیار رہو غفلت سے بچو
ہر جاگنے والا پاتا ہے ہر سونے والا کھوتا ہے (بلغ)

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

مل نہیں سکتی نکموں کو زمانے میں مُراد
کامیابی کی جو خواہش ہو تو محنت چاہیئے

مال ملنے کا اک بہانہ ہے
سچ ہے محنت ہی خود خزانہ ہے

او ننگِ اعتبار دُعا پر نہ رکھ مدار
او بیوقوف ہمتِ مردانہ چاہیئے (حفیظ)

موج سے دست و گریباں ہو تہہِ دریا میں ڈھونڈ
گوہرِ مقصود تو دامانِ ساحل میں نہیں (رند)

خُدا نے وسعتِ دامانِ ہمت کی عطا جسکو
نہیں ہونیکا ہرگز تنگ دل وُہ تنگدستی میں

نہ شاخِ گُل ہی اُونچی ہے نہ دیوارِ چمن بُلبُل
تری ہمّت کی کوتاہی تری ہمّت کی پستی ہے (امیر)

پہنچے اُس بُت کے نہ در تک یہ ہے ہمّت کا قصُور
ورنہ چاہے جو بشر عرش پہ قابو ہو جائے (برق)

پست ہمّت روتے رہتے ہیں سدا تقدیر کو
صاحب ہمّت ہمیشہ کرتے ہیں تدبیر کو (راضی)

قسمت کا گلہ۔ فلک کا شکوہ کب تک غیبی امداد کی تمنّا کب تک
جس ہاتھ سے کر سکتے ہو سب کچھ ضامن
اس ہاتھ کو سر پر رکھ کر رونا کب تک (ضامن)

مَیں کہتا تھا انسان کی اگر تقدیر نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہمّت بڑھکے بول اُٹھی تدبیر نہیں تو کچھ بھی نہیں (طالب بنارسی)

ان متضاد خیالات کو پڑھ کر معمُولی انسان کے لئے اپنی زندگی کا پروگرام بنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف تو اُس کو بتلایا جاتا ہے۔ کہ وُہ بے بس ہے اور اس لئے اپنی تقدیر سے یا مالکِ کُل کی مرضی سے ایک قدم بھی پرے نہیں جا سکتا۔ اور دُوسری طرف کہا جاتا ہے۔ کہ وُہ ہمّت و تدبّر سے پہاڑوں کو توڑ سکتا ہے اور سمندروں کو پھاڑ سکتا ہے۔ جب انسان مشاہدہ کو لیتا ہے تب بھی اس کو متضاد ہی حالات دُنیا میں ملتے ہیں۔ بعض جگہ دیکھتا ہے۔ کہ کئی لوگوں کو گھر بیٹھے بٹھائے لاکھوں روپے ہاتھ لگتے ہیں۔ جس طرف وُہ ہاتھ اُٹھاتے ہیں۔ اسی طرف دولت کی دیوی اُن کی طرف دوڑی ہوئی آتی ہے۔ باوجُود کوئی خاص محنت نہ کرنے کے اور نہ کوئی خاص عقل رکھنے کے اُن کے مقبوضات بے اندازہ ہیں۔ بڑی بڑی عقل والے اور بڑے بڑے

دِل گُردہ والے اُن کا پانی بھرتے ہیں۔ اور اُن کے مُنہ سے نکلنے والے لفظوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ تو اُن کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے ؎

اگر روزی بدانش برفزودے
زناداں تنگ تر روزی نبُودے

بہ ناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

ترجمہ:۔ اگر رزق عقل کے مطابق کم وبیش ہوتا۔ تو بیوقُوف آدمی سے بڑھ کر کوئی رزق سے تنگ نہ ہوتا۔ لیکن وُہ مالکِ کُل بیوقُوف آدمی کو بھی اس طرح سے رزق پہنچاتا ہے۔ کہ عقلمند انسان اس میں حیران رہ جاتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھتے ہیں۔ کہ بعض انسان بڑے عقلمند۔ بڑے ہنرور۔ عالِم اور بڑی محنت کے خُوگر ہوتے ہیں۔ وُہ جگہ جگہ اپنی خوش حالی کے لئے سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ علم وعقل بھی خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجُود بھی ان کی حالت کولھُو کے بیل کی سی ہوتی ہے۔ ساری دَوڑ دھوپ کے بعد وہیں کے وہیں رہتے ہیں۔ اور اُن کو کہنا پڑتا ہے کہ ؎

کھینچے، چلّائے، کُودے، اُچھلے، ٹہلے
ہر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے (اکبرؔ)

ان ہر دو قسم کی مثالوں کو دیکھ کر ان کو ماننا پڑتا ہے۔ کہ قسمت کوئی چیز ہے۔ اور انسان کا یہ کہنا کہ ہمّت سے وُہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ راست نہیں ہے۔ اُنہیں آخر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ؎

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبرؔ
انسان کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز (اکبرؔ)

دُنیا کے اندر وُہ دیکھتے ہیں کہ ایک معمولی لکھا پڑھا انسان ایک تجارتی منڈی میں آتا ہے۔ بات کرنیکا اُس کو شعُور نہیں۔ اخلاق وُہ جانتا نہیں کس

پرندے کا نام ہے۔ بات کرتے وقت مُنہ سے تھُوک اور رال ٹپکتے ہیں۔ لیکن لوگ سیٹھ جی سیٹھ جی کہتے اُس کو تھکتے نہیں۔ اُس کے گرد و پیش ہر وقت جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ اور جو جو وہ سودا کرتا جاتا ہے۔ صرف زبان ہلاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کو ہرگز حرکت نہیں دیتا۔ چند گھنٹے وہاں ٹھہرتا ہے۔ اور ہزاروں روپے کما کر اگلی تجارتی منڈی کو روانہ ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک بڑا عالم و ودوان شخص آتا ہے۔ اُس نے تحصیلِ علم کے لئے اپنی عُمر کا کافی حصہ لگایا ہے۔ اخلاق کا پُتلا ہے۔ بات کرتا ہے تو مُنہ سے پھُول جھڑتے ہیں۔ ایک ایک لفظ کے اندر متانت اور حکمت بھری ہوئی ہے۔ وُہ اپنے علم کا اپنی محنت سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کو بڑی مشکل سے پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہوتا ہے۔ اور وُہ بھی دُوسروں کی مرضی کے مطابق۔ ان متضاد حالات کو دیکھ کر مجبوراً مُنہ سے نکل جاتا ہے کہ

ہوئے گر صاحبِ تدبیر و خوش تحریر کیا حاصل
وُہ پیش آئے گا پیشانی میں جو لکھا ہوُا ہوگا (ظفر)

پاس کھڑے ہوئے ایسے انسانوں کو کہتے ہیں

غافلو کرتے ہو تم فکر کی تدبیر عبث
فکر و تقدیر سے ہے چارۂ تدبیر عبث (ظفر)

اور صاحبِ تقدیر آدمی اُن کو تگ و دَو اور محنت و کاوش میں لگے ہوئے دیکھ کر کہتے ہیں

بوئے تقدیر کے سایہ میں وُہ تدبیر والوں کو
یہ کہتے ہیں کہ چھپر پر تم اس تدبیر کو رکھ دو

پھر ایسی بھی مثالیں ملتی ہیں۔ کہ وُہی انسان جس کے مُنہ کا لفظ زرد

مال کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ جو کہ جہاں بھی ہاتھ ڈالتا تھا۔ سوائے سیم و زر کے کسی اور چیز پر پڑتا ہی نہیں تھا۔ دولت اس کی آنکھ کے اشاروں پر ناچتی تھی۔ ایک دن آتا ہے۔ کہ وُہی شخص ہوتا ہے۔ وہی اس کا نفذ ہوتا ہے۔ لیکن جہاں ہاتھ ڈالتا ہے۔ مٹی پر پڑتا ہے۔ نہ صرف اپنی بلکہ باپ دادا کی کمائی بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اور دانے دانے کو ترسنے لگ جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار مُنہ سے نکلتا ہے ؎

کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وُہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے (چکبست)

ان بچاروں کا پھر کیا حال ہو جاتا ہے ؎

یُوں نہ انسان کوئی برگشتہ مقدر ہو جائے
مَیں اگر پھُول اُٹھاؤں تو وُہ پتھر ہو جائے

پھر ایسے شخص بچارے وُہی پورانی تدبیریں عمل میں لاتے ہیں۔ اُنہی منڈیوں میں جاتے ہیں۔ وُہی سودے کرتے ہیں۔ اُنہی لوگوں کے ساتھ بیوپار کرتے ہیں لیکن کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور آخر کہتے ہیں ؎

تدبیر سے قسمت کی بُرائی نہیں جاتی
بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی (داغ)

اُن کی حالت اور بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ جن اشیاء کا سودا اُن کے وارے نیارے کرتا تھا۔ جو اُن کے سودے مٹی کو بھی سونا بنا دیتے تھے اب کچھ کارگر نہیں ہوتے۔ ؎

بیمار کی قضا ہو تو اکسیر کیا کرے
تقدیر جب بُری ہو تو تدبیر کیا کرے

پھر وہ گڑگڑاتے ہیں۔ روتے ہیں۔ آہ و پکار کرتے ہیں۔ کہ شائد اس طریق سے ہی کچھ حالات سدھر جائیں۔ ان کا رونا دھونا ہی شائد سنبھالنے کا باعث بن جائے۔ انکی چیخ و پکار سے متاثر ہو کر شاید زمانہ ان کی امداد کے لئے پھر تیار ہو جائے۔ لیکن ؎

رونے سے بھی مٹا نہ لکھا سرنوشت کا
ہم اشک سے بھی اپنے نوشتے کو دھو چکے

بعض دفعہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ حالات میں کچھ بہتری آرہی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ جو چارہ اس وقت کیا گیا ہے۔ وہ کاری ثابت ہوا ہے۔ وہ اپنی تدبیر کو اسی پیمانہ سے اُسی طریقے سے اُسی احتیاط سے اُسی انداز سے جاری رکھتے ہیں۔ لیکن پانسہ پھر الٹ جاتا ہے۔ اور تین کانے پڑتے ہیں۔ اور وہ بچارے یہ کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں کہ ؎

کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے اکثر اے تاج
کون کم بخت ہے جو قائلِ تقدیر نہیں (تاج)

اور وہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ ؎

گردش جو ہو تقدیر میں کچھ سعی کام آتی نہیں
منزل کچھ آگے بڑھ گئی پہنچا جو میں منزل کے پاس (امیر)

یہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ بعض کام بڑے غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد بہت آدمیوں کا مشورہ لے کر سابقہ تجربوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے حالاتِ حاضرہ کا لحاظ کرتے ہوئے بڑی چھان بین اور تجسس کے بعد شروع کئے جاتے ہیں۔ اور کامیابی کی سو فیصدی اُمید ہوتی ہے۔ ایک فیصدی بھی شک نہیں ہوتا۔ لیکن باوجود ان ساری باتوں کے چاروں شانے چت گرنا پڑتا ہے۔

اور کامیابی کی ایک منزل بھی طے نہیں ہوتی۔ تو کہنا پڑتا ہے ؎

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو ہو گا ہی
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

ان سب حالات کو دیکھ کر انسان کو اسکے سوائے اور کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ تقدیر کا قائل ہو۔ اس کو اس مسئلہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اور قسمت کے اصول کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ اسے ماننا پڑتا ہے۔ کہ انسان ازخود اپنے لئے موافق و ناموافق حالات پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ کوئی اور چیز ہے جو اس کے لئے اچھا اور برا وقت لاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مجبور اور بے بس محسوس کرتا ہے۔ اور کہتا ہے ؎

نیک و بدِ زمانہ نہیں اختیار میں
ہوتا وہی سرور ہے جو سرنوشت ہو (سرور)

اگر یہی حالات ہر جگہ مشاہدہ و تجربہ میں آئیں۔ تو انسان قسمت کا شاکر ہو کر بیٹھ جائے۔ صبر و قناعت کو اختیار کرے۔ مفت کی دوڑ دھوپ میں لگ کر اپنی جان کو نہ کھپائے۔ رنج دکھ سہہ کر ناکامی کا منہ دیکھ کر مایوس نہ ہو آرزو کو بڑھا کر حسرت و ناکامی کا سامنا نہ ہو۔ اور یہ کہہ کر بیٹھ رہے کہ ؎

ہے جو قسمت میں وہی ہوگا نہ کچھ کم نہ سوا
آرزو کہتے ہیں کس چیز کو حسرت کیسی ؟ (اکبر)

لیکن اس دنیا میں برخلاف اس کے ایسے واقعات بھی انسان کو اپنی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ اور وہ اپنے مشاہدہ سے بھی دیکھتا ہے۔ کہ کاہل لوگ مصیبتوں کا شکار رہتے ہیں۔ سست اور بیکار قومیں پاؤں کے نیچے روندی جارہی ہیں۔ تساہل نے ان کو غارت کر دیا ہے۔ نکماپن نے ان کو ہیجڑہ بنا دیا

ہے۔ وہ ہر بات میں دُوسروں کے دستِ نگر ہیں۔ پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا۔ دُوسری طرف جو انسان یا جو قومیں محنت کی خُوگر ہیں۔ دست و بازُو سے کام لیتی ہیں۔ ہمت و تدبیر کو عمل میں لاتی ہیں۔ جرأت اور حوصلہ سے بہرہ ور ہیں۔ وُہ حکمران ہیں عیش مناتی ہیں۔ قُدرت کی طاقتیں بھی اُن کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہیں جو انسان یا قومیں اپنے قوتِ بازُو سے بھروسہ رکھتی ہیں۔ اور محنت کے میدان میں عمل کی خُوگر ہوتی ہیں۔ وُہ دن دُونی رات چوگنی ترقی کرتی ہیں۔ اپنے مُلک کو خوشحال کرتی ہیں۔ دُوسری کاہل قوموں کو زیر کرتی ہیں۔ اُن کی شہرت کا دُنیا کے اندر ڈنکا بجتا ہے ؎

بجز سختی اُٹھائے نام ممکن ہے کہیں نکلے
تراشا جائے جب سو بار تب پتھر نگیں نکلے

اور بھی کہا ہے ؎

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہُوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہُوا

بغیر محنت کئے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ سمندر کے اندر بے اندازہ موتی اور گوہر موجود ہیں۔ لیکن کیا گھر بیٹھے ہی کبھی سمندر نے موتی پارسل کرا کے بھیجے ہیں۔ اسی لئے تو کہا ہے ؎

بے مشقت نہیں ہوتی کوئی راحت حاصل
غرقِ دریا ہُوا غواص تو گوہر پایا (اسیرؔ)

جن قوموں نے محنت کے میدان میں قدم مارا۔ جن شخصوں نے اپنے آرام کو چھوڑا۔ اور محنت اُٹھائی۔ راتوں جاگ کر اپنے پر کھانا پینا حرام کر دیا۔ اُنہوں نے دُنیا کے اندر نئی نئی ایجادیں کیں۔ جس سے نام پایا۔ دولت پائی

اَور مالک کی مخلوق کے لئے مُفید ثابت ہوئے۔ جنہوں نے محنت کی اُنھوں نے انجام کار آرام پایا ؎

محنت پہ ہی موقُوف ہے آسائشِ گیتی
کھوئی میری راحت راحت طلبی نے

یہ دُنیا ایک میدانِ کارزار ہے۔ اس میں ہر ایک فردِ بشر برسرِ پیکار ہے۔ جو لوگ مستقل مزاج اَور ثابت قدم رہ کر میدانِ عمل میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بلاشُبہ وُہی کامیابی کی دیوی کے درشن کرتے ہیں۔ وُہ بڑی بڑی مہمیں سَر کرتے ہیں۔ کیا اس شخص سے فتح کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ کہ جو حیز وار گھر کی چاردیواری میں دبک کر بیٹھ رہنا چاہتا ہے۔ ہرگز نہیں ؎

قدم رہتا ہے ثابت جنکا اس سختئے دوراں میں
بہادر ہی وُہی سر قلعۂ فولاد کرتے ہیں .. .. (آتش)

جن لوگوں کے پیشِ نظر اپنی منزلِ مقصُود ہوتی ہے۔ کیا وُہ بیٹھے بیٹھے اس منزلِ مقصُود تک پہنچ سکتے ہیں۔ حاشَا و کلّا۔ اُنہیں چلنا ہوگا۔ اگر پاؤں بھی تھک جائیں تو بھی چلنا ہوگا۔ منزلِ مقصُود تو فاصلہ طے کر کے ہی آئے گی۔ بلاشُبہ رستے میں کئی صعوبتیں۔ کئی زحمتیں۔ تکلیفیں اَور مُصیبتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ لیکن ذی ہمت انسان اپنا لکش[ۂ] اپنا مقصد سامنے رکھتے ہوئے اُن سے گھبراتے نہیں۔ کیونکہ وُہ جانتے ہیں۔ کہ وُہ گوہر جس کی وُہ تلاش میں ہیں۔ چوٹی پر پہنچ کر ملیگا۔ اَور اسکے بعد سب تکان سب تکلیف بھُول جائے گی۔ اپنی دِلی مُراد حاصل کرنے والے انسان محنت اَور کوشش کی تکالیف سے کبھی نہیں گھبراتے۔ پاؤں تھک جائیں تو کیا کرتے ہیں ؎

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش گُلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے (آتش)

ۂ منزلِ مقصُود

ایسے راسخ العزم انسانوں کو ناکامیابی بھی پس پا نہیں کر سکتی۔ ناکامیابی کو وُہ کامیابی کا پہلا زینہ جانتے ہیں۔ ناکامیابی جن خامیوں کی وجہ سے ہوئی اُن کو وُہ پُورا کرتے ہیں۔ اور پھر تازہ دم ہو کر کوشاں ہوتے ہیں۔ ناکامیابی نہ صرف اُن کو اُن کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ بلکہ وُہ اُن کو اَور بھی مستعد بناتی ہے ؎

گرے سو بار بھی بجلی اگر کشتِ تمنّا پر
جو ہمّت دار ہیں مایوس کب ہوتے ہیں حاصل سے

جب ناکامیابی ہوتی ہے۔ تو وُہ لوگ کیا کہتے ہیں ؎

گھبراؤ نہ سعی سے اَے دل کہ امتحان ہے
ناکامیاب ہوگا تو تُو کامیاب ہوگا

ناکامی سے اُن کے حوصلے پست نہیں ہوتے۔ اُن کی ہمّت کی کمر نہیں ٹوٹتی۔ کیونکہ وُہ جانتے ہیں ؎

صاحبِ ہمّت نہیں دبتا مصیبت سے کبھی
زور سے آندھی کے آتش کی بھڑک جاتی نہیں

ناکامیابی ہوتی کس کو ہے؟ کیا اس کو جو چوڑیاں پہن کر یا گھونگھٹ نکال کر گھر میں بیٹھا رہتا ہے؟ یا اُس کو کہ جسے میدانِ عمل میں اُترنے کا کبھی حوصلہ ہی نہیں ہوتا۔ اَور جس کا دل ہمیشہ خوف و ہراس سے دبا رہتا ہے؛ نہیں بالکل نہیں ؎

گرتے وُہی ہیں جو کہ ہوں میداں میں یکہ تاز
وُہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

پروردگارِ دو عالم بھی اُنہی لوگوں کا مدد ہوتا ہے۔ اُنہی لوگوں کی دستگیری

کرتا ہے۔ کہ جو خود ہمّت سے کام لیتے ہیں ؎

احباب سے میری التجا ہے اصحاب سے عرضِ مُدعا ہے
کچھ کرلو کہ عُمر بے وفا ہے ہمّت کا حمایتی خُدا ہے

کامیابی حاصل کرنے کے لئے۔ نام پیدا کرنے کے لئے۔ سامانِ راحت مہیا کرنے کے لئے تکلیف ضرور پیش آتی ہے۔ لیکن کیا کوئی پھول ہے[1]۔ جس کے نزدیک کوئی خار نہیں۔ انگریزی میں مثل ہے NO PAIN NO GAIN محنت تو کرنی ہی پڑتی ہے ؎

شہد کے واسطے زنبور نے کاٹا تو کھلا
نوش چاہے جو زمانہ میں تو بے نیش نہیں (آتش)

مثل مشہور ہے۔ کہ خدا انہی لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ جو اپنی آپ مدد کرتے ہیں۔ وُہ مالکِ کُل بھی ہمّت والوں کا ساتھ دیتا ہے۔ کاہلوں اور ناکاروں کو دیکھ کر وُہ خوش نہیں ہوتا۔ جو حوصلہ کرتے ہیں۔ اُن کے ارادوں میں پروردگار قوت دیتا ہے ؎

جو بڑھیگا حوصلہ اُس کا بڑھایا جائیگا
جو گریگا اُس کو ہستی سے مٹایا جائیگا

صاحب ہمّت لوگ جب اولوالعزمی سے مستقل مزاجی سے کسی کام کو شروع کرتے ہیں۔ تو وُہ پہلے سے ہی کامیابی کا یقین رکھ کر قدم اُٹھاتے ہیں۔ بزدلوں اور نکموں کی طرح وُہ گنتی میں نہیں پڑتے۔ ان کے سامنے اگر مگر اور شرط وجزا کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ ان کو خود اعتمادی ہوتی ہے۔ اپنے زورِ بازو پر اپنے استقلال پر پُورا پُورا بھروسہ ہوتا ہے۔ کام کو شروع کرنے کے وقت وہ یوں نعرہ زن ہوتے ہیں ؎

---

[1] بغیر رنج کے کوئی راحت نہیں۔

ثابت قدم ہوں تجھکو قسم ربِّ پاک کی   چیرونگا کوہ و دشت بیاباں ہلاؤنگا

ان کے یہ مصمّم ارادے بلا وجہ نہیں ہوتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ محنت اور شہرت۔ مشقّت اور دولت مترادف الفاظ ہیں۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

منحصر قوّتِ بازو پہ ہے دولت منڈی

دیکھ لو زور میں موجود ہے زر اے صاحب!

کوئی مثال دکھاؤ۔ کہ عمر کا ایک حصّہ پڑھائی میں خرچ کئے بغیر کوئی عالم ہو گیا ہو۔ یا بغیر محنت کئے کسی نے امتحان پاس کیا ہو۔ بغیر ہاتھ منہ ہلائے کسی نے کھانا کھایا ہو۔ بغیر قلم چلائے اور دماغ لڑائے کسی نے کتاب لکھی ہو۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ یہ باتیں اصولِ قدرت کے خلاف ہیں۔ کوئی شخص بغیر ہل چلانے۔ بیج بونے کے پیداوار برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر ہمّت اور تدبیر کے فلسفہ سے کس طرح کوئی منکر ہو سکتا ہے ؎

اگر ہو سکتا عالم میں حصولِ علم بے محنت

تو بس ساری کتابیں ایک جاہل دھوبی کا گدھا بن جاتا (شاہ ظفر)

نپولین بوناپارٹ جو ہمّت اور حوصلہ کا پتلا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ لفظ ناممکن بیوقوفوں کی لغت میں پایا جاتا ہے۔ ہمّت والے کے سامنے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ مشکل یا ناممکن وہی چیزیں ہیں۔ کہ جنکے لئے انسان خود اپنا حوصلہ پست کر بیٹھتا ہے ورنہ ؎

وہ کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا

ہمّت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا

رانا پرتاپ کو جس وقت ہر طرف سے مصیبت نے آ گھیرا۔ اور وہ بہت گھبراہٹ کی حالت میں تھا۔ تو اس نے سامنے دیوار پر دیکھا کہ ایک چیونٹی اپنے ننھے سے منہ میں ایک دانہ لیکر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی

ہے۔ تھوڑی دُور جاتی ہے۔ تو پھر گر جاتی ہے۔ اُس نے کئی بار کوشش کی۔ لیکن ہر بار ہی زمین پر آ گرہی۔ تاہم اُس نے اپنے ارادہ کو پست نہ کیا۔ اور بار بار دانہ مُنہ میں اُٹھا کر اپنی منزل پر چلتی رہی۔ آخر کار وُہ کامیاب ہو گئی اور دانہ کو لیکر دیوار کے سرے پر جا پہنچی۔ اس چیونٹی کی ہمّت کو دیکھ رانا پرتاپ اُچھل پڑا۔ اور کہنے لگا۔ کہ جب ایک چیونٹی اپنے ارادے میں کوشش اور ہمّت کرنے سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ مَیں انسان ہو کر ناکامی سے گھبرا جاؤں یا مایُوس ہو جاؤں۔ چنانچہ اُس نے پھر اپنی رہی سہی افواج کو اکٹھا کیا۔ اور بڑے شد و مد سے حملہ کرنیکی طیاری کی۔ اور کچھ حد تک کامیابی بھی حاصل کی۔ ارجن جب جنگِ مہابھارت میں دل توڑ بیٹھا اور کہنے لگا کہ بہتر ہوگا کہ میرے مخالف مجھ کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیں۔ لیکن مَیں کسی پر ہاتھ صاف نہیں کرُونگا۔ وُہ ہمّت اور حوصلہ بالکل ہار بیٹھا۔ تب شری کرشن بھگوان نے گیتا کی رُوح افزا تعلیم سے اُس کے حوصلہ کو تازہ کیا۔ اس کی ہمّت بندھائی۔ اور اس کو مستعد کر کے میدانِ کارزار میں بھیجا۔ آخر فتح ارجن کی جانب کی ہوئی اس کی ہمّت اور حوصلے نے فریقِ مخالف کو پسپا کیا۔ اور زک دی۔

یہ دونو پہلُو تصویر کے آپ کے سامنے رکھے گئے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو کہا جاتا ہے۔ کہ انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں۔ وُہ اپنی مرضی سے نہ ایک قدم چل سکتا ہے۔ نہ کوئی کام کر سکتا ہے۔ اس لئے اس کی تگ و دو لاحاصل ہے اور قناعت و صبر و شکر سے کام لینا چاہیئے۔ دُوسری طرف بتایا جاتا ہے۔ کہ انسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کو بڑی قُدرت حاصل ہے۔ اس لئے اُسے ہر وقت بے صبری اور بے چینی سے میدانِ عمل میں دوڑ لگانی چاہیئے۔ ایک طرف تو ایسی نصیحت ملتی ہے۔

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے — خوب ملک روم ہے اور سرزمین روس ہے
اتنے میں عبرت پکاری اک تماشا میں تجھے — چل دکھاؤں تو کہ جو صید آز کا محبوس ہے
لے گئی اکبارگی گور غریباں کی طرف — جس جگہ جان تمنا ہر طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین بارہ دکھا کر لگی کہنے مجھے — یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھ تو ان سے کہ مال و ملکیت دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے پاس غیر از حسرت و افسوس ہے

دوسری طرف مشورہ ملتا ہے ؎

صبر و قناعت رنگ نحوست — صبر و قناعت زنگ سعادت
صبر و قناعت مخزن آفت — صبر و قناعت گنج عقوبت
صبر و قناعت خصم ترقی — صبر و قناعت باعث ذلت
بے صبری ہے مایۂ شادی — صبر و قناعت وجہ کلفت
بے صبری کا نام ترقی — نام قناعت ذلت و آفت
صبر و قناعت محکومی ہے — بے صبری شاہی و ریاست
صبر و قناعت طوق غلامی — بے صبری ہے تاج سیاست
مشرق میں افلاس و مصیبت — مغرب میں ہے دولت و راحت
وہ انعام بے صبری ہے — یہ ثمرات صبر و قناعت

بے صبری کی دیوی آؤ
بھاگو بھاگو صبر و قناعت (اظہر)

ان متضاد خیالات اور ہدایات و نصائح کو پڑھ کر انسان کے لئے اپنا لائحہ عمل بنانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک وقت جب وہ ایک طرف کے خیالات پڑھتا ہے۔ تو اس طرف کا جھکاؤ ہو جاتا ہے۔ اور صرف نام کے جینے اور ذکر

الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے تیاری کرتا ہے۔ پھر کسی اور جگہ دوسری طرف کے خیالات پڑھتا ہے۔ تو کمر ہمت باندھ کر دُنیا کے میدانِ کارزار میں آگے بڑھنے کا پروگرام بناتا ہے۔

اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ حقیقت کیا ہے۔ مَیں نے جیسے ابتداء میں عرض کیا۔ اس نازک اور اہم مسئلہ پر میرے جیسے کم لیاقت اور کم فہم آدمی کیلئے قلم چلانا ایک مشکل کام ہے۔ لیکن مذہبی و دیگر کُتب کے مطالعہ سے اور بزرگوں اور مہاتماؤں کے قدموں میں بیٹھ کر جو کچھ سمجھا ہے۔ وہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہُوں۔ اس کے بعد ناظرین خود ہر پہلو کو سوچ کر اپنے لئے فیصلہ کر سکتے ہیں۔

جو کچھ مَیں سمجھا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تقدیر بھی ایک اہم چیز ہے۔ اور تدبیر بھی ضروری شے ہے۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ جو لوگ ایک کو جھٹلاتے ہیں۔ اور دُوسری کو ہی سب کچھ کہتے ہیں۔ وہ یا تو اصلیت کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھتے۔ یا مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ بلکہ مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ تقدیر اور تدبیر دونوں ہی ایک چیز ہیں یہ ایک دُوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ اُن کو جدا جدا کرنا ناممکن ہے ان دونوں کی موجودگی کا انحصار ایک دُوسری پر ہے۔ ایک کے رہنے سے ہی سے ہی دُوسری کا وجود قائم رہ سکتا ہے۔ ایک اگر جسم ہے تو دوسری جان ایک اگر صفت ہے تو دُوسری موصوف۔ جیسے صفت اور موصوف ایک دُوسرے سے جُدا نہیں کئے جا سکتے۔ ایسے ہی تقدیر اور تدبیر بھی ایک دُوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ غلطی اور تکلیف اسی موقعہ پر ہوتی ہے کہ جہاں ایک سے بالکل انکار کیا جاتا ہے۔ اور دُوسری کو ہی سب کچھ کہا جاتا ہے۔ نری تقدیر پر ہی بھروسہ رکھنے والے بھی آرام نہیں پا سکتے۔ اور محض تدبیر کے موید بھی سچی راحت سے محروم رہتے ہیں۔ جو لوگ انسان کو بالکل بے بس اور بے کس کہتے ہیں۔ وہ

اُس قُدرت کو پسِ پشت ڈالتے ہیں۔ جو اس کو اس دُنیا کے میدانِ جنگ میں اپنے جوہر دکھانے کے لئے ملی ہوئی ہے۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان فعلِ مختار ہے۔ اور جو چاہے کر سکتا ہے۔ وُہ بھی اس کی طاقت کا اندازہ مبالغہ سے لگاتے ہیں۔ جو محض صبر و قناعت کی تلقین کر کے انسان کو ایک عضوِ معطل بنانا چاہتے ہیں۔ وُہ بھی دُرست رہبری نہیں کرتے اور جو ہر وقت بے صبری سے دوڑ دھوپ میں لگے رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ وہ بھی دُرست رہنمائی نہیں کرتے۔ انسان مجبُور بھی ہے اور مختار بھی۔ لیکن دونوں کا اندازہ اور دونوں کی حد ہے۔ پھر غلطی کہاں پڑتی ہے۔ غلطی اس کے حد باندھنے میں ہوتی ہے۔ کہ وہ حد کس موقعہ پر ہے۔ بعض لوگ اس حد کو بڑھاتے بڑھاتے یہ کہنے لگ جاتے ہیں کہ کوئی چیز انسان کے لئے ناممکن نہیں۔ اور بعض اس حد کو گھٹاتے گھٹاتے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ انسان کے ہاتھ میں ہی کچھ نہیں۔ وُہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر حد کا دُرست اندازہ سمجھ میں آجائے۔ تو یہ مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے۔

میں اس مسئلہ پر دو نقطہ ہائے نگاہ سے عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ ایک تو ان لوگوں کے خیال سے جو مسئلہ تناسخ کے قائل ہیں۔ اور دوسرے ان لوگوں کے خیال سے جو اس مسئلہ کے قائل نہیں ہیں۔ اوّل میں اُن لوگوں کے خیال سے لیتا ہُوں۔ جو مسئلہ تناسخ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں ایک مثال عرض کرتا ہُوں۔ ایک پھل دار پودا ہے۔ اس کا بیج ایک وقت بویا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد پانی دیگر اس کی گوڈی کر کے اس کی حفاظت کر کے اس میں کھاد ڈال کر اس کو بڑا کیا گیا۔ اور آخر اس میں میٹھے اور رس دار پھل آئے۔ اب میں یہ پُوچھنے کی جرأت کرتا ہُوں۔ کہ آیا ان پھلوں کے حاصل ہونے میں بیج کی زیادہ اہمیت ہے۔ یا اس کے بعد اس کوشش کی جو پانی وغیرہ دینے کی

شکل میں کی گئی۔ ان میں کون بڑا ہے۔ اگر بیج نہ بویا جاتا۔ تو کیا محض کوشش کچھ کام کر سکتی تھی۔ اور اگر صرف بیج بو دیا جاتا۔ لیکن پانی وغیرہ کچھ نہ دیا جاتا۔ اگر کھاد وغیرہ نہ ڈالی جاتی۔ اور کوئی محنت نہ کی جاتی۔ تو کیا پھر پھل حاصل ہو سکتے تھے۔ جیسے یہ دونو باتیں لازمی ہیں۔ ایسے ہی تقدیر و تدبیر دونو لازمی ہیں۔ تقدیر بیج ہے۔ تدبیر کوشش ہے۔ دونو مل کر ہی میٹھے پھل دے سکتے ہیں۔

ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک شخص دھتورے کے بیج بوتا ہے۔ کوشش بھی کرتا ہے۔ خوب پانی دیتا ہے۔ دن رات اُس پودے کو بڑھانے اور اس کی حفاظت کے سامان مہیا کرتا ہے۔ اور اپنی اس سر توڑ محنت اور از حد کوشش کے بڑے اعلیٰ ثمرات ملنے کی توقع کرتا ہے۔ اور اُسے خیال ہے۔ کہ نہایت میٹھے میٹھے آم لگیں گے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ ایسے ہی بغیر اچھی تقدیر کے نری کوششیں اور بے صبریاں کچھ نہیں کر سکتیں۔

ایک اور بھی مثال عرض کرتا ہوں۔ ایک شخص نہایت اعلیٰ قسم کے آموں کے پودے سہارنپور سے لا کر لگاتا ہے۔ لیکن لوگ اُسے ڈراتے ہیں کہ اس پودے میں زہریلے پھل لگیں گے۔ تو کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ ایسے ہی نیک اعمال کا پھل بُرا نہیں ہو سکتا۔

جیسے مَیں نے اوپر عرض کیا ہے۔ یہ بحث ان لوگوں کے غور کے لئے عرض کی جا رہی ہے۔ کہ جو مسئلہ تناسخ کو ماننے والے ہیں۔ تقدیر چیز کیا ہے۔ تقدیر ہے سابقہ اعمال کا پھل۔ اچھے یا بُرے جو بھی اعمال کئے جائیں۔ اُن کے مطابق تقدیر بنتی ہے۔ اور وہ بیج ہوتا ہے۔ اس کو پھلدار کرنے کے لئے کوشش اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اور مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ایک باغیچہ میں اچھے اچھے پھل لگے ہوئے تھے۔ اور وہاں ایک اندھا اور ایک لُنجا آدمی بیٹھے تھے۔ وہ دونو ہی پھل لینے سے قاصر تھے۔ کیونکہ ایک پھلوں کو دیکھتا تھا۔ اور اُن کی طرف اُٹھ کر نہیں جا سکتا تھا۔ دُوسرا جا سکتا تھا۔ لیکن ان کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ ہر دو نے باہم مشورت کی۔ اندھے نے لُنجے کو اپنے کندھوں پر اُٹھالیا۔ اب لُنجے نے اپنی آنکھوں سے اور اندھے کی ٹانگوں سے کام لے کر پھل توڑ لئے۔ اور دونوں نے کھائے۔ ایسے ہی تقدیر اندھی ہے اور تدبیر لُولی یہ دونو مل کر ہی انسان کے لئے خوشی اور راحت کا باعث بن سکتی ہیں۔

تقدیر کو ایک ذخیرہ سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ جو ایک شخص نے اکٹھا کیا ہے۔ اچھا یا بُرا۔ وُہ ذخیرہ موجود رہے گا۔ اس میں سے خرچ کرنا انسان کی کوشش اور سعی کے ماتحت ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کچھ محنت نہیں کرتا۔ تو اس کا ذخیرہ ویسے کا ویسا موجود رہیگا۔ یعنی تقدیر بنی رہے گی۔ لیکن وہ اس کا فائدہ اپنی جہالت سے نہیں اُٹھا سکیگا۔ یہاں پر سوال ہو سکتا ہے کہ کیا بُرے اعمال کئے ذخیرہ کا ثمر اُٹھانے کے لئے بھی سعی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کا جواب ہے کہ ہاں ہوتی ہے تو پھر سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کیوں؟ کیا کوئی شخص بُرے ثمر کو حاصل کرنے کیلئے خود کوشش کرے گا؟ یہ بات کچھ تشریح طلب ہے۔ سعی یا کوشش صرف ہاتھ سے ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ کلام اور خیال سے بھی ہوتی ہے۔ جو ریفارمر لوگ اپنے لیکچروں اور وعظوں اور اُپدیشوں کے ذریعہ خلقتِ خدا کو بد اعمال سے باز رہنے اور نیک اعمال میں لگنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی سعی کوئی کم نہیں ہے یا جو سائنیسدان یا فلاسفر اپنے خیالات کو لڑا کر نئے نئے مسئلے دریافت کرتے ہیں۔ ان کی محنت بھی کچھ کم درجہ کی نہیں ہوتی۔ اس لئے سعی کلام اور خیال سے بھی ہو سکتی ہے۔ دل کا خاصہ ہے۔ کہ وہ خالی نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کو کوئی نیک شغل نہ دیں۔ تو

وُہ ضرور بدخیالی کی طرف دوڑے گا۔ اور وُہ بدخیالی کی بدسعی ہو جائے گی۔ اس بدسعی کا تلخ ثمر اعمالِ بد کے ذخیرہ میں سے آ پہنچے گا۔ اِس طرح سے بُرے ذخیرہ کو پانے کے لئے سعی ہوتی ہے۔

تقدیر ان اعمال و خیالات کی بنتی ہے۔ جو دُوسروں کے متعلق کئے جائیں اگر وُہ بھلے ہیں۔ تو تقدیر بھی نیک بنے گی۔ اگر وُہ بُرے ہیں۔ تو تقدیر بھی بُری بنیگی۔ جس سعی کا اوروں سے تعلق نہیں ہوتا۔ اس کا تقدیر سے کچھ واسطہ نہیں مثلاً کھانا حاصل کرنے میں اگر کسی کا حق چھینا گیا ہے۔ یا کسی سے دھوکہ سے حاصل کیا گیا ہے تو اس سے تقدیر بنے گی لیکن جب کھانا کھانے کے لئے ہاتھ مُنہ ہلایا جائیگا تو اس سے تقدیر کا واسطہ نہیں ہوگا۔ اس لئے جو اعمال یا خیالات انسان کے ہوں۔ وہ ہمیشہ نیکی پر مبنی ہونے چاہئیں۔ تاکہ تقدیر نیک بنے۔ جس قدر نیکی سے کوئی انسان دُوسروں سے برتاؤ کریگا۔ اسی قدر اس کی تقدیر بھی اچھی بنے گی۔

سوال ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو بلا کسی سعی کے ہی دولت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ وہی خیالات کی سعی ہے۔ تقدیر تو ان لوگوں کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ نیک خیالات کی رَو جس وقت چل گئی اسی وقت وُہ تقدیر آشکارا ہو جاتی ہے۔

موجُودہ وقت میں جو تدابیر عمل میں لائی جاتی ہیں۔ اُن کا جہاں تک تعلق دُنیا کے دُوسرے انسانوں سے ہے۔ وُہ پچھلی تقدیر کو حاصل کراتی ہیں اور آئندہ کے لئے تقدیر کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ اس لئے جیسے پہلے اوپر عرض ہوا اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔ کہ وُہ جملہ تدابیر نیک خیالی پر مبنی ہوں۔ ہمیشہ یہ خیال دل کے اندر رہنا چاہئے ؎

کوئی دوستوں کو دل میں سمجھتا ہے اپنے غیر
کوئی دُشمنوں سے دل کا نکالے ہے اپنے بیر

کہتا ہے واں نظیر بھی ٹک دیکھ لو یہ سیر
یارب تو سب کی کیجیو برسا برس کی خیر (نظیر)

ایک اور بات بھی سمجھ لینے کے قابل ہے کہ تقدیر کس چیز کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ کیا وہ دولت اولاد اور دیگر مقبوضات کے ذخیرہ کا نام ہے؟ نہیں۔ اچھی یا بری تقدیر نام ہے دکھ اور سکھ کے ذخیرہ کا۔ کیونکہ یہ مشاہدہ کی بات ہے کہ بعض آدمیوں کو دولت اور اولاد سکھ دیتے ہیں۔ بعض کو دکھ۔ بعض لوگ پاس کچھ نہ ہونے سے بڑے دکھی رہتے ہیں۔ بعض اس میں راحت مانتے ہیں۔ بلکہ دے دلا کر خود فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

دولتِ دنیا سے آتش ہم نے جب پھیری نگاہ
جس طرف آنکھ اٹھی تو دے لگ گئے اکسیر کے (آتش)

اس لئے ایک آدمی کو صاحب زر وغیرہ دیکھ کر ہی یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ خوش قسمت ہے۔ ہاں اگر وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی نیک خیالی سے اس زر کا نیک فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یعنی اپنے لئے جائز طور پر خرچ کرتا ہے۔ اور دوسروں کی بھلائی کے لئے خرچ کرتا ہے۔ تو وہ ضرور خوش قسمت ہے۔

نیک خیالی اور نیک نیتی کا ایک اور فائدہ ہے۔ کہ وہ بری تقدیر کو جلدی آنے سے ٹال سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ تو مسلمہ امر ہے۔ کہ تقدیر کا پھل تدبیر سے ہی ملتا ہے۔ اچھا ہو یا برا۔ اس لئے جب بد خیالی اور بد اعمالی کی شکل میں بد تدبیر نہ کی جائے گی۔ تو قسمتِ بد وارد ہی نہ ہو گی۔

سوال ہو سکتا ہے کہ بعض نیک انسانوں کو بھی دکھ اور تکلیف ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔ اول تو یہ کہ جس حالت کو ظاہری نگاہ کا انسان دکھ کہتا ہے۔ اس کو خدا دوست اور پربھو بھگت

انسان دُکھ مانتا ہی نہیں۔ دُوسرے سونے سے کُندن بھٹی کے اندر تپایا جا کر ہی تیار ہوتا ہے۔ اس تکلیف سے حکیمِ مطلق کو اپنے بندوں کی بہتری مقصود ہوتی ہے۔ اور وُہ پریتم کے پیارے سمجھتے بھی ایسا ہی ہیں۔ بلکہ اس حالت میں خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس سے ایک تو دُکھ کا ذخیرۂ تقدیر جلدی جلدی ختم ہو جائیگا۔ دُوسرے اس سے راضی برضا ارادہ کی پختگی اور اعتقاد اور بھی زیادہ راسخ ہونگے۔

پس جو اُوپر عرض ہوا ہے۔ اس کا خُلاصہ یہی ہے کہ تقدیر ضرور ہوتی ہے۔ لیکن وُہ حاصل ہوتی ہے تدبیر سے اور وُہ تدبیر نیک خیالی پر مبنی ہونی چاہیئے۔

اب مَیں اس باریک مسئلہ پر اُن لوگوں کے نکتہ نگاہ سے التماس کرنا چاہتا ہوں کہ جو تناسخ کے قائل نہیں ہیں۔ وُہ مانتے ہیں کہ صرف یہی زندگی ہے اور اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد روزِ قیامت کو ہی وُہ لوگ اُٹھیں گے۔ روزِ قیامت کو تو وُہ اپنی اِس زندگی کے اعمال کا ثمر پائیں گے ہی۔ لیکن اس زندگی میں بھی جو اُن کو راحت و رنج ملتا ہے۔ وہ تقدیر کے مُطابق ہی حاصل ہوتا ہے۔

اِس مسئلہ کے علم کی جستجو میں بہت عرق ریزیاں ہوئیں۔ ہو رہی ہیں۔ اور ہونگی۔ اس گروہ کے لوگ بھی اکثر یک طرفہ ہی بحث کرتے ہیں بعض تو کہتے ہیں انسان مجبُور ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وُہ فعلِ مختار ہے۔ یہ خالق کے تصرفات کے قائل نہیں۔ وُہ اس بات سے بے فکر پائے گئے ہیں۔ کہ کوئی طاقت ہمارے افعال کی نگران ہے۔ اور جزا و سزا کی قُدرت اُس نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے وُہ اپنے آپ کو فعلِ مختار کہہ کر یہ سمجھتے ہیں کہ جو ہم چاہیں کر سکتے ہیں۔ کسی پر جس طرح چاہیں ظلم کر سکتے ہیں۔ ہم کسی کے جوابدہ نہیں۔ اور نہ ہم سے پُرسشِ اعمال ہونی ہے۔ دُوسری قسم کے لوگ جو انسان کو مجبُور خیال کرتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ ازل کے روز جو جس کی قسمت میں لکھا گیا۔ اب اس میں کمی بیشی ناممکن ہے۔

اس لئے کسی محنت یا کوشش کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی ہر ایک ناکامی اور محرومی کی وجہ بس تقدیر کو سمجھتے ہیں۔

اب ہم نے یہ غور کرنا ہے۔ کہ اصلیت کیا ہے۔ اس بات کو جاننے کیلئے اول تقدیر کے معنی سمجھنے چاہئیں۔ تقدیر کے معنی ہیں۔ وہ پیمانہ یا اندازہ یا قدرت یا طاقت یا قانون جو ہر ایک چیز کے لئے خالق نے بنایا ہے۔ مثلاً ایک کھجور کی گٹھلی کی تقدیر یہ ہے۔ کہ اُس کو بونے سے اس میں سے کھجور کا پیڑ ہی نکلے گا۔ انار یا آم کا پیڑ نہیں۔

اب دُنیا کے اندر ہر ایک چیز کو دو حالتوں میں سے ایک یا دونو خالق برتر کی طرف سے ملی ہیں۔ ایک حالت طبعی اور دوسری حالت ارادی طبعی حالت وہ ہے کہ جو اس کو قدرت کی طرف سے محدود بہ خواص مقررہ اس غرض کے لئے ملی ہے کہ وہ باقی اشیاء سے ممیز ہو سکے۔ اور حالتِ ارادی اس کا نام ہے۔ کہ جن کو وہ حالت عطا ہوئی ہے اس سے وہ اپنے اعضاء کو یا اپنے خیالات کو از خود کسی طرف لگا سکیں۔ بعض چیزوں کو صرف حالتِ طبعی ہی حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً پتھر وغیرہ ان کو حالتِ ارادی حاصل نہیں۔ اس لئے وہ کوئی فعل اپنے ارادہ سے نہیں کر سکتے۔ اور وہ اسی وجہ سے نہ تو مجرم ہو سکتے ہیں۔ نہ مکرم یعنی نہ مستوجب سزا نہ مستحقِ جزا۔ جن اشیاء کو جس حد تک حالتِ ارادی حاصل ہوتی ہے۔ اسی قدر اس کی جزا و سزا ان کے افعال سے منسوب ہو گی۔ اُس مولائے کریم نے جس قدر جن اشیاء کو حالتِ ارادی عطا فرمائی ہے۔ اسی قدر ان کو مدارج ترقی پہنچنے کے لئے علم و قدرت بھی بخشا ہے۔ مثلاً پتھر وغیرہ جمادی اشیاء کے اندر قوتِ ارادی تو بالکل نہیں ہے۔ نباتات کے اندر کچھ قدرت ارادی ہے یعنی وُہ اپنی خوراک کو زمین اور ہوا سے کھینچ سکتے ہیں۔ اور فضلات کو خارج کر سکتے

ہیں۔اس لئے اُن کی حالت ان کی خوش رنگی وغیرہ اچھی یا بُری خوراک کے تناسب سے بدل جاتی ہے۔ نباتات سے کچھ زیادہ حالتِ ارادی حیوانات کو حاصل ہے وُہ اپنی حالت کو تو بہتر نہیں بنا سکتے۔ اور نہ اپنے لئے نئی نئی ایجادیں کر سکتے ہیں۔ لیکن اپنی پرورش اور حفاظت کے لئے ذرائع ڈھونڈ سکتے ہیں۔جس حد تک وُہ اس بارہ میں کم یا زیادہ کوشش کریں گے۔ اُسی حد تک وُہ اپنے لئے زیادہ رنج و راحت حاصل کریں گے۔ جانوروں کے اندر بعض کو یہ زیادہ قدرت عطا ہوئی ہے۔ جیسے گھوڑے کو۔ اور بعض کو کم۔ جیسے گدھے کو۔ اس اندازہ کے مطابق ہی اُن سے سعی و محنت کی توقع کی جاتی ہے۔ مثلاً گھوڑے سے سرکس میں لڑائی میں۔ پولو کے کھیل میں کودنے پھاندنے وغیرہ میں تربیت دیکر کام لیا جاتا ہے۔ لیکن گدھے کی نسبت کبھی کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ کیونکہ گدھے کی حالتِ ارادی یا تقدیر گھوڑے کی نسبت بہت کم ہے۔

انسان کو سب سے بڑھکر اور بہت زیادہ مقدار میں حالتِ ارادی عطا ہوئی ہے۔ لیکن تاہم اس کے ساتھ بھی قید لگی ہوئی ہے۔ اور ایک حد باندھی ہوئی ہے۔ مثلاً انسان کوشش کر کے بھی ہوا کے بل نہیں دوڑ سکتا۔ کان سے نہیں دیکھ سکتا۔ آنکھوں سے نہیں کھا سکتا۔ خواہش رکھنے پر بھی اس زمین کو چھوڑ کر دوسری پر جا کر بود و باش نہیں کر سکتا۔ لیکن ہم کو خالقِ کریم نے عقل۔ قوت۔ آلاتِ قوت۔ اور وسائلِ استعمالِ قوت بخشے ہیں۔ تاکہ جو ہماری ضروریات ہیں۔ ان کو اچھے سے اچھا اور زیادہ سے زیادہ طیار کر کے اپنی حفاظت اور ترقی کریں۔ لیکن اس قوت کے استعمال کی ایک حد مقرر ہے۔ اس حد کے اندر رہتے ہوئے ہم ترقی کرنے میں فعل مختار ہیں۔ اور اس حد کو پار کرنے کی سعی کرنے میں ہم فعلِ مجبور ہیں۔ ایک فرقہ ہے۔ جو اس حد تک بھی محنت کرنا نہیں چاہتا۔ اور کاہلی اور ناکامی کا

نکار ہو کر بے شمار عقوبتیں سہتا ہے۔ دُوسرا گروہ ہے کہ جو اُس حد کو گذرنے کی کوشش کرتا ہُوا بے اندازہ مصیبتوں کا شکار ہوتا ہے۔

اوپر عرض ہوا ہے کہ دو قسم کی حالتیں ہیں۔ یعنی حالتِ طبعی یا فطری اور حالتِ ارادی یا عقلی۔ موخرالذکر طاقت جس قدر زیادہ جس حیوان یا انسان میں ہو گی۔ اُسی قدر اس کا زیادہ غلبہ کم ارادی طاقت والوں پر ہو گا۔ لیکن اس غلبہ کا بھی اندازہ مقرر ہے۔ کائنات کی ہر قسم کی طاقت اور حالت والی اشیاء کا آپس میں تعلق اور ارتباط ہے۔ اس تعلق کا بھی اندازہ مقرر ہے۔ اِن جملہ اندازوں کو قائم رکھنے کے لئے اور مقرر شدہ حقوق کی حفاظت کے لئے ایک اعلیٰ طاقت ہے۔ جس کو قدرت یا قدرتِ الٰہی کہہ سکتے ہیں۔ وُہ ان سب طاقتوں پر غالب ہے۔ اس قدرت کے مقررہ اصول ہیں۔ جو شئے ان اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے وسائلِ ترقی کو کام میں لائے گی۔ وُہ راحت پائے گی۔ اور جو شئے اس قدرت کے اصولوں کو توڑ کر قدرت کا ہی مقابلہ کرنے لگ جائے گی۔ وُہ رنج میں مبتلا ہو گی۔

عطیاتِ الٰہی بے اندازہ ہیں۔ اور ہر ایک شئے اُن سے اپنی عقل اور قوت کے مطابق فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ اُسی کا نام تقدیر ہے۔ لیکن جو غلطی ہوتی ہے۔ وُہ یہ ہے کہ اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ کہ ہر ایک جیتی جان کو اِن عطیات سے بقدرِ ظرف و ضرورت مستفید ہونے کا حق حاصل ہے۔ خاص کر انسان اس شرطِ تقدیر کو بالکل پسِ پُشت ڈال دیتا ہے۔ اور دُوسروں کے حقوق کا خیال نہ کرتا ہُوا سب کچھ ہی غصب کر لینا چاہتا ہے۔ اور اس طرح سے از خود اپنے لئے مصائب کو بلاتا ہے۔ دُنیا کے اندر کوئی کسی کا دُشمن نہیں۔ انسان خود ہی اپنا دوست و دُشمن ہے ؎

یُوں زیست نہ ہم کو اپنی بھاری ہوتی
کُلفت بھی خوشی بھی باری باری ہوتی

ہوتے نہ اگر ہم آپ اپنے دُشمن
یُوں تلخ نہ زندگی ہماری ہوتی (رواں)

لہذا ہمارے لئے واجب ہے۔ کہ ہم اپنی محنت وسعی کے ساتھ یہ شرائط لگا دیں کہ :۔

۱ ۔ ہم ایسی اشیاء کے حصُول کی کوشش کریں۔ جو ممکن الحصُول ہیں ۔

۲ ۔ ہمارے حصُول میں کسی اور کی حق تلفی نہ ہو ۔

۳ ۔ ہماری سعی و محنت کے وسائل کی نگران ایک قوّتِ اعلیٰ ہے۔ اِس لئے جو عقل و قوت ہم کو عطا ہُوئی ہے۔ ہم اس سے نہ تو محرُوم رہیں۔ اور نہ اس کو اس طور پر استعمال کریں۔ کہ اس غیبی قوت سے مستوجب سزا ہوں ۔

۴ ۔ جوُں جوُں ہمارے علم و قوت زیادہ ہوں۔ ہم اپنی ترقی کے وسائل کو بھی وسیع کریں۔ لیکن اوپر کی تین باتوں کا خیال رکھتے ہُوئے ۔

۵ ۔ جہاں ہم اپنی عقل و قوّت سے وسائلِ ترقی کو استعمال کرنے کے باوجود ناکام رہیں۔ تو نہ تو غضب میں آئیں۔ اور نہ مایوس ہوں۔ لیکن سکونِ دل سے سوچیں کہ آیا ہم نے اپنے جائز وسائل کے استعمال میں کہیں کمی تو نہیں کی یا ہم حد سے تجاوز تو نہیں کر گئے۔ یا ہم نے اپنے وسائل کے استعمال میں کسی شرطِ تقدیر کو تو نہیں توڑا۔ یعنی ہم دُوسروں کے حق پر چھاپہ تو نہیں مار رہے ۔

۶ ۔ جب باوجود اپنی سعیٔ بلیغ کے ہم کو انجام کار ناکامی ہو۔ تو اس کیلئے صبر و شکر لازمی ہے۔ اس صورت میں ہم کسی سزا کے مستوجب نہ ہونگے۔ نہ کسی لعن طعن کے۔ مثلاً ہم نے کھیت بویا۔ کھاد اور پانی بہم پہنچایا۔ حفاظت کی۔ کھیت پک گیا۔ لیکن اچانک طوفان آیا۔ اور پیداوار برباد کر گیا۔ ایسی صورت میں ہم بے قصُور رہیں۔ ہم کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہُوئے ۔

۷۔ ہمارے افعال سزا و جزا کے ماتحت ہیں۔ مثلاً روزانہ زندگی میں بھی ہم جس کا ادب کرتے ہیں۔ وہ ہماری عزت کرتا ہے۔ جس کی بے ادبی کرتے ہیں۔ وہ ہماری بے حرمتی کرتا ہے۔ جب ہم محبت کرتے ہیں تو بدلے میں پیار پاتے ہیں۔ جب نفرت کرتے ہیں تو نفرت خریدتے ہیں۔ یہاں پر اعتراض عائد ہو سکتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ :-

ا۔ ظالم ظلم کرتے ہیں۔ تاہم ان کو کوئی سزا نہیں ملتی۔

ب۔ نیک کوشش والوں کو کوئی صلہ نہیں ملتا۔

ج۔ بارہا بدوں کو بھی بہت کچھ مل جاتا ہے۔

اس کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ ہماری دانش محدود ہے۔ ہم قدرت اور قدرت کے مالک حکیم مطلق کے سارے رازوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ بعض اوقات اپنی زندگی میں دیکھا گیا ہے۔ کہ ایک واقعہ کو ہم نے اپنے لئے بڑا مصیبت وہ خیال کیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد اسی کو اپنے لئے ایک نعمت سمجھا۔ یا مثلاً والدین اپنی اولاد کی تربیت کے لئے ان کو تادیب کرتے ہیں۔ یا ڈاکٹر مریض کی چیر پھاڑ کرتا ہے۔ اور کڑوی ادویات کھلاتا ہے۔ یا ایک مریض کو مرغن غذا دیتا ہے۔ دوسرے کو دلیا۔ تیسرے کو شوربا۔ چوتھے کو دودھ اور پانچویں کو فاقہ کراتا ہے۔ تو والدین اور اطبا کو کوئی ان کے ان افعال کی وجہ سے مطعون نہیں کرتا۔ اسی طرح سے حکیم مطلق کے کاموں کی پوری آگاہی انسان کو نہیں ہو سکتی ؎

اس کو نہ راست کہہ نہ اس کو بتا غلط
کیا جانے کیا صحیح ہے واقع میں کیا غلط (قائم)

پھر ایک ظالم کو ظاہرا سزا نہ ملتے ہوئے دیکھ کر ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سزا سے بچ گیا ہے لیکن سزا دینے کا صرف وہی طریقہ نہیں جو ہمارے دل

میں ہے۔ وہ مالک برتر ہزاروں طرح سے اپنا غضب نازل کر سکتا ہے۔ دل کو رنج و غم کی شکل میں بعض دفعہ ایسا گھن لگتا ہے کہ اس کے مقابلہ کی کوئی اور سخت سزا ہی نہیں ہو سکتی۔ پھر ضروری نہیں۔ کہ ظلم کی سزا فوراً ملے۔ بیج بوئے جانے اور پھل لگنے کے درمیان کچھ عرصہ لگتا ہے۔ یہی نیک و بد کوشش کے اجر و سزا فوراً نہ ملنے کے متعلق سمجھ لینی چاہئے۔ بغیر کوشش کچھ ملنے کے متعلق بھی ہمارا اپنا قیاس اور خیال اپنے مشاہدہ پر ہی مبنی ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ہم اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ نیک خیالات رکھنا بھی ایک بڑی بھاری سعی ہے اس کو ہم عنصری آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن وہ عالم الغیب سب کچھ جانتا ہے۔ اس لئے ہمارا نتیجہ درست نہیں ہو سکتا۔ انسان کی عقل۔ انسان کا علم انسان کی طاقت محدود ہیں۔ عالم مطلق۔ قادر مطلق اور حکیم مطلق وہ خالق برتر ہی ہے اسکی رضا اور اس کی طاقت فائق اور غالب ہے۔ جو انسان ایسا سمجھ کر اور اس حد کے اندر رہ کر اپنی تقدیر کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ہر طرح سے کامیاب اور ممتاز ہوتا ہے۔ لیکن جو انسان صرف اعتراضات اٹھانے یا بال کی کھال نکالنے میں اپنا وقت لگاتا ہے۔ اس کی مثال ویسی ہی ہے۔ کہ جیسے ایک مالک اپنے نوکر کو کہے کہ تو باغ میں پھل اور پھول لگا۔ لیکن وہ بجائے اس کام میں لگنے کے یہ کہے کہ میں اپنا کام تب شروع کرونگا۔ جب مجھے پہلے بتایا جائے کہ باقی ملازمین کو دوسرے کام اور اعزاز کس وجہ سے دیئے ہیں۔ مثلاً محاسب کو کیوں آرام کی نوکری دے کر اتنا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ معتمد کو کیوں بغیر کام کرائے اتنی عزت ملتی ہے کیوں بعض آدمیوں کو حرم میں بھی داخل ہونے کی اجازت ہے۔ کیا اس نوکر کا یہ اعتراض درست ٹھہر سکتا ہے؟ مالک اپنے کاموں کو آپ جانتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون کس کام کے لایق ہے۔ کس سے کیا خدمت لی جا سکتی ہے ایسے ہی ہم

مالکِ اعلےٰ کے حکم سے یہاں یہ خاص خاص فرائض کی ادائیگی کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ ہمارا یہ فرض نہیں ہے۔ کہ دوسروں کے درجوں۔ اعزاز اور عزت کے متعلق نکتہ چینی کرتے رہیں۔ ہمارے لئے یہی واجب ہے کہ اپنے فرض کو اس مالک برتر کے احکام کے مطابق نہایت احسن طریق سے سرانجام دیں۔ اور نیک ثمرات کے مستحق ہوں ؎

قدرت کے کاروبار میں حجت نہ چاہیئے — ہم کو ادائے فرض میں غفلت نہ چاہیئے
بیوجہ ترکِ محنت و ہمت نہ چاہیئے — بیکار بیٹھے رہنے کی عادت نہ چاہیئے
رازِ مقدراتِ الٰہی میں بحث کیا — دنیا میں زندگی کے فرائض کریں ادا

ہم کون ہیں جو حدِ ادب سے بڑھیں ذرا؟
کہتے پھریں یہ کیوں نہ کیا اور وہ کیوں کیا؟ (احمدی)

میں نے اس نازک سوال پر مسئلہ تناسخ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں ہر دو کے نقطہ نگاہ سے چند پراگندہ خیالات پیش کرنے کی کوشش اور جرأت کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جیسی میری عقل خام ہے مضمون کے اندر بھی خامیاں ہونگی۔ لیکن غور کرنے والے صاحبان کے لئے سوچ وبچار کا کافی موقعہ ہوگا۔

دونو طرح سے یہ امر ظاہر ہے کہ تقدیر اور تدبیر دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ جو شخص توکل کی رٹ لگاتے ہیں۔ وہ بھی مالکِ اعلیٰ کے حکم کو ٹھیک نہیں سمجھتے۔ وہ بھول جاتے ہیں۔ کہ اس حکیم برتر نے ہم کو عقل اور اعضاء اور وسائل ایک خاص غرض کے لئے عطا کئے ہیں۔ میں اس ربِّ کریم سے مدد مانگنے کے خلاف نہیں۔ بلکہ اس کو نہایت لابدی سمجھتا ہوں۔ لیکن کب ؎

پھر چاہئے مدد مانگنی یزدان سے — کوشش میں ہے شرط ابتداء انسان سے
پائی نہ نجات نوح نے طوفان سے — جب تک نہ کام دست و بازو سے لیا
(حالی)

بہت لوگ توکّل کے معنی غلط لیتے ہیں۔ وہ نکماپن کو اور ہاتھ پر ہاتھ دھر بیٹھنے کو توکل کہتے ہیں اور ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ توکل پر انحصار رکھنے سے پیشتر اپنی جانب سے پوری محنت اور کوشش لازمی ہے۔ بیج بوؤ۔ کھاد اور پانی بہم پہنچاؤ۔ حفاظت کرو اور پھر توکّل کا نام لو۔ اور مالک سے اپنی کوشش کے نیک ثمر کی دُعا مانگو۔ کہ کوئی ارضی وسماوی آفت آکر اس کوشش کو رائیگاں نہ کردے۔ سمجھ لینا چاہئے کہ ؎

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار
اُٹھو۔ کوشش کرو بیٹھے ہو کس دھیان میں (اکبر)

ہمارا فرض کیا ہے۔ ہمارے لئے کیا کرنا واجب ہے ؎
دسترس صید پہ حاصل تجھے ہو خواہ نہ ہو
شیر ہی بن کے نکل صُورتِ روباہ نہ ہو (اکبر)

ہاں ہم کو بالکل بے صبر بھی نہ ہونا چاہیئے۔ اور نرے قوّتِ بازو کے شیدا نہ بننا چاہیئے۔ تدبیر کو عمل میں لانا چاہیئے۔ لیکن تقدیر کی حد کو فراموش نہ کرنا چاہیئے ؎

نہ نرے اُونٹ ہو نہ ہو مُنہ لگ ڈاگ[1] نہ تو مٹی ہی ہو نہ تم ہو آگ
چال ہے اعتدال کی اچھی
سازِ حکمت کا خوب ہے یہ راگ (حالی)

---

[1] ۔ چوہڑے منہ والا کتا۔

اِنسان اَور اُس کی زندگی

وُہ چال چل کہ عُمر خوشی سے کٹے تری
وُہ کام کر کہ یاد تجھے سب کیا کریں

انیسویں صدی کا ایک انگریز مصنف سبر جمیز لکھتا ہے کہ انسان کی زندگی ایک ڈائری ہے۔ جس میں ارادہ تو وُہ ایک خاص کہانی لکھنے کا کرتا ہے۔ لیکن لکھ کچھ دوسری ہی بیٹھتا ہے۔ اور اس کی حالت اُس گھڑی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ کہ جب وُہ اس کہانی کا موازنہ اس سے کرتا ہے۔ کہ جو کچھ وُہ لکھنے کی اُمید کرتا تھا۔

حقیقت میں ہم میں سے اکثر لوگوں کی یہی حالت ہے کہ وُہ اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا خیال لیکر اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ لیکن جو سڑک کامیابی کی منزل کو جاتی ہے۔ اس کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ تاہم دل میں پھر بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہم کامیابی کی راہ پر چل رہے ہیں۔ لیکن جب اپنے مقام پر پہنچتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم بالکل اُلٹی راہ پہ چلے آئے۔ پھر اس وقت کچھ نہیں بن پڑتا۔ سوائے یاس و حسرت کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو کام کے دن تھے۔ نکل گئے۔ جو وسائلِ احسنہ حاصل تھے وہ اب موجود نہیں رہے۔ بدن کی سکت و طاقت بھی ختم ہو چکی۔ لیکن پھر کیا ہو سکتا ہے ؎

اب پچھتائے ہوت کیا جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت

اس بات سے تو کسی کو انکار نہیں کہ پیکرِ انسانی بڑی خوش قسمتی سے ملتا ہے۔ مسئلہ تناسخ کو ماننے والے کہتے ہیں کہ کئی جنموں کے بعد بڑے ہی نیک اعمال کے

ثمر کے طور پر یہ انسانی جامہ ملتا ہے۔ جو آدمی اس کو کامیاب بنانے اور اس کو سپھل کرنے سے چوک جاتا ہے۔ اس کی مثال اس اندھے کی سی ہوتی ہے۔ جو قلعہ میں گھرا ہوا ہو۔ اور اس کو بتایا جائے کہ صرف ایک دروازہ باہر جانے کا ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ہاتھ رکھتے ہوئے اس دروازے سے باہر نکل جانا۔ لیکن اندھا چلتا چلتا جب دروازے کے پاس پہنچے تو کھجلی کرنے لگ جائے اور دروازہ سے آگے نکل کر پھر اسی چکر میں پڑ جائے۔ بار بار جنم مرن یا پیدائش و موت کے قلعہ کے چکر سے رہا ہونے کا دروازہ یہی پیکر انسانی ہے۔ جو شخص اس موقعہ کو ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے۔ وہ پھر جیو راسی کے قلعہ میں پڑ جاتا ہے۔

مسئلہ تناسخ کے نہ ماننے والے بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس ساری مخلوقات میں پیکر انسانی افضل ترین ہے۔ مقابلہ کر کے دیکھئے کہ حیوانات میں شیر سب سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس بیچارے کو رہنے کو مکان نہیں۔ سردی گرمی جسم پر جھیلنی پڑتی ہے۔ اپنی سردی کو دُور کرنے کے لئے آگ تک روشن نہیں کر سکتا۔ اپنی حفاظت کے لئے کوئی بند مکان نہیں بنا سکتا۔ جسم سے بو آتی ہے۔ خوراک نہ وقت پہ ملتی ہے۔ نہ حسب منشا۔ اور اگر ملتی بھی ہے تو لہو ہڈی غلاظت سب کچھ ایک ساتھ ہی کھا جاتا ہے۔ بھلا یہ کوئی زندگی ہے۔ پرندوں میں مور سب سے زیادہ خوش نما ہے۔ لیکن اس کے بھی آرام و آسائش کی کم وبیش دیگر حیوانات یا پرندوں کی سی حالت ہے۔ اور کھانے کو سانپ ملتے ہیں۔ غرضیکہ وحشی سے وحشی انسان بھی اچھے سے اچھے حیوان سے برتر ہے۔ وحشی لوگ بھی اپنی حفاظت اور شکار کے لئے تیر کمان بناتے ہیں۔ برے بھلے گھر بھی بنا لیتے ہیں۔ آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی زبان ہوتی ہے جس سے اپنی ضروریات اور خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔

پھر اس رب کریم نے انسان کو باقی ساری مخلوق پہ فائق رکھا ہے۔ ہاتھی اور گھوڑوں پہ یہ سواری کرتا ہے۔ بھیڑ بکری اور کئی پرندوں کو کھاتا ہے گائے بھینس

سے دُودھ حاصل کرتا ہے۔ کئی جانوروں کے کھال۔ بال اور ہڈی کو اپنی ضروریات زندگی کے لئے استعمال میں لاتا ہے۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ کہ خالق برتر نے سب چیزیں کسی خاص غرض کے لئے بنائی ہیں۔ اور ہر ایک چیز کے پیدا کرنے میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ وُہ ہنس کر کہنے لگا کہ تم پُرانے خیالات کے لوگ ہمیشہ یہی رٹ لگاتے رہتے ہو۔ اچھا بتاؤ کہ مکھی۔ سانپ اور شیر انسان کے کس کام آتے ہیں۔ اور اُن کے پیدا کرنے میں کونسی حکمت چھپی ہوئی ہے۔ یہ تو ہر طرح سے انسان کے دُشمن ہیں۔ مکھی بیماریاں لاتی ہے اور شیر اور سانپ انسان کی جان کے دُشمن ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ کہ میری عقل تو محدُود ہے۔ میرا علم بھی محدُود ہے۔ اِس لئے اِس حکیمِ مطلق کی ہر ایک حکمت کو سمجھنا تو میرے لئے نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن ہاں تینوں چیزوں کے متعلق جو کچھ میرے مالک نے اس وقت میرے دماغ میں بات ڈالی ہے۔ میں عرض کئے دیتا ہوں۔ اول آپ مکھی کو لیں۔ اس سے بڑھ کر حضرتِ انسان کو خبردار کرنیوالا کوئی چوکیدار نہیں صفائی انسان کی صحت۔ زندگی۔ خوشی اور عبادت کے لئے بڑی ضروری شے ہے لیکن انسان اگر صفائی کی طرف سے ذرا بھی لاپرواہ ہو۔ مکھی فوراً وہاں پہنچ کر آگاہ کر دیگی۔ کہ صفائی سے غافل ہو گئے ہو۔ برعکس اس کے اگر گھر کے اندر پوری صفائی ہو۔ تو مجال نہیں کہ یہ بیچاری نزدیک چھو جائے۔ جہاں بھی گندگی اور غلاظت ہوگی۔ یہ وہاں ہی پہنچ کر ہماری لاپرواہی اور غفلت کا پتہ دے دیگی۔ غرضیکہ جو مقام۔ جو چیز۔ جو جسم کا حصہ یا جو کپڑا میلا ہوگا۔ وہیں مکھی آئے گی۔ پھر آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہ مکھی کھانے کی چیزوں پر آکر بیٹھتی ہے۔ اور دُوسری جگہ سے کئی قسم کے جراثیم لاکر کھانے میں ملا دیتی ہے۔ لیکن کیا مکھی کی یہ عادت آپ کو یہ نیک سبق نہیں سکھاتی۔ کہ ہر ایک چیز کو ڈھک کر رکھا جائے۔ مکھی کے علاوہ گرد و غبار اپنے

مُنہ کا سانس اور تھوک اور دیگر لوگوں کی نگاہ بھی کھانے پینے کی اشیاپر نہ پڑنی چاہیئے۔ اس لئے اگر مکھی کی اس عادت سے ہم خائف نہ ہوں۔ تو باقی چیزوں سے بھی اشیائے خورد و نوش کو محفوظ رکھنے کا ہم کو شائد کم خیال آئے۔ اِس طرح سے مکھی انسان کے لئے مُفید ہے۔ اب سانپ کو لیجئے۔ اگر سانپ کا خوف انسان کو نہ ہو تو بہت سے کم دل انسان بھی دُوسرے لوگوں کے اندر چھُپی ہُوئی چیزوں کے اندر ہاتھ ڈالنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب اکثر لوگ رات کو اندھیرے میں (جو کہ گناہ اور بداعمال کرانے میں بڑا ممد ہوتا ہے) سانپ اور دیگر زہریلے جانوروں کے ڈر کے مارے نہیں جاتے۔ نہ بلا سوچے سمجھے کہیں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ پھر شیر اور دیگر خونخوار جانور اگر جنگل میں نہ ہوں۔ تو لوگ رات کو جنگلات کو کاٹ کر یا دیگر طرح سے اُجاڑ دیں اور اس نعمت سے نسلِ انسانی کو محرُوم کر دیں۔

غرضیکہ کسی چیز کی موجودگی بھی خالی از حکمت نہیں۔ ہم اس کی قدرت کے سارے اسرار سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ہم ان چیزوں کو جو ہمارے سامنے جس حالت میں آتی ہیں۔ اُن سے اپنی عقل کے مطابق اندازہ لگا لیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ؎

تری قدرت کی حد پا نہیں ممکن کوئی پائے سمندِ فکر کو کیسے بھی چالاکی سے دوڑائے

کسی کی کیا حقیقت ہے، کہاں ڈھونڈنے جائے کہ وڑوں سال میدانِ خلا میں ٹھوکریں کھائے

یہ وہ ابجد ہے جس میں لفظ "پایا" آ نہیں سکتا

یہ وہ مشکل معمہ ہے کہ پایا جا نہیں سکتا (احمدی)

مگر ان معموں کے حل کرنے کی بھی ضرورت کیا ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے۔ کہ ہم زندگی کو کس طرح سے کامیاب بنا سکتے ہیں۔ پہلے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے۔ کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ ایک گروہ خیال کرتا ہے۔ کہ یہ زندگی

دُکھوں کا گھر ہے۔ سوائے رنج و غم کے اُس میں کچھ نہیں رکھا۔ وہ کہتے ہیں ؎

دیکھا کسی کو شاد نہ دُنیا میں آج تک

آشفتہ کون ہے جسے رنج و الم نہیں (آشفتہ)

وہ خود دُنیا سے اس قدر بیزار رہتے ہیں۔ کہ انہیں خوشی کہیں نام کو بھی دکھائی نہیں دیتی۔ ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جتنے انسان اس دُنیا کے اندر رہ کر چلے گئے۔ وہ سب روتے ہی گئے۔ اور جو موجُود ہیں۔ اُن کو بھی سوائے رونے دھونے کے کوئی کام نہیں ہے ؎

دُنیا مقامِ غم ہے خوشی نام کو نہیں جو اس مکاں میں رہ کے گیا نوحہ گر گیا (حامد)

پھر وہ لوگ خوش کن لوگوں کو سمجھتے ہیں۔ اُن کی نگاہ میں سلامتی کس جگہ ہے۔ چین کہاں ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

جو زیرِ زمیں سوتے ہیں راحت میں وہی ہیں

آرام کسی کو نہیں دُنیائے دُنی میں (بزم)

اس لئے اپنے لئے ایسا ہی آرام طلب کرتے ہیں۔ دُنیا سے ہر وقت بیزار رہتے ہوئے یہاں پر سوائے رنج و الم کے کچھ نہ دیکھتے ہوئے کہتے ہیں ؎

اُٹھائے رنج کیا کیا زندگی میں

اجل! آ جان بخشی ہے اسی میں

بس اس دُنیا کو چھوڑ کر ہی انہیں آرام ملنے کی توقع ہے۔ اس سے بیشتر نہیں۔ جیسے کتوں سے تعاقب کیا ہوا ہرن بڑی پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ حیران و ششدر رہتے ہیں۔ اور موت سے ہم آغوش ہو کر اطمینان کا سانس لے کر یُوں گویا ہوتے ہیں ؎

زندگی کیسی مصیبت تھی کہ اللہ کی پناہ جان نکلی ہے تو اب ہوش ٹھکانے آئے (اثر)

دُوسری طرف وہ لوگ ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ دُنیا عیش کرنے کی جگہ ہے۔ یہ ایک سیرگاہ ہے۔ اس میں خُوب چلو پھرو۔ مزے اُڑاؤ EAT DRINK & BE MERRY "کھاؤ پیؤ اور چین اُڑاؤ"۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اِس دُنیا کے بعد نہ کوئی دُوسری دُنیا ہے۔ نہ کوئی اور زندگی۔ جو کچھ ہے یہی زندگی ہے۔ اِس زندگی سے پرے کچھ نہیں۔ اِس زندگی کا جس قدر لطف اُٹھایا جاسکے۔ اُٹھانا چاہیئے۔ زندگی کو فکر و تردّد یا تشویش میں گذارنا وہ جہالت اور نادانی سمجھتے ہیں۔ اس دُنیا میں آنے کا مقصد ہی وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ دُنیاوی چیزوں سے مزے اُڑائے جائیں۔ اُن کا خیال ہوتا ہے۔ کہ ہر ایک چیز انسان کے استعمال کے لئے بنی ہے۔ قدرت کی ساری چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ہر ایک چیز سے فائدہ اُٹھانا اس کا حق ہے۔

وُہ یہ بھی خیال نہیں کرتے۔ کہ اُن کے عیش و عشرت پر کوئی قید یا حد ہے۔ نہ اُن کو گمان ہے۔ کہ کوئی اُن سے پُرسشِ اعمال کرنے والا یا جزا و سزا دینے والا ہے۔ ان کا تو وہی حال ہے کہ ؎

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے (آتش)

اُن کو اپنے ہی آرام کا اپنے ہی عیش کا خیال ہوتا ہے۔ بمصداق "کوئی مرو۔ کوئی جیو۔ سُتھرا گھول پتاشہ پیؤ"۔ وہ اپنی زندگی کا مقصد ہی یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بھی ہوسکے۔ اپنے لئے سارے آرام کے سامان مہیا کئے جائیں۔ نہ کسی سے ہمدردی نہ کسی سے محبت نہ کسی کا غم۔ نہ کسی کا درد۔ وہ تو یہی کہتے ہوئے سُنے جاتے ہیں ؎

ہر ایک موسم میں کشتِ آرزو سرسبز رہتی ہے تردّد غیر کو ہوگا یہاں تو چین کرتے ہیں
(جوہر)

یہ دونو گروہ ہی یعنی ایک سارا دن رونے دھونے سے واسطہ رکھنے والے اور دُوسرے کسی کے لئے بھی درد وغم نہ رکھنے والے زندگی کے حقیقی مقصد کو نہیں سمجھے۔ رُوس کا مشہور مصنف ٹالسٹائی لکھتا ہے۔ کہ بہت آدمیوں کا یہ خیال کہ زندگی رونے دھونے کا ہی نام ہے۔ بے بنیاد ہے۔ ایسے ہی وُہ خیال بے بُنیاد ہے کہ جو جوانی۔ صحت اور زر و دولت کے ایام میں پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ زندگی محض عشرت کیلئے ہے۔

پھر زندگی کی کامیابی کا معیار کیا ہے۔ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے۔ کہ اس دُنیا میں اُسی شخص کی زندگی کامیاب گنی جاتی ہے۔ جس کو خوشی حاصل ہے اور دُوسرے لوگ اس کو پیار اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اگلی دُنیا کے لئے اُس نے توشۂ آخرت اکٹھا کر لیا ہے ؎

وُہی انسان ہے انسانِ کامل   کہ جس نے خدمتِ خلقِ خُدا کی
خوشی سے ہے سراسر شاد رہتا
محبت جس کے دل میں ہو خُدا کی

انگلستان کے مصنف مسٹر جانسن لکھتے ہیں۔ کہ دیگر تمام نعمتوں کی طرح زندگی کی قدر و قیمت اس کے استعمال سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ استعمال اپنے فائدے کے لئے نہیں۔ بلکہ ایک زیادہ مبارک مقصد کے لئے ہو اور وُہ مقصد ہے "نیکی"!

انگلستان کے مشہور شاعر مسٹر جے وُڈ نے لکھا ہے۔ کہ میں اپنی زندگی کے اُس حصّے کو ضائع شدہ سمجھتا ہوں۔ کہ جو یادِ خُدا میں نہ گذرے۔ یا جو نیکی کرنے کے لئے صرف نہ ہو۔ اسی لئے کہا ہے کہ ؎

انسان کرے وُہ بات کہ اجر و جزا ملے
بندہ چلے وہ راہ کہ جس سے خُدا ملے

دیکھنے میں آتا ہے کہ اکثر انسان اپنے مقصدِ زندگی سے غافل ہیں۔ وہ اپنے قیمتی لمحات کو روز بروز ہزلیات میں کھونے کے عادی ہو رہے ہیں۔ وہ اپنے نفع و نقصان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ اُن سے پُوچھنا چاہیئے ؎

تجھے معلوم ہے کس واسطے تو باغ میں آیا وہ کیا مطلب تھا جسکے واسطے سلطاں نے بھجوایا۔

نہ بھُورے سے کوئی دم بھی ادھر کچھ دھیان فرمایا

کہ میں ہوں کون جاتا ہوں کدھر کس سمت سے آیا (احمدی)

اسلئے ہمیں اپنی زندگی پر ہمیشہ دھیان دیتے رہنا چاہیئے۔ کہ وُہ متذکرہ بالا پہلوؤں سے کامیاب ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس کی خامیاں دُور کرنی چاہئیں۔ کامیاب زندگی کے بنانے کے لئے ابتدا ہی سے اچھی بنیاد ہونی چاہیئے۔ بچپن سے ہی اس کی تیاری ہونی چاہیئے۔ ہمارا عام طور پر خاصہ یہ ہے کہ ہم وقت پر دھیان نہیں دیتے۔ اور بعد میں ہماری کوشش کچھ سُودمند ثابت نہیں ہوتی۔

بچپن اوائل عمر سے ہی بچے کی تربیت اس قسم کی ہونی چاہیئے اور اس کی عادات ایسی بنائی جائیں۔ کہ وُہ اپنی آنے والی زندگی میں اُن پر عمل پیرا ہو کر کامیابی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ جیسے پیداوار اچھی حاصل کرنے کے لئے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ زمین اچھی ہو۔ پھر بیج اچھا ہو۔ پھر اس کی احتیاط اور حفاظت کی جائے۔ ایسے ہی اچھے کامیاب انسان پیدا کرنے کے لئے بھی ان تینوں چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ انسان کی حالت میں زمین ماں ہوتی ہے۔ ماں کے خیالات اور افعال کا اثر بچے پر براہِ راست پڑتا ہے۔ اسلئے پہلے ماتری شکتی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس دیش کی ماتائیں تربیت یافتہ پاکیزہ خیالات کی اور اچھے اخلاق اور سلیقہ والی ہیں۔ وہاں کے انسان ضرور دُنیا میں میدانِ عمل میں اُترنے والے اور اپنے فرائض کو سمجھنے والے پیدا ہونگے۔

؎۔ جلنے والی کی طاقت۔

عام طور پر جتنے بڑے آدمی ہوئے ہیں۔ ان سب کی مائیں اچھی تھیں۔ ہمارے ملک کی دیویوں کے کارنامے زبان زدِ خلائق ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں وہ عنقا ہو رہے ہیں۔ ہماری بہنیں بھی مردوں کی طرح مغرب کی بُری باتوں کو اپنی زندگی کے اندر داخل کر رہی ہیں۔ لیکن وہاں کی صنفِ نازک کی نیک عادات مثلاً محنت کرنا۔ گھر کے سب کام کاج کرنا۔ بیمار اور تکلیف زدہ کی خدمت کرنا۔ موقعہ پڑنے پر اپنی جان تک کی پروانہ کرنا۔ ان باتوں کو وہ بالکل بھلا رہی ہیں۔ ہماری بہنیں نزاکت فیشن اور بے حیائی میں تو ان سے بھی چار قدم آگے بڑھنا چاہتی ہیں۔ لیکن اُن کے اوصافِ حسنہ کی طرف توجہ نہیں دیتیں۔ یہ ایک بہت بُری لہر چلی ہے۔ جس سے ملک کو خبردار ہونا چاہیئے۔ ہمارے ملک کے حالات کے موافق نہیں ہے۔ اس کے بدنتائج کا اظہار پہلے ہی ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اور اگر اس کا جلد تدارک نہ کیا گیا۔ تو ملک کی مزید تباہی میں کوئی شک نہیں۔

ماں کے بعد باپ ہے۔ وہ بھی نیک خیالات کا بہادر اور فرض شناس ہونا چاہیئے۔ اولاد پیدا کرنے کے متعلق ان تمام اصُولوں کو جاننے والا ہونا چاہیئے۔ کہ جو اس بارہ میں ہماری کُتبِ مقدسہ اور ہمارے بزرگوں نے بیان فرمائے ہیں۔ ورنہ بے ارادہ کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسا موسم برسات کا گھاس پھوس۔ جو فرق طیاری سے لگائے ہوئے باغیچہ کے پودوں کا اور برسات کی خودرَو گھاس پھوس کا ہوتا ہے۔ وہی ارادہ اور بے ارادہ کی پیدا کی ہوئی اولاد میں ہوتا ہے۔ اصُولوں کو مدِ نظر رکھتے ہُوئے شیر پیدا ہوتے ہیں۔ اور بلا ارادے سے کُتیا کے بچے یا جُوئیں ہی پیدا ہوتی ہیں۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد اس کی تعلیم و تربیت احتیاط سے ہونی چاہیئے۔ بچوں کو اچھی تعلیم کے زیور سے مزین کرنا چاہیئے۔ اور خود سچائی۔ راست بازی

پاکیزگی ۔ ایمانداری ۔ سادگی اور خوش اخلاقی کا نمونہ بن کر ان کے سامنے رہنا چاہیئے ۔ کس طرح سے ایک باپ جو خود جھوٹ بولتا ہے ۔ اپنے بچوں کو اس بد عادت سے باز رہنے کے لئے کہہ سکتا ہے ۔ یا اس کے کہنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے ۔ ہم اولاد کو اچھا بنانے کی اُمید تبھی باندھ سکتے ہیں ۔ اگر خود ان اوصاف کو اپنے اندر رکھتے ہوں ۔ جنہیں اپنی اولاد کے اندر لانا چاہتے ہیں ۔ ہم کو کیسا بننا چاہیئے ؎

خوش بیاں خوش لہجہ خوش اخلاق خوش خُو خوش ادا
ذی ہنر ۔ ذی عِلم و فن و حوصلہ زیرک ذکی
پاک باطن پاک ظاہر پاک طینت پاک دل
کینہ و بغض و حسد حرص و تعصب سے بری

اگر ہم خود ایسے بنینگے ۔ تو ہماری اولاد بھی ان اخلاقِ حسنہ سے مزین ہوگی ۔ بچپن باقی زندگی کی بنیاد ہوتا ہے ۔ اگر بچپن میں نیک عادات بن جائیں ۔ اور نیک اطوار حاصل ہو جائیں ۔ تو باقی زندگی کی کامیابی کی نیک بُنیاد پڑ جاتی ہے ۔

جوانی جوانی دیوانی کہی جاتی ہے ۔ اس کے اندر بڑے تلاطم آتے ہیں ۔ بڑی اندھیریاں آتی ہیں ۔ جن نوجوانوں کی تربیت شروع سے اچھی ہوتی ہے ۔ وہ اندھیریوں کو برداشت کر جاتے ہیں ۔ ورنہ وہ اس کے کسی بگولے میں پھنس کر اپنی تباہی کا باعث بنتے ہیں ۔ آج کل کے نوجوان ناپاک محبت کو بھی اپنا جزوِ زندگی سمجھتے ہیں ۔ محبت جو کہ ایک پاک نغموں سے بنی ہوئی شے ہے اُسکے نام کو بھی پلید کر رہے ہیں ۔ اگر ان کو سمجھایا جائے ۔ تو وہ اپنے بزرگوں کو پُرانے زمانے کے جانور کہہ کر بحث کرنے لگتے ہیں ۔ کہ محبت کے بغیر انسان انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ محبت سے خالی انسان حیوان سے بھی بدتر ہے ۔

لیکن وہ کونسی محبّت ہے۔ اپنی بہنوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا محبت نہیں ہے۔ یہ تو پرلے درجے کی گراوٹ اور بداطواری ہے۔ محبّت نام ہے غریبوں۔ بےکسوں۔ بےوسیلہ لوگوں۔ بیماروں۔ مصیبت زدہ بھائیوں سے ہمدردی کرکے اُن کی تکالیف دُور کرنے کا۔ محبّت اس بات کا نام ہے کہ ؎

مصیبت جس کو پیش آئے تو اُس کا آشنا تُو ہو
کوئی ماتم زدہ پائے تو دل سے غم رُبا تُو ہو
کوئی ہو راہ گُم کردہ تو اس کا رہنما تُو ہو
غرض ہر زخم کا مرہم ہر اک دُکھ کی دوا تُو ہو
جہاں مشکل کی پڑ جائے گرہ ناخن ترا کھولے
تُو ہر اک درد میں شامل ہو ہر آواز پہ بولے (نظیر)

حقیقی محبت کیا ہے۔ اس کے متعلق مَیں ایک علیحدہ باب میں مفصّل عرض کر چکا ہُوں۔ جو لوگ اصلی محبّت سے آشنا ہوتے ہیں۔ وُہ تو اپنی اغراض کو اپنے فوائد کو دُوسروں کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ؎

جو راہِ دوستوں میں اے میرؔ مر گئے ہیں
سر دینگے لوگ اُن کے پا کے نشاں کے اوپر (میر)

جن کو سچّی محبّت کی لگن لگ جاتی ہے۔ جن کے اندر دُوسروں کے درد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وُہ ایک نشے کے اندر سرشار رہتے ہیں۔ حقیقی پریم کی تو ایک رتّی بھی انسان کے لئے کافی ہے۔ جیسے کہ کبیر صاحب نے کہا ہے ؎

سب رسائن مَیں کیا پریم سمان نہ کوئے
رتی من میں سنچرے سب تن کنچن ہوئے

ترجمہ۔ مَیں نے ساری کیمیا آزما کر دیکھ لیں۔ لیکن پریم کے مقابلہ کی کوئی

نہیں۔ اگر اس کی ایک رتی بھی دل میں پیدا ہو جائے۔ تو سارا جسم سونے کا بن جاتا ہے۔ لیکن جس پریم سے ہمارے آجکل کے نوجوان واقف ہیں۔ اُس کا کیا نتیجہ ہوتا ہے ؎

پہلے بتوں کے عشق میں ایمان پہ بنی
پھر ایسی آ بنی کہ میری جان پر بنی (ذوق)

جھوٹا عشق۔ مٹی اور خون کا عشق۔ سفید رنگ اور سیاہ بالوں کا عشق۔ ہرگز ہرگز عشق نہیں ہے۔ یہ تو اخلاق و ایمان کی تباہی اور جوانی کی بربادی ہے اس کے بس میں آکر۔ اس کا شکار ہو کر جہاں انسان اپنی عزت آبرو اور ساکھ کھوتا ہے۔ وہاں اور کیا کیا جاتا ہے ؎

تاب و طاقت۔ صبر و راحت۔ جان و ایماں۔ عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے (مومن)

اے میرے نوجوان بھائیو! اس مرض میں مبتلا نہ ہونا۔ جوانی بجائے خود ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے لیکن یہ مرض تو جوانی کا بہت جلد خاتمہ کر دیگی۔ جوانی خود زندگی کا ایک عارضی دَور ہے۔ اگر اس کو ایسی فضولیات میں کھو بیٹھے۔ تو پھر پچھتاتے ہوئے کہو گے ؎

کچھ قدر نہ کی عہدِ جوانی کی صد افسوس
ہم رہ گئے غفلت میں یہ آیا بھی گیا بھی (اکبر)

اس مرض سے محفوظ رہنے سے ہی زندگی بن سکتی ہے۔ بزرگوں کو جوانوں کے لئے ہمیشہ یہ دُعا کرنی چاہئیے۔ کہ وُہ اس سے بچے رہیں ؎

جو دانش مند ہیں وہ یُوں دُعا دیتے ہیں لڑکوں کو
نہ ہو مکار پیری میں نہ ہو عاشق جواں ہو کر (اکبر)

یہی دن میدانِ عمل میں کام کرنے کے ہیں۔ یہی دن ترقی کے ہیں یہی دن اُٹھنے کے ہیں۔ اسی زمانہ میں اپنے آپ کو اُونچا اُبھار سکتے ہو۔ اپنے لئے۔ اپنے والدین کے لئے۔ اپنے خاندان کے لئے اپنے مُلک کے لئے نام پیدا کر سکتے ہو۔ اگر بال سنوارنے۔ لونڈر لگانے میں ہی یہ وقت گذار دیا۔ تو کفِ دست ملتے ہُوئے کہنا پڑے گا ؎

کیا یاد کر کے روؤں کہ کیسا شباب تھا
کچھ بھی نہ تھا، ہوا تھی، کہانی تھی، خواب تھا (جوہر)

لڑکپن تو کھیل کُود یا نادانی میں نکل جاتا ہے۔ بُڑھاپے میں سب اعضاء و اعصاب کمزور اور ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ جو کچھ وقت ہوتا ہے۔ وہ جوانی کا ہوتا ہے۔ ایک مغربی فلاسفر لکھتا ہے۔ کہ ہمیں اپنی عُمر کا اندازہ

اعمال سے لگانا چاہئے۔ سالوں سے نہیں۔
خیالات سے لگانا چاہئے۔ سانسوں سے نہیں۔
جذبات سے لگانا چاہئے۔ گھڑی کے ہندسوں سے نہیں۔

وہی شخص عُمر دراز ہے۔ جو اپنی زندگی کے مقصد کو خوب سوچتا ہے۔ پھر دُوسروں کے لئے بہت زیادہ درد رکھتا ہے۔ اور نہایت اچھے اعمال کا مالک بنتا ہے۔

ہمارے نوجوان اپنی زندگی کا کوئی مُفید پروگرام نہیں بناتے۔ ہر صیغہ کی حد کو پار کرتے ہیں۔ اصولوں کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ قانونِ قدرت کو قدم قدم پر توڑتے ہیں۔ نتیجہ کیا ہوگا ؎

جوانوں کو ذرا پروا نہیں بے اعتدالی کی
بُڑھاپے میں نتیجے اس کے یہ نادان دیکھیں گے (اکبر)

ہمارے ہاں نہ کوئی کھانے پینے کا اصول ہے۔ نہ باقی باتوں کا۔ اس لئے زندگی بڑی بے قاعدہ اور بغیر اصول کے ہوتی ہے۔ کھانے کے متعلق تو خصوصاً ہم لوگ بہت ہی لاپرواواقع ہوئے ہیں۔ زیادہ خوری اور غلط خوری سے جتنی بیماریاں واموات واقع ہوتی ہیں۔ اور کسی سبب سے نہیں۔ پھر ہمیں وقت کی بھی کوئی قدر نہیں۔ فضول باتوں میں اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کو ضائع کیا جاتا ہے۔ نیک انسانوں کے جو اصول ہوتے ہیں۔ وہ یہ ہیں ؎

اصل کار صوفیاں کم خوریست ذکر و فکر و خلوت و بیداریست

جز حضورِ دوست نبود دینِ شاں

گنگی و خاموش است آئینِ شاں

ترجمہ۔ نیک انسانوں کا پہلا کام کم کھانا ہے۔ پھر مالک کو یاد کرنا۔ اور اپنے اعمال پر نظر ڈالنا۔ زیادہ لوگوں میں جانے سے پرہیز کرنا۔ اور ہر ایک طرح سے خبردار رہنا۔ سوائے اس خالق برتر کی حضوری کے ان کے لئے اور کوئی دین نہیں ہوتا۔ اور سوائے خاموش رہنے (یادِ الٰہی میں لگنے اور اپنی حالت پر غور کرنے کے) کے ان کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔

سکاٹ لینڈ کا مشہور شاعر اور مصنف آر۔ایل سٹیونسن زندگی کے پروگرام کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ انسان اگر اپنی زندگی کو حقیقی طور پر کامیاب بنانا چاہتا ہے۔ تو اُسے واجب ہے کہ ایماندار اور راست باز ہو۔ نیک دل ہو۔ بلکہ بہت زیادہ نہ کمائے۔ لیکن کمائی سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ اس کی موجودگی لوگوں کے لئے باعثِ خوشی ہو۔ قربانی اور دوسروں کی خدمت کا جذبہ دل میں موجود ہو۔ دوست تھوڑے بنائے۔ لیکن ہوں سب سچے۔ اور خود بھی ان کا سچا دوست بن کر رہے۔ یہ لائحہ عمل اس کی زندگی کے سارے مصائب سے محفوظ رکھ کر انجام کار

باعثِ راحت ہوگا"

ہمارے ہاں اس وقت اس پروگرام کے بالکل برعکس عمل ہو رہا ہے خاص کر راست بازی اور راست شعاری کو تو ہم جانتے ہی نہیں۔ کہ کس بلا کا نام ہے۔ بات بات میں جھوٹ۔ قدم قدم پہ دھوکہ ہمارا شیوہ بن گیا ہے۔ اسی لئے نہ ہماری عزت اپنی نظروں میں ہے۔ نہ دوسروں کی۔ ایک آدمی کوئی چیز طیار کر کے مارکیٹ میں بھیجتا ہے۔ لوگ حُبِّ وطن کے خیال سے اس کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے ہی دن اس میں روپے میں سے ایک پیسہ اور نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی بکری رک جاتی ہے۔ ایک تو ایمان گیا۔ دوسرے اپنا نقصان ہوا۔ تیسرے ملک کی تجارت اور صنعت کی ترقی رکی۔ چوتھے بے اعتمادی بڑھی۔ پانچویں دیگر لوگوں کے حوصلے پست ہوئے۔ دیگر ملکوں نے صنعت و حرفت میں کیوں بہت زیادہ ترقی کی۔ کیونکہ وہ حتی الوسع راست بازی سے کام لیتے ہیں۔ کپڑوں کے تھان۔ کاغذوں کے تختے تیار کر کے ان کی پڑتال کی جاتی ہے۔ جو ذرا بھی خراب ہو۔ اس کو علیحدہ کیا جاتا ہے۔ اور اس کو گھٹیا درجہ کا شمار کر کے کم قیمت پر بیچا جاتا ہے۔ لیکن یہاں کوئی چیز وی۔ پی سے منگواؤ۔ تو کئی حالتوں میں تو سیکنڈ ہینڈ۔ میلی پھٹی ہوئی۔ داغدار بھیجی جائے گی۔ چند روز ہوئے مدراس سے میرے ایک دوست نے کتاب منگوائی۔ وہ سیکنڈ ہینڈ آئی۔ جگہ جگہ صفحوں اور جلد پر داغ لگے ہوئے تھے۔ وہ میرے پاس بڑے غصے سے آئے اور کہنے لگے۔ "ہندوستانیوں کا بیڑا غرق ہو۔ یہ کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نہ اٹھ سکتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ان سب کو پکڑ کر ایک دم سمندر میں ڈبو دیا جائے"!

ہمارا شیوہ ہے کہ جو کام دوسروں کی نظر سے اوجھل ہو کر کیا جا سکتا

ہے۔ اس میں دھوکہ کرنا تو ہر طرح سے جائز سمجھا جاتا ہے ؎

عیب کچھ گنتے نہیں اس عیب کو
جس سے ہوں اپنے سواسب بخیر

بازار کے اندر جاؤ۔ دُکاندار گاہک کو لُوٹنا چاہتا ہے۔ گاہک دُکاندار کی آنکھ میں مٹی ڈالنا چاہتا ہے۔ گھر کے اندر جاؤ۔ باپ کو بیٹے پر۔ خاوند کو بیوی پر۔ بھائی کو بھائی پر اعتبار نہیں۔ سکُول یا کالج کے اندر جاؤ۔ طالب علم کو اُستاد کا ادب نہیں۔ اُستاد کو شاگرد سے اُنس نہیں۔ ایک دُوسرے کو اُلو بنا کر اپنا وقت نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچہریوں میں جاؤ۔ تو انصاف پیسے اور سفارش سے بک رہا ہے۔ جگہ جگہ پر کم فہم زمیندار کو اہلکار۔ وکیل۔ عرائض نویس اور دیگر لوگ دبوچنے کے لئے بیٹھے ہیں۔ زمیندار کا بھی بس چلے۔ تو وہ بھی اُن کو اپنی طرف سے دھوکہ دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا۔ غرضیکہ ہر جگہ ہوشیاری۔ چالاکی۔ فریب اور بے اعتمادی نظر آتی ہے۔ راست بازی اور ایمان داری کا نام نہیں۔ حتیٰ کہ خُدا کے گھر بھی پہنچو۔ تو وہاں بھگت لوگ پُجاریوں کو بُدھو بنانا چاہتے ہیں۔ اور پُجاری بھگتوں کو ٹھگنا چاہتے ہیں۔ وہی حالت ہے ؎

نہ عاقبت کا کسی کو ڈر ہے نہ عزت قوم پر نظر ہے
سروں میں سودا سما رہا ہے دِلوں سے غیرت نکل رہی ہے

اس حالت میں مُلک کیا ترقی کر سکتا ہے۔ لاکھ سر مارو کچھ نہ ہو گا جب تک باہمی اعتماد نہ بڑھے۔ کوآپریشن[ا] نہ ہو کسی صیغے میں بھی ترقی کا ہونا ناممکن بلکہ ترقی کا خیال ہی فضُول ہے۔ جب تک آپس میں میل ملاپ سے کام کرنے کی عادت پیدا نہ ہو۔ اور دماغ میں صرف یہی سمایا ہوا ہو۔ کہ میں کسی نہ کسی طرح سے پیٹ

[ا]۔ مل کر کام کرنا۔

بھر کر کھالوں۔ باقی لوگ خواہ بھاڑ میں جائیں یا چولھے میں۔ تب تک کسی قسم کی ترقی کا خیال ایک خواب ہی رہیگا۔ کوآپریشن کے اصول سے اگر ہم واقف ہو جائیں تو پتہ لگے کہ ؎

محبت سے لبالب جام ہے کواپریشن کا
محبت دوسرا اک نام ہے کواپریشن کا
بڑھو اسکی حمایت میں چلو اسکی قیادت میں
کہ سیدھی راہ پر ہر گام ہے کواپریشن کا
ترقی کامرانی شادمانی فارغ البالی
برائے تجربہ انجام ہے کو اپریشن کا

ایک اور مرض جو ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ وہ فضول خرچی کی ہے۔ ہمارے ذرائع آمدنی بہت کم ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ ہم اپنے خرچ کو آمدنی سے کم رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ بیجا طور پر جھوٹی عزت کے حاصل کرنے کے لئے اپنا روپیہ برباد کرتے ہیں۔ لٹیروں اور ڈاکوؤں سے انسان مقابلہ کرکے یا بنکوں میں رکھ کر روپیہ بچا سکتا ہے۔ لیکن اسراف یا فضول خرچی کے ڈاکو کے ظاہر ہوتے ہی سب ہتھیار ناکارہ ہو جاتے ہیں ؎

چوروں سے زر و مال بچا سکتے ہیں
رکھ پیٹی میں تالے بھی لگا سکتے ہیں
بچتی نہیں اسراف سے کوڑی لیکن
اس چور پہ قابو نہیں پا سکتے ہیں

انسان کی آمدنی سے خرچ کا زیادہ ہونا اُس کی تباہی کی علامت ہے۔ غریب ہو چاہے امیر جب تک وہ اسراف کی بدعادت پر قابو نہیں پا سکتا اور کفایت شعاری کو اپنا شیوہ نہیں بناتا۔ وہ مصیبت کا شکار ہو کر ہی رہے گا۔ کہا بھی ہے ؎

ہم کہیں گے کبھی نہ اسکو غریب جسکو ملتی ہو اک حقیر رقم
اصل میں وہ غریب ہے جسکا خرچ زائد ہو اور آمد کم (جوش)

آمدنی سے خرچ زیادہ رکھنے سے بڑے نقصانات ہیں۔ انسان کو پھر کئی ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور اس کے بعض اوقات بہت برے نتیجے بھگتنے پڑتے ہیں یعنی انسان قرض میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قرض سے بڑھ کر انسان کی خوشی اور عزت کا دشمن کوئی نہیں ؎

دامِ بلا قرض ہے پھنسے اور ہوئے شکار ہے پاسِ آبرو تو رہو ہوشیار تم
گر دُرِ بہا ہوا ملے کوڑیوں کے مول زنہار بھول کر بھی نہ لینا اُدھار تم
مقروض کی نہیں ہے زمانہ میں آبرو یوں اپنے دل میں بات بناؤ ہزار تم
پھر ہو سکے گا کوئی بھی افسوں نہ کارگر
لُقمہ کو قرض کے نہ کرو زہر مار تم

خرچ کو بڑھانا گویا مفلسی اور تنگ دستی کو خود لبیک کہنا ہے۔ آج کل فضول رسمیات میں یعنی بیاہ شادی کے موقعہ پر یا موت پر جوں توں کر کے قرض اُٹھا کر بھی جھوٹی واہ واہ حاصل کرنے کے لئے روپیہ بیدردی سے خرچ کیا جاتا ہے۔ ہماری رسوم ہمارے لئے وبالِ جان ہو رہی ہیں۔ ایک تو اپنے نکماپن کی وجہ سے ہم پہلے ہی کافی تنگدست ہیں۔ پھر شادی اور غمی کے رسوم پر فضول خرچی کر کے ہم اور بھی زیادہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔ ہمارا اصول یہ ہونا چاہیئے ؎

خرچ کرنا ہو تو کچھ کیسہ میں بھی زر دیکھ لے پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنی چادر دیکھ لے
بے زری جیسی نہیں زیرِ فلک کوئی بلا حال کیا ہوتا ہے ہر مفلس کا ابتر دیکھ لے
اس کا لینا بھی برا ہے اس کا دینا بھی برا قرض لیکر آزمالے قرض دے کر دیکھ لے
تجھکو ہو شادی رچانی بیٹے بیٹی کی اگر بک نہ جائیں گھر کے برتن گھر کا زیور دیکھ لے
بھول کر بھی ہو نہ پابندِ رسومات قدیم
ہو گئے مفلس کئی اس میں تو نگر دیکھ لے
(راز)

ہمارے دھرم شاستروں میں بھی کفایت شعاری کرنے اور قرض نہ اُٹھانے کی ہدایت ہے۔ مثلاً سکھ دھرم کے پریم سمارگ میں لکھا ہے:۔

"جو کچھ سرا انجام سنجوگ کا کرے سو یتھا شکت کرے سنساری
اہنکاریاں دی رونشں نہ کرے۔ ایہی جگت بیٹے والا کرے
خرچ آمدنی تے کم کرنا۔ جو ودھیک کریگا انت نوں حیران ہو ویگا"

ترجمہ۔ لڑکی کی شادی کا جو شخص بھی انتظام کرے۔ اپنی بساط کے مطابق کرے۔ دُنیا کے مُتکبر انسانوں کی پیروی نہ کرے۔ لڑکے والے کے لئے بھی یہی واجب ہے۔ اپنی آمدنی سے خرچ کم کرے۔ جو زیادہ کریگا پریشان ہوگا۔

قرآن شریف کی سُورتِ انعام رکوع ۱۷ آئت ۱ و سُورتِ اعراف رکُوع ۳ آئت ۶ میں اسراف یعنی فضُول خرچی کے خلاف حُکم ہے۔

رسُولِ کریمؐ نے فضول خرچی سے لوگوں کو باز رکھنے کے لئے سونے چاندی کے برتنوں میں پینے اور کھانے سے منع فرمایا۔ اور ریشم پہننے اور اس پر بیٹھنے کے بھی خلاف حُکم صادر کیا۔ پھر ایک حدیث میں فرمایا۔ کہ جو چاہو کھاؤ پہنو لیکن اس میں دو باتیں نہ ہوں۔ ایک تو فضُول خرچی اور دُوسرے فخر و تکبّر۔

قرض کے متعلق پریم سُمارگ میں آتا ہے۔ کہ جہانتک بس چلے قرض نہ لیا جائے۔ کیونکہ قرض لینا بڑا پاپ ہے۔ لیکن اگر قرض لے بھی بیٹھے تو قرضخواہ کے تقاضا کئے بغیر ہی ادا کر دیوے اور جب تک بے باق نہ کر لے۔ تب تک نہ لذیذ کھانا کھائے نہ خوشبُو لگائے۔

رسُولِ کریمؐ نماز میں یہ دُعا پڑھا کرتے تھے:۔

"یا اللہ تو مجھ کو گُناہ اور قرض سے محفوظ رکھ"

ایک دفعہ آپ نے ایک آدمی کی نماز جنازہ اس وجہ سے پڑھنے سے

انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنا قرض ادا کئے بغیر اس دُنیا سے رحلت کر گیا تھا۔
مغرب کے مشہور فلاسفر ڈاکٹر جانسن لکھتے ہیں۔ کہ دُنیا میں ہمیشہ دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ایک کفایت شعار اور ایک فضول خرچ۔ جتنے عالیشان مکانات کارخانے۔ جہاز اور دیگر بڑے بڑے کام دُنیا میں بنے ہیں۔ جن سے دُنیا والوں کو فائدہ اور خوشی حاصل ہوتے ہیں۔ وہ سب کفایت شعار لوگوں کی مہربانی کا نتیجہ ہیں۔ برخلاف اسکے جنہوں نے فضول خرچی اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ وہ ہمیشہ کفایت شعاروں کے غلام بنتے ہیں۔

قرض کے متعلق مشہور فلاسفر بنجمن فرینکلن لکھتے ہیں کہ جس نے قرض اُٹھایا وہ رنج میں مُبتلا ہوا۔ شیکسپیئر نے لکھا ہے۔ کہ نہ قرض لینے والا بن نہ دینے والا کیونکہ قرض دینے سے اکثر روپیہ بھی جاتا ہے۔ اور دوستی کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور قرض لینے سے کھیتی کا کنارہ ہی ٹوٹ جاتا ہے۔

انسان کا سب سے خطرناک دُشمن بیکاری ہے بیکار انسان بیماری کا۔ مفلسی کا۔ ذلت کا شکار بنتا ہے۔ ہم لوگ زیادہ تر کاہلی اور بیکاری سے واسطہ رکھتے ہیں۔ اور اس لئے میں اِن ترقی میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم نے اپنی قسمت کو خود سُلایا ہوا ہے۔ خود بخود بد قسمت بن رہے ہیں۔ قسمت اور خالق برتر انہی لوگوں کے امدادی ہوتے ہیں۔ کہ جو خود اپنی مدد کے لئے طیار ہوتے ہیں ؎

خدا نے آجتک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی　　نہ ہو جسکو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا
خدا اُنکی مدد کرتا ہے جو اپنی خود مدد کرلیں　　وُہی دامن میں گل بھرتے ہیں جو دامن میں گل بھرلیں
حقیقت میں انہی کو زندگی کا لُطف حاصل ہے　　جو اپنی زندگی میں زندہ رہنے کیلئے مرلیں

اِس ملک کو سُستی اور ناکارہ پن نے دُنیا کی نظروں میں گرا دیا ہے جب سے ہم نے قوتِ بازو سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔ ہم طرح طرح کی بیماریوں کا کھاجانے ہوئے

ہیں۔ ہماری غریبی دُوسرے ملکوں میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے۔ ہماری مفلسی اور بدحالی کے ڈرامے اور تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ یہ حالتِ زبوں اس لئے ہے کہ ہم اس درسِ عمل کو بھلا بیٹھے ہیں ؎

نویدِ زندگی ہے سعیٔ کوشش کے ترانے میں
سبھی کچھ قوتِ بازو سے ملتا ہے زمانے میں

جو نقدِ جستجو رکھتے ہیں ہمت کے خزانے میں
عرُوسِ کامیابی اُن سے ہم آغوش ہوتی ہے

وُہی بزمِ عمل میں کامیاب و کامراں ہوں گے
جو ہمت اور استقلال سے دائم رواں ہونگے

فردوسی صاحب نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

اندر جہاں سُود بے رنج نیست
کسے را کہ کاہل بود گنج نیست

زناں را ازآں نام ناید بلند
کہ پیوستہ در خفتن و خوردن اند

اور بھی کہا ہے ؎

ہر کہ عمل نہ کرد و عنائتِ اُمید داشت
دانہ نکشت و خرمنے را انتظار کرد

گنجے بے مارو گلے بے خار نیست
شادی بے غم درایں بازار نیست

ترجمہ:"اس دُنیا کے اندر بغیر تکلیف کے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا۔ جو کوئی ناکارہ ہوتا ہے وہ دولت نہیں پاسکتا۔ عورتوں کا نام اس لئے مشہور نہیں ہوتا۔ کہ وُہ کھانے اور سونے سے ہی کام رکھتی ہیں۔" "جس کسی نے عمل نہ کیا اور یافت کی اُمید رکھی اُسکی وُہی مثال ہے۔ کہ بیج تو بویا نہیں اور پیداوار کی انتظار رکھی۔ کوئی خزانہ نہیں جہاں سانپ نہ ہو۔ کوئی پھول نہیں جہاں کانٹا نہو۔ اس دُنیا میں بغیر تکلیف اُٹھائے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔"

عزت کام کرنیوالوں کے ہی حصے میں آتی ہے۔ دولت مردان کار کا ہی ورثہ ہوتا ہے۔ کام کرنیوالے بہت قابل قدر ہوتے ہیں سر بنجمن فرینکلن لکھتے ہیں کہ

ایک کسان اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا ایک دور انو جنٹل مین سے کہیں اُونچا درجہ رکھتا ہے۔ مشہور فلاسفر رسکن لکھتا ہے۔ کہ جب مَیں کسی نوجوان کی لیاقت کا شہرہ سُنتا ہُوں۔ تو پہلا سوال جو مَیں پُوچھا کرتا ہُوں۔ وُہ یہ ہے کہ کیا وُہ کُچھ کام کرتا ہے؟

پس اگر ہم اپنے مُلک کو ذلت سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر اپنا۔ اپنی قوم کا۔ اپنے ملک کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں۔ اگر دُنیا میں کچھ بننا چاہتے ہیں۔ اگر چاہتے ہیں کہ کیڑوں مکوڑوں کی موت نہ مریں۔ اور ہمارے مرنیکے بعد بھی کوئی ہمارا نام نیکی سے یاد کرے۔ تو اس گیت کا مفہوم یاد رکھیں۔ اور اس کو اپنی زندگی میں عملی جامہ پہنائیں ؎

بے کار ہے بیمار ہے پھر کیا؟ اگر نادار ہے
کر کار پھر آرام کر۔ محنت میں صُبح و شام کر
پیدا جہاں میں نام کر کچھ فکرِ نیک انجام کر
ہے صرف محنت مدّعا مطلب تجھے ثمرے سے کیا
ثمرہ تجھے دے گا خُدا بھر جائے گا دامن ترا
بڑھ جائے گی ہمّت تری صحّت تری دولت تری
عزت تری عظمت تری رفعت تری شوکت تری
اے خارؔ تیرا مرتبہ ممنون ہے کس شخص کا
اللہ ہی ہے مشکل کُشا محنت سے ہو جا خود بڑا (خارؔ)

اگر غفلت سے ہم اسوقت تک ترقّی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں ہم اپنے لئے نام پیدا نہیں کر سکے۔ نہ ہم نے کچھ اپنا بنایا ہے۔ نہ کسی اور کا۔ تو کم از کم اب نیند سے بیدار ہو جائیں۔ اور اپنے فرض کی پہچان کر کے سُستی اور کاہلی میں فضول باتوں میں اور جھگڑوں میں بے فائدہ کش مکش میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ بلکہ میدانِ عمل میں کُود پڑیں ؎

اگر غفلت سے ابتک کچھ نہیں تُونے کیا غافل
تو اس خوابِ گراں سے چونک آئندہ نہو غافل
بڑھے جاتے ہیں ساتھی ہمسفر نزدیک ہے منزل
یہ فرصت بھی غنیمت ہے اگر کرنا ہے کچھ غافل

اُولی العزمان دانشمند جب کرنے پہ آتے ہیں
سمندر پاٹتے ہیں کوہ سے دریا بہاتے ہیں (احمدی)

نہ صرف اس دُنیا کی کامیابی میدانِ عمل میں پُورا اُترنے سے ملتی ہے بلکہ آخرت اور عاقبت کا مدار بھی عمل پر ہی ہے۔ وہاں پر بھی اعمال کی ہی پُرسش ہونی ہے ؎

ہم جو کچھ یاں پہ کرتے ہیں ہوتا ہے حساب اسکا
محاسب ساتھ رہتا ہے کیا جو کچھ وُہی لکھا
پہنچتا ہے مرتب ہو کے جب دفتر ہیں وہ سیاہا
ثمر ملتا ہے اسکا جس شجر کا بیج بویا تھا
وہاں تُو پائے عزت ایسا کچھ ساماں مہیا کر
پشیماں ہو گزشتہ غفلتوں سے اب نہ سویا کر

لیکن وہاں کونسے اعمال ہیں۔ جو مالک کی نظر میں پسند ہوں گے۔ وہ کون سی جنس ہے جسکی کھپت یہاں سے بھرنے کی ضرورت ہے۔ وہ کونسی پُونجی ہے جو ساتھ جائیگی وہ کونسا توشہ ہے جو اس دُنیا کو چھوڑنے پر بھی ساتھ جائیگا۔ وہ کونسے اعمال ہیں کہ جن کی وجہ سے وُہ مالک اپنے بندوں کو اُونچے درجے بخشیگا۔ وہ یہ اعمال ہیں ؎

ترے آنیسے ہوں سب سفیرانِ چمن شاداں
چلن سے تو عزیزِ دل ہو اُن کا اور سرورِ جاں
تُو ہر اک حال میں اُن کا شریک ہمنوائی ہو
دلوں میں اُنکے جا ہو تیری سینوں میں رسائی ہو
کریں ہم اپنے ہمجنسوں کی خدمت اور وُہ شاداں ہو
ہم اپنے بھائیوں سے صاف دل رکھیں وہ فرحاں ہو
جب اس شفقت سے ابرِ فضلِ یزداں قطرہ افشاں ہو
ہمارا مزرعۂ دل کیوں نہ رشکِ صد گلستاں ہو

انسان کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے کے لئے مفصلہ ذیل خیالات کو اپنے سامنے رکھنا چاہیئے ؎

غفلت نہ ہو کینہ و بغض و حسد نہ ہو
جھگڑا نہ ہو لڑائی نہ ہو رد و کد نہ ہو
بھائی کی پیٹھ پیچھے کبھی ذکرِ بد نہ ہو
انساں مثالِ صفتِ دام و دد نہ ہو

غفلت سے اس جہان میں سارا فساد ہے
غفلت کو آ اُٹھا ہٹائیں جہاد ہے
مخلوق ذی شعور ہے تو ہوشیار رہ
مت طلبگارِ زندگیِ مستعار رہ
دُنیا کا کاروبار کر اور دیندار رہ
اُمیدوارِ رحمتِ پروردگار رہ
کس نے کہا ہے تجھ سے کہ دُنیا کو چھوڑ بیٹھ
بس ایسی باتیں اپنی طرف سے نہ جوڑ بیٹھ

نیک انسانوں کے خواص اور نیک بننے کے لئے اوصاف ایک فارسی شاعر نے اس طرح سے بیان کئے ہیں ؎

ہر کہ باشد اہل ایماں اے عزیز
پاک دارد چار چیز از چار چیز
از حسد اوّل تو دل را پاک دار
خویشتن را بعد ازاں مومن شمار
پاک دار از کذب و از غیبت زباں
تاکہ ایمانت نیفتد در زیاں
پاک گرداری عمل را از ریا
شمعِ ایماں تُرا باشد ضیا
چوں شکم را پاک داری از حرام
مردِ ایماں دار باشی والسلام
ہر کہ دارد ایں صفت باشد شریف
ورنہ دارد دارد ایماں ضعیف

ترجمہ:- اے پیارے جو انسان سچا ایماندار ہوتا ہے۔ وہ چار چیزوں کو چار چیزوں سے پاک رکھتا ہے۔ اوّل تو اپنے دل کو حسد سے پاک رکھے۔ اور اس کے بعد ہی اپنے آپکو ایماندار کہہ سکتا ہے (یعنی حسد کے رہتے ہوئے انسان ایماندار نہیں بن سکتا) دوم اپنی زبان کو جھوٹ اور چغلخوری سے پاک رکھ۔ تاکہ تیرا ایمان گھاٹے میں نہ پڑجائے۔ سوئم اپنے اعمال کو مکاری سے پاک رکھ تاکہ تیرے ایمان کی شمع زیادہ روشن ہو۔ چوتھے جسوقت تو اپنے پیٹ کو حرام کی کمائی سے پاک رکھیگا تو بلا شبہ تو ایماندار آدمی بنجائیگا۔ جو انسان یہ اوصاف اپنے اندر رکھتا ہے وُہی شریف کہلاتا ہے۔ ورنہ اگر وُہ کہتا ہے کہ وُہ ایماندار ہے تو وہ کچّا اور کمزور ایماندار ہے۔ اس قسم کے لائحہ عمل سے ہی زندگی کامیاب ہوسکتی ہے۔

تمام شد

اتن [illegible]

ہے تو [illegible]